بانی
سہام مرزا

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

خط وکتابت کا پتا
88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ
جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7۔ کراچی
فون نمبر: 021-35893121 - 35893122
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

مئی 2015ء
جلد: 43 ☆ شمارہ: 05
قیمت: 60 روپے

باتیں ملاقاتیں

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

انتخاب خاص

رنگ کائنات

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com
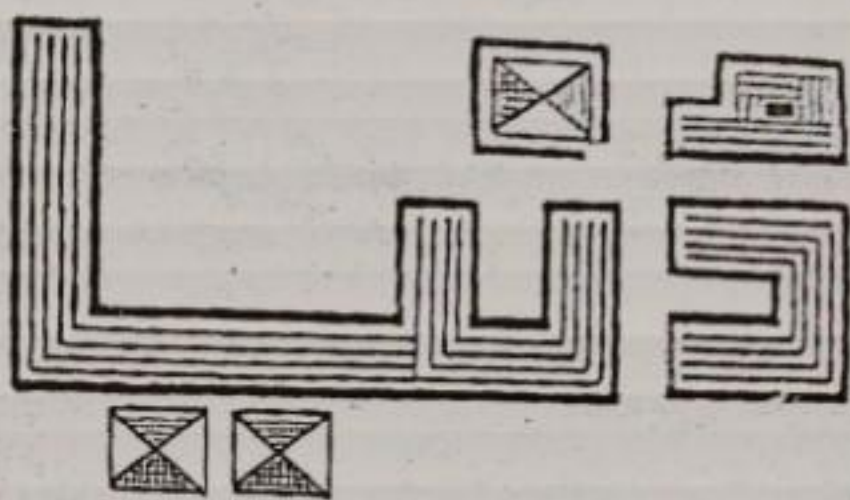
سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافاتِ جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پرل پبلی کیشنز: C II-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس
ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبرز: 021-35893121-35893122
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

بادشاہ گر..... مزدور

ساتھیو!

کبھی پانی پر غور کیا ہے!

گرجتا' چنگھاڑتا' شور مچاتا پانی' رحم دل، مہربان اور خوف ناک پانی۔ نرم سبک رو اور ظالم پانی۔ ہمارے چاروں اور پانی ہی پانی ہے۔ اور ان شور مچاتی' لہراتی' بل کھاتی لہروں کی وسیع چادر پر زمین کا ایک چھوٹا سا بھورا نقطہ یوں ابھرا ہے' جیسے کسی نے بیچ میں پتھر کا ٹکڑا ڈال دیا ہو۔

کہیں چمکیلا' کہیں مدھم' کہیں سبک رو، کہیں ساگر تند و تیز..... مٹی اور پانی کا ازل سے ایک خاص رشتہ ہے۔

ہم بیج کی نمو کے لیے مٹی میں بیج بوتے ہیں۔ جڑیں مٹی میں لگتی ہیں اور جڑوں میں پانی رہتا ہے۔

اسی طرح ہمارا اور آپ کا رشتہ بھی ازل سے ہے۔

میرے چاروں اور الفاظ ہیں۔ روز اگتے ہیں' روز مر جاتے ہیں۔ جلتے بجھتے رہتے ہیں۔ کبھی جگنوؤں کی طرح روشن دائرے بناتے ہیں تو کبھی پتنگوں کی صورت اڑتے رہتے ہیں۔

ان ہی الفاظ سے میں ہر ماہ ایک 'محبت گھر' بناتا ہوں اور اس ماڈل 'محبت گھر' کو ''جلد'' کی دنیا میں قید کر دیتا ہوں۔ سفر پھر سے شروع ہو جاتا ہے اور اگلے ماہ کے محبت گھر کے لیے میں پھر سے مزدوری شروع کر دیتا ہوں۔

اتنے قصے کا مقصد صرف یہ ہے دوستو!

اس کائنات کی ہر شے کا دوسری شے سے ایک خاص تعلق اور رشتہ جڑا ہوا ہے۔ ہم 'لکھاری مزدور' لفظوں کے 'بادشاہ گر' ہیں۔ اس لیے خیال رہے کہ ہماری ڈیوٹی' ہمارا فرض بہت اہم اور ذمہ داری کا متقاضی ہے۔

لفظوں کے دانت نہیں ہوتے مگر کاٹتے ہیں اور اگر کاٹ لیں..... تو ان کے زخم نہیں بھرتے۔ خیال رکھیے گا۔

کاشی چوہان

منورہ نوری خلیق

زادِ راہ

جیسے کسی محکمے کا کوئی خاص لباس اور وردی ہوتی ہے جس میں وہ اپنے عہدے کی تمام تر ذمے داریاں ادا کرتا ہے اور دور سے ہی پہچانا جاتا ہے کہ اس کا محکمہ فلاں ہے' منصب فلاں ہے اور اسے فلاں فلاں فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں' بالکل اسی طرح......

زندگی کو آسان' باعمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ

صبر والوں کی بے شمار صفات قرآنِ پاک میں بتائی گئی ہیں۔ اپنے رب کی اطاعت کرنے' اس کے عائد کردہ فرائض کو بجا لانے والے اور اس کے تمام منع کردہ افعال سے بچنے اور اجتناب کرنے والے۔ اللہ تعالیٰ سے جو عہد کریں' اسے پورا کرنے والے اور صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر مسکین یتیم اور مجبور قیدی کی بھوک مٹانے والے۔ اپنے عمل کا بدلہ انسانوں سے نہ چاہنے والے اور دیکھے بغیر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے' گناہوں سے خود بچنے اور دوسروں کو بچانے والے' الغرض کہ وہ تمام اعمال جو ایک انسان کو معاشرے کے لیے اہم ترین بنا کر اسے پورے معاشرے بلکہ قوم کے لیے خیر ہی خیر بنا دیتے ہیں' اسی عنوان میں آجاتے ہیں۔ ان تمام کا ذکر کر کے باری تعالیٰ نے خاص طور پر ان کی اس صفت کا ذکر کر کے ان کے لیے دائمی نجات کی خبر دیتے ہوئے فرمایا۔

''پس اللہ تعالیٰ انہیں اس دن کے شر سے بچا لے گا' انہیں تازگی اور سرور بخشے گا اور ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت اور ریشمین لباس عطا کرے گا۔ وہاں وہ اونچی اونچی مسندوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ انہیں نہ دھوپ ستائے گی نہ جاڑوں کی ٹھنڈک۔ جنت کی چھائیں ان پر جھک کر سایہ کر رہی ہوں گی۔'' (سورۃ الدہر)

ان تمام نعمتوں کا بڑا تفصیلی ذکر ہے جن میں حریر و دیبا و اطلس کے ریشمین لباس' سونے کے کنگن اور شرابِ طہور کا ذکر بھی ہے جو سب ہی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں مگر دنیا میں حرام ہیں۔ انسان' اللہ کی رضا کے لیے انہیں ترک کرتا ہے لیکن وہاں اسے عطا کی جائیں

گی۔ ان تمام صفات میں جو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں فرمائی ہیں، دنیا اور دین دونوں آجاتے ہیں جن میں صبر سے کام لینا اعلیٰ ترین کامیابی کی دلیل ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

''نیکی اور بدی یکساں نہیں ہے۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہے پھر تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی، وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں مگر انہیں جو صبر کرتے ہیں۔'' (حم السجدہ۔ ۳۵)

اب غور کیا جائے تو عداوت رکھنے والے دشمن کو جگری دوست بنا لینا کس قدر ضبط و تحمل اور مستقل مزاجی کا کام ہے۔ گالی اور تکلیفوں کے جواب میں دُعائیں دینا، اذیتوں کے جواب میں خیر خواہی چاہنا اور عداوت و مخالفت کے بدلے دوستانہ انداز کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے بہت بڑا دل چاہیے۔ یہ صفت ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو نصیب والے ہوں۔

صبر کا نام آتا ہے یا صبر کا ذکر ہوتا ہے تو ہم سب کے ذہن میں اس کے ایک معنی آتے ہیں کہ کوئی شخص مصائب کے سامنے مجبور ہے اور کچھ نہیں کر سکتا، بس اسی کا نام صبر ہے۔

لیکن...... ان تین حرفوں کے اتنے وسیع معنی ہیں جو پوری دنیوی زندگی کا احاطہ کر کے آخرت سے جا ملتے ہیں یعنی انسان کی وہ صفت جو دنیا اور دین دونوں میں کامیابی کی ضامن ہے اور اہلِ ایمان کی پہچان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وعدے پر یقین کر کے صحیح راستوں پر کام کرنا اور نتیجے کے لیے مطمئن ہو جانا صبر کی تعریف ہے۔ زندگی کے ہر گوشے میں کامیابی کی دلیل ہے۔ یہ صفت خود اعتمادی کے بلند ترین اوصاف کا سب سے بڑا وصف اور مومن کی سب سے بڑی علامت ہے۔ مومن کی تمام تر صفات اسی زمرے میں نظر آتی ہیں۔ منافق کی علامات سے بچنے کے لیے یہی صفت درکار ہے بلکہ یہی صفت ہر صفت کی بنیاد نظر آتی ہے۔

قرآنِ پاک میں ستر سے زیادہ مقامات پر اس کا ذکر ہے اور اس کی بے شمار شاخیں ہیں۔ ناجائز خواہشات کو روکنے کا نام عفت و عصمت ہی نہیں، صبر ہے۔ غربت و مفلسی میں دولت نصیب نہ ہونے پر باوقار انداز میں زندہ رہنا قناعت ہی نہیں، صبر ہے۔ دولت و ثروت میں غرور اور تکبر سے بچنا خاکساری ہی نہیں، صبر ہے۔ میدانِ جنگ میں شجاعت و دلیری سے دشمن کا مقابلہ کرنا صرف بہادری ہی نہیں، صبر ہے۔ دوسروں کے عیب دیکھ کر چشم پوشی کرنا شرافت ہی نہیں، صبر ہے۔ راضی برضا رہنا قناعت ہی نہیں، صبر ہے۔ موقع ملنے کے باوجود گناہوں سے بچ کر گزر جانا زہد و تقویٰ ہی نہیں، صبر ہے۔ دوسروں کی خطاؤں پر غیض و غضب کو برداشت کر لینا برداشت نہیں بلکہ صبر ہے۔ دولت کو رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرنا سخاوت ہی نہیں بلکہ صبر ہے اور ضرورت کی انتہا میں بھی دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا استغنا، ہی نہیں بلکہ صبر ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں انبیاءؑ کی زندگیوں سے ملتی ہیں گویا کہ عفت و عصمت، شرافت، ضبطِ نفس، قناعت،

دلیری بہادری‘ شجاعت‘ عفو و درگزر عیبوں سے چشم پوشی‘ رازداری‘ امانت کی حفاظت‘ غصے کا پی جانا‘ استغنا اور بردباری اور تحمل‘ ان تمام خصوصیات کے لیے صبر بنیاد ہے‘ صبر نہیں ہے تو انسان ان صفات کا مظاہرہ نہیں کرسکتا۔ جیسے کسی محکمے کا کوئی خاص لباس اور وردی ہوتی ہے جس میں وہ اپنے عہدے کی تمام ترذمے داریاں ادا کرتا ہے اور دور سے ہی پہچانا جاتا ہے کہ اس کا محکمہ فلاں ہے‘ منصب فلاں ہے اور اسے فلاں فلاں فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں‘ بالکل اسی طرح سے زندگی کے ہر شعبے میں اہلِ ایمان کی صفت صبر ہے جو بے حوصلہ نہ ہوں‘ عجلت پسند نہ ہوں جن کے مزاج میں تلون نہ ہو‘ ہدف سے ہٹ گئے اور کامیابی کی آس ہوئی تو آپے سے باہر خود کو ہی کامیابی کا سبب سمجھنے لگے۔ کوئی بھی کام کیا تو نتیجہ فوری چاہیے‘ بدلہ فوری مل جائے۔ وہ لوگ جو اللہ اور رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے والے ہوں اور اس راہ کی تمام دشواریاں‘ سختیاں استقلال کے ساتھ برداشت کرسکیں‘ کوئی لالچ اور کوئی خوف‘ کوئی اندیشہ اور کوئی لالچ انہیں اس راہ سے نہ ہٹا سکے۔

بات صرف دین ہی کی نہیں بلکہ یہ صفت معاشرے کی اصلاح وتطہیر کے لیے بھی سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ حضورِ اکرم ا کا فرمان ہے۔ ’’الصبر ردائی‘‘

’’صبر میری رِدا ہے‘ میری چادر ہے۔‘‘

اِس حدیث پر غور کیا جائے اور دیکھا جائے تو چادر تزئین و آرائش کو بھی بڑھاتی ہے اور پردہ پوشی بھی کرتی ہے۔ ایک طرف موسم کی شدت وحدت کو کم کرکے انسان کے جسم کو اس سے محفوظ رکھتی ہے تو دوسری طرف عریانیت کو چھپاتی‘ اغیار کی نظروں سے بچاتی اور دیکھنے والوں کی نظروں میں باوقار بناتی ہے۔ حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی۔

’’بیٹا! کوئی شئے رائی کے دانے کے برابر بھی ہو‘ کسی چٹان میں‘ آسمان میں یا زمین میں چھپی ہو‘ اللہ تعالیٰ اسے نکال لائے گا۔ وہ باریک بیں اور باخبر ہے۔ بیٹا! نماز قائم کر‘ نیکی کا حکم دے‘ بدی سے منع کر اور جو مصیبت پڑے‘ اس پر صبر کر۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔‘‘ (سورۃ لقمان۔ ۱۷)

اسی صفت کا ذکر کرتے ہوئے بنی اسرائیل کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

’’اس سے قبل ہم موسیٰؑ کو کتاب دے چکے ہیں لہٰذا اسی چیز کے ملنے پر تمہیں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔ اس کتاب کو ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا اور جب انہوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔‘‘ (السجدہ۔ ۳۵)

ان تمام آیات اور انبیاء علیہم السلام کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ صبر کی صفت اگر نہ ہو تو ہم کسی بھی صفت پر قائم نہیں رہ سکتے لہٰذا مومن کی کسی بھی صفت کا مظاہرہ کرنے کے لیے صبر کی ضرورت ہے۔

☆☆......☆☆

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

خط بھجوانے کے لیے پتا: ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ۔ 88-C II ۔خیابان جامی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بہت پیارے ساتھیو آپ سب کو رضوانہ پرنس کا سلام قبول ہو۔ اِس بار ہم اپنی محفل کا آغاز 14 مئی یعنی مدرز ڈے کے حوالے سے اپنی دوست اور خوبصورت شاعرہ شگفتہ شفیق کی اُس نظم سے کررہے ہیں جو شاید ہر اُس بیٹی کے دل کی آواز ہے جو اپنی ماں کو ہمیشہ کے لیے کھو چکی ہے۔ ابھی کچھ ماہ قبل ہم نے اپنی عزیز از جان امی کے بچھڑ جانے کا دُکھ سہا ہے اور اب تک اُن کے جانے کا نہ ہی یقین آتا ہے اور نہ ہی کسی پل وہ ہمیں بھولتی ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے میں ہماری کچھ رائٹرز اور چند عزیز دوستوں نے بھی ماں کو کھو دینے کا یہ انتہائی غم سہا ہے۔ یہ ایسا دکھ ہے جس کے سامنے الفاظ بے معنی ہیں۔

روز سوچوں میں بیٹھ اکیلی ، کب غم ہوں گے دور
کیسے ماں کے سینے لگوں میں، ہوں ملنے سے مجبور
وہ ملک عدم میں رہتی ہیں، میرا گھر ہے دور

آیئے اب چلتے ہیں نفرتوں اور رنجشوں سے بہت دور اپنی، اُس محفل کی طرف جو محبت اور خلوص کی خوشبو سے مہک رہی ہے۔

ہماری سب سے پہلی مہمان آپ سب کی پسندیدہ رائیٹر رُخ چوہدری کراچی سے لکھتی ہیں السلام و علیکم۔ رضوانہ جی آپ کی سجائی ہوئی دوشیزہ کی محفل میں آسکتی ہوں۔ ارے رضوانہ جی آپ کے حسین چہرے کی مسکراہٹ اتنی دلفریب ہوتی ہے کہ دوست تو دوست دشمن بھی خوش ہو جاتے ہیں۔ آپ کی مسکراہٹ نے خوش آمدید کہہ دیا اور لیجیے میں نے اپنی تشریف آپ کی کرسی کے ساتھ رکھ دی آپ کی محبت اور توجہ نے مجھے خاصا خوش فہم بنا دیا ہے اور خود کو آپ کے دل کے قریب سمجھتی ہوں کیوں کہ آپ میرے دل میں بے حد احترام کے...... مقام پر ہیں۔ رضوانہ کے لیے ایک جملہ بھی کہوں گی۔ رضوانہ کا شماران لوگوں میں ہوتا ہے۔ جن سے مل کر زندگی سے پیار ہونے لگتا ہے اور سچ ہے رضوانہ سے جب جب میری بات ہوئی انہوں نے بڑی بہن کم ماں جیسا کردار ادا کیا۔ اور میں خود کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ اللہ رب العزت نے مجھے رضوانہ جیسی مخلص دوست دی ہے کہ پھر سے کاغذ قلم لیے بیٹھ گئی ہوں۔ بس رضوانہ کی یہ محبت ایک افسانے میں ڈھلی اور اپریل 2015 میں ''اک پل کی سوچ'' عنوان سے ایک منفرد طرز ڈائجسٹ دوشیزہ کی فہرست میں آ گیا افسانہ بہت ہی روایتی اور عام سا تھا۔ آپ اپنی رائے کی عدالت میں جو چاہیں رائے دیں۔ کہنے کا مقصد صرف میرا یہ ہے کہ اس افسانے سے میں خود بھی ایک انرجی محسوس کرتی ہوں اور انشاء اللہ جب ڈیئر رضوانہ محبت سے لکھنے کی دعوت دیں گی میں لکھوں گی۔ یوں تو دوشیزہ ملک سے جاری ہونے والے پرچہ جات میں منفرد سی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑی جان دار اور پختہ تحریریں ہوتی ہیں میں سمجھتی تھی کہ میری ہلکی پھلکی سی تحریر شاید یہاں جگہ نہ بنا پائیں۔ اس لیے میں دوشیزہ سے دور ہی رہی تاہم جب بھی کچھ لکھا دوشیزہ کے محترم قارئین نے بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ اس وقت میرے سامنے اپریل 2015 کا دوشیزہ ہے۔ خوبصورت سلسلے ہنوز اپنی انفرادیت اور خوبصورتی کے ساتھ اپنی Rating قائم رکھے ہوئے ہیں۔ چونکہ ڈرامے کا دور ہے تو ڈائجسٹ میں بھی وہی لفاظی ہونے لگی ہے۔ جیسے میں نے Rating لکھا۔ کاشی چوہان بھیا کاش ہم سب اپنا احتساب خود کرتے ہوتے تو نہ آج ملک کی یہ حالت نہ ہوتی۔ ہمارا یہ قومی مزاج بن چکا ہے کہ ایک انگلی دوسروں پر اٹھا کر اپنی طرف چار انگلیوں کی خاموش زبان کو نہ سننا چاہتے ہیں نہ سمجھنا چاہتے ہیں۔۔ دوشیزہ کی محفل میں رضوانہ پرنس کے شیریں اور اپنائیت بھرے لہجے میں ڈھلے قارئین کے خطوط کے جوابات، سچ رضوانہ مزہ آرہا ہے مجھے لگتا ہے آپ کے ڈرائنگ روم میں ہم سب جمع ہیں۔ کسی بھی پرچے کی کامیابی کا انحصار ایڈیٹر پر بھی ہوتا ہے۔ یہ میرا خیال نہیں حقیقت ہے۔ ابھی فی الحال میں نے عقیلہ حق کا افسانہ پڑھا...... پڑھا گیا...... شروع کی چند سطور نے اپنے سحر میں ایسے قابو کیا کہ پڑھ کر ڈائجسٹ رکھا۔ زبردست عقیلہ پہلی بار آپ کی تحریر پڑھی ہے...... مزید کی خواہش ہے۔ شمع حفیظ آپ جتنی اچھی شاعرہ ہیں اتنی ہی اچھی نثر نگار ہیں۔ واہ شمع حفیظ ''میں ہاری'' میں آپ نے رُلا دیا۔ ...... بے اولاد کو ایک معذور اولاد ملی اور پھر...... زبردست۔ صدف آصف

آپ کی تحریر پڑھی نہیں اللہ رب العزت نے آپ دوشیزہ ایوارڈ کی نوید دی۔ اللہ آپ کو بے شمار افسانے لکھنے کی توفیق دے۔ اور آپ کو ہر ایک پر ایوارڈ ملے آمین۔ پی ای سی ایچ ایس کالج کی تقریب کی جھلکیاں اتنی خوبصورت اور اچھی لگیں۔ جنتی منزہ سہام لگ رہی تھیں۔ منزہ سہام میں خود آپ کی دلکش پرسنیلٹی کی اسیر ہوں۔ بہت نفیس پر کشش اور بااخلاق خاتون ہیں۔ میں ان کے پرچے میں لکھوں نا لکھوں مگر یہ خاتون مجھے بہت عزیز ہیں۔ جی تو پیارے قارئین میرا یہ تجزیہ یہ تبصرہ ابھی ادھورا سا ہے۔ جتنا میں نے پڑھا ہے اس پر رائے دے دی ہے۔ ماشاء اللہ گزرتے ماہ سال نے کبھی بھی دوشیزہ کی شہرت اور معیار کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اب تو یہ مذید...... خوبصورت ہو جائے گا دوشیزہ کی کامیابی اللہ کے فضل و کرم کے بعد پوری ٹیم عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ بہت اچھے رائٹرز ملے ہیں اس پرچے سے حلقہ ءمطالعہ کو۔ اللہ تعالی اس ادارے کو شاد و آباد رکھے۔ اس کی پوری ٹیم کو خوش رکھے۔ اور مذید اچھا کام کرنے کی توفیق دے آمین۔ اجازت چاہوں گی اللہ نگہبان۔

ﷺ: بہت پیاری سی رُخ! تمہارے افسانوں کی طرح تمہارا خط بھی دل میں اتر گیا جیتی رہو خوش رہو اگر اِسے ایڈیٹ کیے بنا شائع کرتے تو خوبصورت افسانے سے کم نہ ہوتا۔ دوست اب تمہیں ہمیشہ یہ دوستی نبھانی ہوگی۔ اپنی پیاری پیاری تحریروں سے دوشیزہ کو سجانے کی ذمہ داریوں سے منہ نہ پھیرنا ورنہ ڈانٹ کے لیے بھی تیار رہنا۔ تمہارے فینز تمہارے منتظر رہیں گے۔

✉: خوبصورت شاعرہ اور افسانہ نگار شمع حفیظ ہمیں کراچی سے لکھتی ہیں۔ ''ڈیئر رضوانہ پرنس السلام وعلیکم۔ حسب وعدہ حاضر ہوں اور محفل دوشیزہ کا حصہ بن رہی ہوں۔ سب سے پہلے آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ دوشیزہ بغیر کسی دوشیزہ ایڈیٹر کے ادھورا سا تھا۔ آپ نے آکر اس کی دوشیزگی میں جان ڈال دی۔ جس کے لیے تمام خواتین کی طرف سے میرا شکریہ قبول کریں...... اس شکریہ کو کاشی دل پر مت لینا، تم نے بھی پورا حق نبھایا ہے اس دوشیزہ کو نکھارنے کا، خاصی مثبت تبدیلیاں اور اچھے جملوں سے مزین ادارئیے تمہارے کریڈٹ پر ہیں سو ایک شکریہ تمہیں بھی کہنا ضروری ہو جاتا ہے۔ خوش رہو سلامت رہو۔ اپریل یعنی اس ماہ کا دوشیزہ کچھ افسانوں کے لحاظ سے قابل ذکر رہا۔ بہترین تحریریں پڑھنے کو ملیں اور بے ساختہ داد بھی دی۔ جن میں سے کچھ داد بذریعہ Fb میں نے فوری طور پر ان رائٹرز کی نذر کر دی تھی۔ جو میری پہنچ میں تھے۔ بہرحال تبصرے کا آغاز کرتی ہوں خط لکھنے کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے...... محنت کرنے والوں کو ان کی محنت کا صلہ ملنا چاہیے نا...... اُم مریم میں تمہاری فین ہوں، کمال کا کنٹرول اور ضبط ربط ہے تمہیں اپنے قلم پر...... اتنا ہی لکھتی ہو جس کی ضرورت ہوتی ہے۔ رحمٰن رحیم سدا اس سائیں ایک خوبصورت ترین ناول ہے، کب کتابی شکل میں آئے گا...... میں ضرور خریدنا چاہوں گی۔ ''دام دل'' کے لیے کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ رفعت سراج ہماری بھی استاد ہیں (ناول کیسے لکھا جاتا ہے اس کے لیے) ان کے جملے خاصے کی چیز ہوتے ہیں۔ تیرے عشق نچایا...... تھوڑا ٹریک سے ہٹا ہوا لگتا ہے بینا عالیہ کی توجہ شاید کم ہوگئی ہے یا بے زاری محسوس کر رہی ہیں۔ پہلی دس بارہ اقساط زبردست تھیں۔ اب جانے کیا ہوا ہے، بینا عالیہ اس کا جواب تو

تمہیں دینا پڑے گا۔ ''لمحوں نے خطا کی تھی'' فوزیہ احسان رانا کا حساس موضوع پر لکھا گیا ناولٹ...... خاصی طوالت کے ساتھ...... پہلی قسط بس ٹھیک تھی...... دوسری قسط میں شاید دلچسپی کا عنصر بڑھ جائے گا۔ میں ہاری...... شمع حفیظ کا ناولٹ اس پر تبصرہ تو صرف میں پڑھوں گی۔ آپ لوگ رائے دینا نہ بھولیے گا۔ اب آجایئے افسانوں کی طرف لکیر اس ماہ کا سب سے خوبصورت افسانہ کمال کا مشاہدہ اور حساسیت سے بھرا ماحول۔ دل درد سے بھر آیا تھا۔ شاباش عقیلہ حق میں تمہارے قلم کو نظر بد سے دور ہونے کی دعا دیتی ہوں۔ ''ایک پل کی سوچ'' رخ چوہدری کا المیہ کو اجاگر کرتا افسانہ، لڑکیوں کی جسمات رنگ روپ پر انگلی اٹھا کر بات کرنا اور ٹھکرانا پرانا موضوع ہیں لیکن برتتے ہوئے اس موضوع کو اچھے انداز بیاں سے پیش کیا گیا۔ رُخ آپ بہت عرصے بعد آئی ہیں تو ویلکم آگین...... ''مہکوا پنے آنگن میں'' نادیہ جہانگیر کا دلچسپ مکالموں سے بھرپور افسانہ، بے حد حقیقی ماحول کا عکاس تھا بہت مزہ آیا...... نادیہ غالباً آپ کا یہ پہلا افسانہ ہے...... مبارک ہو''لا ابالی'' بھی زندہ تحریر تھی حبیبہ طارق نے اچھا اور دلچسپ لکھا۔ بند ہونٹوں کی دعا خاموش محبت کی کہانی تھی...... وہی بار بار کا برتا ہوا فلمی موضوع مگر شاہانہ خان نے دلچسپی کو برقرار رکھا ہے۔ آصفہ ضیاء کا ''وقت کے اس کھیل میں'' ایک اچھا افسانہ تھا ماں بیٹی کے رشتے کی نزاکت محبت اور رشتے کا احوال سب ہی کچھ شامل تھا آصفہ کی اس کاوش میں، خصوصی تحریر گز بھر کفن...... واقعی منتخب فن پارہ تھا بے حد لطف آیا۔ اب کچھ منزہ کے یادگاری ٹرپ کے بارے میں عرض کرتی ہوں گرلز کالج کی تقسیم انعامات منزہ کے دم قدم سے یقیناً خوبصورت ہوگئی ہوگی۔ تصاویر دیکھ کران کی مصروفیات کا اندازہ ہورہا ہے ایسی صحت مندا یکٹویٹی بندے کو فعال اور خوش خرم رکھتی ہے جیسا کہ منزہ سہام تصاویر میں کھلی کھلی دکھائی دے رہی تھیں۔ صدف آصف کو اپنا پہلا دوشیزہ ایوارڈ مبارک ہوگیٹ وے آف لوعمدہ ناول تھا۔ دوشیزہ کی محفل حسب معمول بجی سنوری نظر آئی، نئے پرانے سب ہی چہرے دکھائی دیے احمد سجاد بابر کا خط دلچسپ تھا محترم ایک شاعر ہوکر کسی شاعرہ کی چوری پکڑ لائے تھے۔ آفرین ہے معاویہ عنبر پر...... کیا دیدہ دلیری ہے بھئی......؟ رضوانہ کوثر اپنی محبتوں کے ساتھ موجود تھیں انہیں میرا اسلام پہنچے۔ شہزادشیخ سے ملاقات اچھی رہی اور منی اسکرین کے تبصرے حسب معمول مرچ مسالوں کے ساتھ تھے۔ دوشیزہ میگزین بھی بہترین تھا۔ نئے لہجے اور نئی آوازیں اب غزلوں پر زور دے رہی ہیں۔ نفسیاتی الجھنیں اور حکیم جی کا کالم اچھا اضافہ ہے نسخے کام کے ہوتے ہیں۔ ڈیئر رضوانہ ایک مکمل ناول بھیج رہی ہوں، جس شمارے میں لگائیں گی مجھے ذرا پہلے انفارم کردیجیے گا اور امید ہے ''قسمتوں کے پھیر میں'' آپ کو ضرور پسند آئے گا خوش رہیے۔ سدا آباد رہیے اب اجازت چاہوں گی۔

✉: اچھی شمع! آپ نے تو اپنے خوبصورت تبصرے سے ہماری محفل میں روشنی سے بکھیر دی ہے۔ آپ کا ناولٹ مل گیا ہے۔ پوری کوشش ہوگی کہ لوگ جلد از جلد اس کو پڑھ بھی لیں کہ ''میں ہاری'' لکھ کر آپ نے اتنے دل جو جیت لیے ہیں۔

✉: ہماری بہت خوبصورت رائٹر عقیلہ حق بھی محفل کی رونق بن کر آئی ہیں لکھتی ہیں بہت اچھی سی

رضوانہ پرنس، اُمید کرتی ہوں آپ سب منزہ سہام کی سربراہی میں خوش ہوں گے۔ ہمیشہ کی طرح ہنستا مسکراتا، گنگناتا، جگمگاتا بالکل میری طرح، رسالہ میرے ہاتھوں میں ہے گوکہ دیر سے ملا۔ لیکن اتنی دیر نہیں ہوئی کہ میں کہہ سکوں بہت دیر ہوگئی۔ اداریہ زبردست تھا۔ ویل ڈن کاشی تم آج کل میری طرح سمجھدار ہوتے جارہے ہو۔ سب سے پہلے ہم نے پڑھی محفل گوکہ محفل میں میں نہیں تھی اور نہ ہی کسی نے یاد کیا لیکن پھر بھی خطوط سے سجی یہ محفل مجھے بہت پسند ہے۔ منزہ صاحبہ کی تصویریں دیکھیں، کالج کی طالبات کو دیکھا تو دل وہیں چلا گیا جب ہم بھی سفید یونیفارم پہنتے تھے۔ رفعت سراج صاحبہ کی کیا بات ہے ہم تو اُن کو سیکھنے کے لیے پڑھتے ہیں۔ بینا عالیہ بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ رُخ چوہدری کا افسانہ بہت خوبصورت اور حساس موضوع لیے ہوئے تھا۔ لوگ کیوں نہیں سوچتے، سیرت کی اہمیت کو کیوں نہیں سمجھتے۔ لڑکے کی ماں بہن کی حیثیت میں ہم اتنے سفاک کیوں ہوجاتے ہیں۔ شمع ماشاء اللہ بہت اچھا لکھتی ہیں شمع میں آپ کی بہت ممنون ہوں کہ آپ کو بھی میری تحریریں پسند آتی ہیں۔ شاہانہ خان کی تحریر مناسب رہی۔ اچھا لفظ مناسب کا مطلب اچھی رہی۔ ماشاء اللہ دوشیزہ دن بدن نکھرتا جارہا ہے اور اب تو ایڈیٹر کی ایک کرسی رضوانہ کی بھی ہے اور رضوانہ تو ایک ہنستی مسکراتی کھلکھلاتی خاتون ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کی شخصیت کا رنگ رسالے میں نظر آئے گا۔ اب رسالہ ہنستا مسکراتا ہاتھ میں آئے گا۔ آصفہ ضیاء احمد اور سب ہی کے افسانے اچھے تھے۔ ماشاء اللہ دوشیزہ کا معیار دن بدن بہتر ہوتا جارہا ہے۔ لاُابالی ایک اچھا ناول رہا۔ مجموعی طور پر رسالہ ایک مکمل رسالہ تھا۔ انتخابِ خاص واقعی خاص رہا۔ رنگ کائنات میں 'ہٹ لسٹ' پڑھا واقعی اب لوگ کیا کیا کرنے لگے ہیں۔ ہٹ لسٹ اور ڈاکا پڑنا مالداری کی نشانی سمجھا جانے لگا ہے۔ اب تو جس کے گھر میں ڈکیتی نہ پڑے۔ تو اُس کو شرمندگی ہوتی ہے کہ یا اللہ ہم اتنے غریب ہیں ہماری عزت اتنی کم ہے کہ ڈاکوؤں نے ڈاکا تک نہیں ڈالا۔ تو ہٹ لسٹ بہت زبردست رہا۔ زین ماشاء اللہ بہت اچھے جوابات دے رہے ہیں۔ شکر ہے کہ لڑکے ہیں اگر لڑکی ہوتے تو لوگ کہتے زین کافی زبان دراز ہوتے جارہے ہیں کچن کارنر کی ساری تراکیب زبردست رہیں اور جناب یہ سوچا تھا کہ اِس دفعہ تبصرہ ذرا مختصر لکھوں گی لیکن ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ میں دوشیزہ پر لکھوں اُس دوشیزہ پر جس کی مدیراعلیٰ ایک بہت خوبصورت دوشیزہ ہے۔ اور مختصر لکھوں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے ایک دفعہ مشورہ دیا تھا آج پھر دوبارہ دے رہی ہوں کہ ہر ماہ کسی ایک رائٹر کا انٹرویو شائع کریں۔ قارئین اُن لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں جن کو وہ پڑھتے ہیں اور پسند کرتے ہیں۔ اچھا کیونکہ لفظ پسند آ گیا ہے تو میں اِس لسٹ سے باہر نکل گئی اور یہ میرا مشورہ اپنے علاوہ سب کے لیے ہے۔ بہت ساری رائٹرز ایسی ہیں کہ اُن کے قبیلے سے تعلق رکھنے کے باوجود میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں۔ اُن کو دیکھنا چاہتی ہوں جیسے بشریٰ رحمٰن صاحبہ...... اِس قدر شدید گرمی کے باوجود میرا محبت بھرا خط یقیناً آپ کو اچھا لگے گا اور نہ لگے تو میری خاطر کہہ دیجیے گا کہ بہت اچھا لگا۔ دفتر میں درجہ بدرجہ سب کو سلام اور دعائیں۔ اللہ محبتوں کو قائم رکھے۔ رضیہ مہدی صاحبہ میرے پاس آپ کا نمبر نہیں ہے۔ فون کے ساتھ سارے رابطے چھن گئے پلیز بتایئے اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ آپ کی طبیعت

کے لیے دعا گو ہوں۔ اجازت دیجیے۔

ھ: بہت اچھی عقیلہ! آپ کا بہت ہی مزے دار سا خط صرف ہمیں ہی نہیں یقیناً سارے مہمانوں کو بھی بہت اچھا لگا ہوگا۔ دوست آپ کے مشورے پر ہم سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے بہت جلد ایک منفرد سا انداز لیے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کرنے والے ہیں اور ہاں زیادہ انکساری کی ضرورت نہیں سب کو آپ کی تحریریں کتنی پسند ہیں یہ آپ خود بھی جانتی ہیں۔

✉: بہت پیاری رائیٹرز مریم کی سواری ابھی ابھی لاہور سے اتری ہے۔ محترمہ رضوانہ پرنس صاحبہ اللہ آپ سب ہی پر ہمیشہ مہربان رہے۔ (آمین ثم آمین) عزیزم رضوانہ جی! بہت مدت کے بعد قلم اُٹھایا ہے زندگی کے سلسلے عجب ہوگئے ہیں۔ کام سمٹتے نہیں اور وقت آندھی کی طرح اڑے چلا جارہا ہے۔ قدم مصروفیات کی دھند میں لپٹے تھکن سے چور ہوکر بھی منزل کے لیے بھٹکتے جارہے ہیں...... راستہ بھی مشکل ہے اور زندگی بھی۔ نجانے کیا ہورہا ہے۔ فضائیں، موسم، وقت سب ہی ناسازگار لگنے لگے ہیں۔ مزید کیا کہوں۔ لفظوں کو ضبط تحریر میں لانا سہل نہیں لگتا۔ تب ہی سانحہ پشاور پر اردگرفتہ احساسات اب تک اسی اثر میں ہیں۔ ایک ماں کے دکھ کو محسوس کر کے اپنے احساسات کو لفظوں میں ڈھالنے کی ناکام سی کوشش کی تھی۔ وقت اور موسم بے شک بدل گیا ہے مگر کیفیت نہیں بدل رہی۔ امید کرتی ہوں میری یہ حقیری کاوش میرے احساسات کی ترجمان صفحات دوشیزہ پر شائع ہوکر میرے لیے تسکین کا باعث ہوگی اپنی بے بسی کا کچھ (لمحاتی ہی سہی) اثر تو زائل ہوجائے گا کہ ظلم اور ظالم کو بہ نوک قلم سے ہی برا تو جانا...... گو کہ دل تو ہر لمحہ دہائی دیتا ہے کاش کہ ہم سب بھی اپنے ملک کی خیر و بقا کے لیے متحد و یکجا ہوکر تفرقات، (لسانی علاقائی) بھلا دیں۔ آمین۔ دوشیزہ کے بارے میں دعا کرتی ہوں کہ ادارہ دوشیزہ سے وابستہ ہر فرد اپنی اپنی صلاحیتوں میں یکتا و مثالی ہوکر دوشیزہ کا وقار و تمکنت کا باعث بنا رہے۔ آمین ثم آمین۔ میں اُن سب ہی ساتھیوں سے دل سے شرمندہ ہوں جن کی خوشیوں اور دکھوں پر تحریری اظہار نہ کرپائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ سبھی ساتھیوں کی خوشیوں کو دائمی اور باقی رکھے اور سب ہی کو اپنے پیاروں سے بچھڑ جانے کے دکھ پر صبر و قرار عطا کرے۔ آمین۔ رضوانہ جی! دوشیزہ میں آپ کی آمد اور کاشی بھائی کے ساتھ آپ کی معاونت (دوشیزہ کے لیے) خوش آئند اور بھلی لگ رہی ہے۔ یقیناً دوشیزہ کی خاطر خواہ تبدیلیاں اس کا ہے یقیناً دوشیزہ کی خاطر خواہ تبدیلیاں اس کا نکھار بڑھا دیں گی۔ عقیلہ حق کو ناول کی تکمیل پر ڈھیروں مبارک باد اور ان عہدوں پر بھی جس سے قدرت نے انہیں نوازا ہے۔ بینا عالیہ کا ناول زبردست انداز تحریر لیے دلوں میں نقش ہوتا جارہا ہے۔ رفعت جی کا تو نام ہی کافی ہے افسوس کہ مجھے فروری کا شمارہ موصول نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میں پہلی قسط سے محروم ہوں۔ اُم مریم، نعمان اسحق، اور سب ہی مصنفین دوشیزہ کے فروزاں ستارے اپنی جگمگاہٹیں بکھیرتے دوشیزہ کی زینت بڑھا رہے ہیں۔ سب ہی کو مبارک باد۔ میرا بے ربط اندازِ تحریر اگر دل کو بھا جائے تو ضرور جگہ دیجیے گا۔ انشاء اللہ مزید تحریریں ارسال کرنے کی کوشش کروں گی۔ منزہ سہام کو میرا بہت سلام دیجیے گا۔ میری دعائیں آپ سب ہی کے لیے ہیں۔ اللہ ہمارے ہمارے وطن کو ہر خطے کو

امن وسلامتی کا گہوارہ بنادے۔اور عالم کو بھی امن وسلامتی کی فضاؤں سے آباد رکھے۔اللہ حافظ۔

ج: بہت پیاری زمر محفل میں خوش آمدید دوست آپ اتنی اچھی رائٹر ہیں آپ کے فینز کا اتنا بڑا حلقہ ہے تو دوست اللہ کے دیے ہوئے اس ٹیلینٹ میں چھپی خوشیوں کو باہر نکالیے زندگی خود بخود پیاری لگنے لگے گی اور ہاں یادرکھیے اپنی، اداسی اور پریشانی کسی نیگیٹو انسان سے مت شیئر کیا کریں کہ ایسے لوگ بچی ہوئی ہمت بھی ختم کردیتے ہیں۔آپ کا ناولٹ انشاءاللہ اگلے ماہ لگ رہا ہے ناولٹ نمبر میں۔

✉: ہماری بہت اچھی رائیٹر سنبل کراچی سے ہم سے مخاطب ہیں۔ڈیئر رضوانہ آپ کی دوشیزہ میں واپسی مبارک اور خوش آئند ہے۔میں نے چار پانچ افسانے بھیجے ہوئے ہیں دیکھیں کتنا انتظار کرواتے ہیں آپ لوگ آج کل کچھ مصروفیات زیادہ ہیں۔ مفصل تبصرے کے ساتھ جلدی ہی خط لکھوں گی۔

”اِک تقریب ملاقات“

بہت عزیز قارئین!

رائٹرز کے ساتھ تو گیٹ ٹوگیدر ہوتے ہی رہتے ہیں، کیوں نہ اس موسم میں اپنے دوشیزہ پڑھنے والے قارئین کے ساتھ ایک شام منائی جائے کیونکہ دوشیزہ کی یہ جگمگاہٹ آپ سب پڑھنے والوں کے دم سے ہی تو ہے۔سو محبتوں اور رابطوں کے اس بندھن کو مضبوط کرنے کے لیے ہم بہت جلد ”ایک تقریب ملاقات“ کا اہتمام کررہے ہیں، جس میں ہم اپنے قارئین کے ساتھ چائے پر کچھ لمحات کو یادگار بنائیں گے اور پھر اس تقریب خاص کی تصویری جھلکیاں بھی دوشیزہ میں شائع کی جائیں گی۔تو قارئین اس تقریب ملاقات میں شرکت کے لیے فوری طور پر مندرجہ ذیل ٹوکن پُر کرکے ہمیں آج ہی پوسٹ کردیں۔

نوٹ: دیر سے ملنے والے کوپن تقریب کے دعوت نامے میں شامل نہیں ہوسکیں گے

تقریب ملاقات

نام: ____________________

پتا: ____________________

رابطہ نمبر: ____________________

کوپن برائے
مئی 2015ء

نوٹ: اپنا کوپن ہمیں فوراً ارسال کریں ،ہم آپ کے منتظر ھیں

ھ: اچھی سنبل! محفل میں تمہاری تھوڑی سی بھی موجودگی رونق بکھیر گئی تمہاری تحریر فروری میں چھپ کر پسندیدگی کی سند پا چکی ہے۔ انشاء اللہ جون کے ناولٹ نمبر کے لیے تمہارا ناولٹ بھی نظر میں ہے۔ آپ جلدی سے مفصل تبصرے کے ساتھ آؤ نہ۔

✉: ثمینہ عرفان کراچی سے اپنی شوخیوں سمیت لائی ہیں۔ ڈیئر رضوانہ پرنس کی خدمت میں دو زانو ہو کہ ثمینہ عرفان فیض احمد فیض سے تھوڑی سی معذرت کے ساتھ کچھ کہنے کی جسارت چاہتی ہے۔

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے محفل میں آجانے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر ثمینہ نے لیا دوشیزہ کی محفل میں جانے کا نام

رضوانہ پرنس بقول آپ کے ''پیار و محبت و خلوص سے مہکتی محفل کی دوبارہ میزبانی کرتے ہوئے نہ جانے کیوں دل کو یقین سا ہے کہ آپ لوگ ہمیں بھولے نہیں ہوں گے۔ ارے یہ آپ نے کیا کہہ دیا بھلا شاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کو بھی کوئی بھولا ہے۔ بہار کے مہینے میں' دوشیزہ کی محفل میں رضوانہ پرنس کی آمد پر پھر ایک بار

تم جدھر بھی جاتے ہو پھول کھلنے لگتے ہیں
وقت نے ہمیں کتنا خوش قدم بنا دیا

ویسے پرنسز یہ میری اور آپ کی آپس کی باتیں ہیں۔ کچھ لوگوں کو اس قسم کی گفتگو شاید اچھی نہ لگے۔ یہ سب کچھ ہم نے اس لیے لکھا ہے آپ سب لوگ ہماری یادوں کے نہاں خانوں میں ہر لمحہ موجود ہیں۔ آپ سب لوگوں کو میری بہت ساری دعائیں۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے ہماری پیاری آنکھوں میں شدید خارش ہے۔ خدا کرے کراچی کے حالات اس وقت تک ٹھیک ہوں ورنہ کلفٹن اور ڈیفنس میں رہنے والے'' کچھ'' لوگ بڑی نخوت سے کہتے ہیں۔ یہاں تو سب کھلا ہوتا ہے۔ بازار وغیرہ یہاں کچھ نہیں ہوتا۔ کراچی صرف ان دونوں علاقوں پر مشتمل نہیں اتنے بڑے کراچی میں ہر جگہ سے لوگ بغرض روزگار آتے جاتے ہیں۔'' دوشیزہ ستارے، کب جگمگائیں گے، ہمارے چمکنے ابھی وقت ہے کہ ختم ہو گیا۔'' اجازت اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

ھ: بہت پیاری ثمینہ! اتنے خوبصورت انداز میں ویلکم کیا ہے تم نے کہ لفظ شکریہ چھوٹا لگ رہا ہے ۔ایسے ہی ہنستی مسکراتی ہماری تقریب میں بھی ضرور آنا۔ بس جلدی سے اپنی پیاری آنکھوں کو ٹھیک کر لو اور ہاں کلفٹن ڈیفنس والوں کا بہت صحیح تجزیہ کیا ہے تم نے۔

✉: روبینہ شاہین نے کراچی سے ہمیں لکھا ہے۔ بہت سی دعاوں کے ساتھ حاضر ہوں۔ اس ماہ کا شمارہ دیکھتے ہی خوبصورت لگا ماڈل کو دیکھ کر موسم کی تبدیلی کا احساس ہوا خوبصورت پرنٹ کا لباس ماڈل کی زینت بڑھا رہا تھا۔ ابتدائیہ اپنا احتساب پاکستان سے محبت کا آئینہ دار لگا۔ آغاز سفر۔ سفر کے آغاز کے لیے رخت سفر لیے ہوا تھا۔ دوشیزہ کی محفل میں خلوص کی مٹھاس اور چاہتوں کی خوشبو کی برسات تھی

پراسرار کہانی نمبر 2

Email : pearlpublications@hotmail.com

پراسرار نمبر 1 کی پذیرائی کے بعد پراسرار نمبر 2

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کر دیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔ جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کر دیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرالیں۔

سچی کہانیاں کا ماہ اگست کا شمارہ، پراسرار نمبر 2 ہوگا۔

نوٹ: پراسرار نمبر 2 کے لیے کہانیاں بھیجنے کی آخری تاریخ 5 جون ہے۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

جواس موسم گرما کے آغاز پر تازگی بخش رہی تھی۔ افسانے ایک پل کی سوچ ایک عمدہ ترین تحریر تھی۔ واقعی اس سوچ کی معاشرے کو ضرورت ہے مہکوا پنے آنگن میں صلح اور ہیپی اینڈنگ اسٹوری تھی۔ باقی تمام کہانیاں ٹھیک تھیں۔ باتیں ملاقاتیں بھی اس پرچے کی پہچان ہے۔ ناولٹ بھی اچھے ہیں دوشیزہ میگزین بولی وڈ ایک خوبصورت سلسلہ ہے۔ رنگ کائنات بھی خوب ہوتے ہیں۔ خدا کرے آپ سب یعنی اہلیانِ دوشیزہ اور قارئین دوشیزہ خوش رہیں اور ہر آنے والے ماہ میں دوشیزہ کا نکھار بڑھتا رہے۔ آمین۔

✍: پیاری سی روبینہ! تمہارا میٹھا میٹھا سا تبصرہ شامل اشاعت ہے۔ اس بار بھی آنا نہ بھولنا۔

✉: یاسمین اقبال سنگھ پورہ لاہور سے ہمیں لکھتی ہیں۔ خوش رہو ڈھیروں دعائیں تمہارے لیے جی آیا نوں۔ ویلکم۔ محفل میں چانن ہوگیا آپ کے آنے سے۔ ہر آنے ولا، ہمیں دل جان عزیز سے ہے۔ آپ سب کے دم سے تو ہم ہیں۔ خوبصورت سرورق سے سجا بہاریں لٹاتا ہوا مارچ کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ دونوں ہاتھوں سے زادِ راہ سمیٹتے ہوئے محفل میں پہنچنے پر اپنا خط پا کر دل باغ باغ ہوگیا۔ اور اپنی نظم شامل اشاعت دیکھ کر تو دل چاہا کہ تھوڑی سی لڈی ڈالیں۔ مگر ہائے رے فٹے منہ اِن گوڈوں گٹوں کا کہ کوئی ہڈی کھسک گئی تو کوئی نیا سیاپا نہ پڑ جائے میں تہہ دل سے آپ کی مشکور ہوں جب بھی کچھ لکھا آپ نے میرا مان بڑھایا جے یوں سب ہی کہانیاں اچھی تھیں۔ مگر محبتیں لٹاتا صدف آصف کا مکمل ناول گیٹ وے آف لو۔ رضوانہ کا ناولٹ اک ستم اور، تحسین انجم انصاری کا افسانہ صفائی کی مہک زبردست تحریریں تھیں۔ دامِ دل کی دوسری قسط نے بھی متاثر کیا۔ رنگ کائنات میں رضیہ سجاد ظہیر کی جلو خالہ نے میلہ لوٹ لیا۔ قارئین کے جوابات دل کو بھائے۔ چکن کارنر کے چٹ پٹے کھانے سواد آ گیا نئے لہجے نئی آوازیں میں سیدہ انزاء نقوی اور سمیع جمال کی غزلیں اچھی تھیں۔ مسز نگہت غفار کی نظم نے ہمیں اپنے خالی کمرے اور اقبال صاحب کی یاد دلا دی۔ نیک تمناؤں اور اچھے سے شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔

بات چلی تو نیل گگن سے تارے توڑے لوگوں نے
وقت پڑا تو آنکھ چرالی جان سے پیارے لوگوں نے

✍: ڈیئر یاسمین! آپ کے خط سے چھلکتی خوشی ہمیں بھی اپنے چارسو بکھرتی محسوس ہوئی۔ آپ کی غزلیں اچھی ہوتی ہیں۔ پھر بھلا کیوں نہ لگیں گی اور آپ کے تبصرے کا بھی سب کو انتظار رہتا ہے۔ اگلے ماہ اپریل اور مئی دونوں ہر تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉: عادل حسین اپنے جامع تبصرے کے ساتھ کراچی سے آئے ہیں۔ امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ اپریل کا دوشیزہ موسم بہار کے ٹھنڈے جھونکے کی طرح روایتی آب تاب سے جلوا گر ہوا۔ موسم کے لحاظ سے ٹائٹل بہت خوبصورت تھا۔ اپنا احتساب آپ بہت خوبصورت تھا۔ اگر یہ عادت ہم ڈال لیں تو ملک کے حالات بہت مختلف ہوں۔ زادِ راہ نے دل کو بہت سکون بخشا۔ اپنی محفل میں آئے تو اس بار بہت سے لوگ موجود تھے۔ اچھا لگا سب کو خوش آمدید۔ تقریب خاص کا احوال جان کر اچھا

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

لگا۔شہزاد شیخ کے جوابات بھی اچھے تھے۔منی اسکرین میں صرف ایک چینل کے ڈراموں کے متعلق تبصرے پڑھنے کو ملے؟ باقی چینلز نے ڈرامے بند کر دیے ہیں کیا؟ اب آتے ہیں افسانوں کی طرف سب سے پہلا افسانہ رُخ چوہدری کا ایک پل کی سوچ تھا جو کہ حقیقت سے قریب تر معلوم ہوا۔لڑکیوں کے رشتے واقعی ایک مسئلہ بن گئے ہیں لوگ کیسے کیسے عیب نکالتے ہیں یہ تو کوئی لڑکیوں کو والدین سے پوچھے! نائس رُخ صاحبہ۔عقیلہ حق صاحبہ کی لکیر بہت خوبصورت تھی۔انداز بیاں بھی خوبصورت۔غالب عرفان صاحب کا ایک مصرعہ ہے۔آگہی سزا ہوئی۔مجھے بہت یاد آیا ہے۔مجھکو اپنے آنگن میں نادیہ جہانگیر صاحبہ نے پیش کیا۔لڑکی کا اصل گھر شادی کے بعد سسرال ہی ہوتا ہے۔یہ بات لڑکیوں کو سمجھ جانی چاہیے۔جو کہ افسانے میں خوبصورتی سے سمجھائی گئی ہے۔شاہانہ خان جی کا بند ہونٹوں کی دعا بھی اچھا لگا۔یقین کر لینا چاہیے کہ زندگی کہ فیصلے اوپر والے کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔وہ کب کس طرح ہمیں مالا مال کر دے ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔وقت کہ اس کھیل میں آصفہ ضیاء احمد صاحبہ نے اچھا پیغام دیا ہے۔جذباتیت میں بہہ جانے والے کانٹے چن لیتے ہیں۔ماہ رو ایسا ہی کرنے جارہی تھی۔لیکن اچھے وقت پر آنکھیں کھل گئیں۔بہت خوب آصفہ جی! دام دل کی تیسری قسط بھی خوبصورت رہی۔تیرے عشق نچایا اور رحمن رحیم سدا سائیں بھی مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے چکے ہیں۔ویلڈن بینا عالیہ اور اُم مریم صاحبہ، مکمل ناول لاابالی تھا جو کہ حبیبہ طارق صاحبہ کا تھا۔بے شک اس ناول میں زندگی کے تمام رنگ تھے۔کہانی بھی خوبصورت تھی اور انداز بیاں بھی کسی پل بھی وقفہ لینے کو دل نہ چاہا اور ایک ہی سانس میں اختتام کر ڈالا۔مبارک ہو حبیبہ جی۔لمحوں نے خطا کی تھی فوزیہ احسان رانا صاحبہ کا ناولٹ تھا جس کی یہ پہلی قسط تھی۔پڑھ کر بہت مزہ آیا اور اگلی قسط کا انتظار ہے۔دوسرا ناولٹ میں ہاری شمع حفیظ صاحبہ کا تھا۔جو کہ ماں کی توقیر کو مزید بڑھا گیا۔پڑھ کر دل سے بے اختیار واہ نکلی جو اس ناولٹ کے خوبصورت ہونے کی دلیل تھی۔انتخاب خاص میں گز بھر کفن، شکیلہ اختر صاحبہ کا تھا جو کہ شاہکار تھا۔ہٹ لسٹ بھی کچھ خاص متاثر نہ کرسکی مگر آج کے دور کی مناسبت سے اگر پرکھا جائے تو اچھی تھی۔غزلیں اس بار بھی سب خوبصورت تھیں باقی تمام سلسلے ہمیشہ کی طرح خوبصورت پرچہ پیش کرنے پر مبارکباد سب کو سلام اور دعا۔کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معافی بشرط زندگی پھر ملاقات ہوگی۔اللہ حافظ

ج: عادل صاحب! آپ کا تبصرہ یقیناً سب رائیٹرز کے لیے خوبصورت تحفہ ہے۔اب دیکھتے ہیں ہمارا افسانہ نمبر آپ کو کتنا بھاتا ہے۔

✉: مسز نوید ہاشمی! نارتھ ناظم آباد کراچی سے دوستو اور ساتھیو۔آپ سب خیریت سے ہوں گے۔دوشیزہ لیٹ سے لیٹ ہوتا جارہا ہے۔مارچ میں کاشی چوہان نے عورت کے روپ کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔مارچ میں دوشیزہ کی محفل میں رضوانہ پرنس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی مگر کاشی چوہان آپ دوشیزہ کے جوابات نہیں دیں گے مگر آپ ہمارے ساتھ ہیں۔رضوانہ پرنس کو ہم ویلکم کہتے ہیں۔امید کرتی ہوں کاشی چوہان اور رضوانہ پرنس یہ دو چاند مل کر دوشیزہ میں چار چاند لگا دیں گے۔

رضوانہ آپ کو ایوارڈ کی تقریب میں دیکھا تھا آپ سب کی تصویریں میرے لیپ ٹاپ میں محفوظ ہیں۔ رائیٹر تو آپ بہت خوبصورت ہیں اب آپ کو ایڈیٹر کی پوسٹ پر دیکھتے ہیں کیسی ہیں۔ ویسے منزہ سہام اچھے اچھے نگینے ہی چن چن کر اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہیں۔ تو پھر کیوں نہ یہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں ڈائجسٹ اپنی چمک دمک نہ بڑھاتے چلے جائیں۔ ڈیئر مومنہ بتول اب آپ کی والدہ کی طبیعت کیسی ہے خدا سے دعا گو ہوں آپ دونوں کی طبیعت ٹھیک ہو جائے۔ ثمینہ عرفان آپ کے دیور کے بیٹے کی شادی کی بہت مبارک باد قبول فرمائیں دوسرے ملک یا شہر میں شادی انجوائے کرنے کا مزہ ہی الگ ہوتا ہے۔ ڈیئر عقیلہ حق آپ کو Loin Broad Caster کلب کی چارٹر پریذیڈنٹ بننے پر مبارک باد قبول فرمائیں۔ آنگن میں بارات جو ہر ماں کا سپنا ہوتا ہے۔ میری بیٹی بینش ہاشمی ابھی چودہ سال کی ہے پڑھ رہی ہے مگر میں بھی یہ سپنا دیکھتی ہوں خدا آپ کی بیٹی کے ساتھ سب بچیوں کو اپنے گھر میں خوش آباد رکھے۔ دلشاد نسیم کا افسانہ مٹی کی قسمت واقعی بتا گیا کہ مٹی کا رنگ نہیں بدلا مٹی کی قسمت بھی وہی ہے۔ نزہت جبیں ضیاء کا افسانہ بے نام مسافتیں بھی اچھا تھا۔ دوسروں کے گھروں میں جھانکنے والے اپنے گھروں کو بھول جاتے ہیں۔ رضوانہ پرنس کا ناول اک ستم اور بہت شاندار تھا۔ انسان کو غیروں کے دکھ درد دینے پر اتنا غم نہیں ہوتا جتنا اپنے لوگوں کے دھوکہ دینے پر ہوتا ہے۔ جو ہمارے اپنے ہوں۔ صدف آصف کا ناول گیٹ وے آف لو ایسی ظلم کہانی ہے جس میں جو مظلوم کی آہ عرش کو ہلا دیتی

ناولٹ نمبر

قارئین!

یادگار افسانہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ انشاءاللہ ماہِ جون کا شمارہ ناولٹ نمبر ہوگا۔

ایک ایسا شمارہ جو آپ کو یقیناً پسند آئے گا۔

اِس شمارے میں آپ کے پسندیدہ اور ایوارڈ ونر رائٹرز کی تحریریں آپ کے ذوق کی تسکین کا سبب بنیں گی۔

اُمید ہے ''ناولٹ نمبر'' آپ کو ضرور پسند آئے گا۔

(ماہِ جون کا شمارہ ناولٹ نمبر ہوگا ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں)

ہے جو بویا ہے وہی کاٹنا پڑتا ہے سچ سامنے ضرور آتا ہے۔ روبینہ شاہین کا افسانہ کیسی ہے یہ تنہائی بھی معاشرے کا وہ دکھ ہے جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ تحسین انجم انصاری کا افسانہ صفائی کی مہک مرد کی فطرت کو عیاں کرتی تحریر تھی۔ میرے پرندہ دل نعمان اسحٰق کی آخری قسط پڑھ لی اچھی تھی مگر بہت شاندار نہیں تھی انشاءاللہ نعمان بھائی اب اس سے زیادہ شاندار سلسلے وار کہانی پیش کریں گے انتظار رہے گا آپ کی تحریر کا۔ اپریل کا شمارہ 16 تاریخ کو ملا ہے ابھی کیسے پڑھ کر تبصرہ کروں خط ویسے بھی بے حد لمبا ہو گیا ہے۔ رضوانہ پرنس دعوت تقریب دے رہی تھیں۔ مگر قارئین کے ساتھ ہم نئے رائیٹرز کو بھی گیٹ ٹو گیدر کی دعوت دیں اپنے پسندیدہ رائٹر اور نئے رائٹرز سے مل کر ہمیں بھی خوشی ہوگی۔ رضوانہ پرنس ہم رائٹرز بھی ہیں اور قاری بھی کیا ہم دوشیزہ کے ستارے میں شامل ہو سکتے ہیں پلیز جواب ضرور دینا۔ اب اجازت۔

ج: مسز نوید! آپ یقیناً دوشیزہ کی تقریب میں شامل ہوسکتی ہیں۔ دوشیزہ میں چھپا کوپن بھر کر بھیج دیں۔ ہمیں آپ سے مل کر اچھا لگے گا۔ اس بار ہمیں اپریل کے شمارے کے لیے جو خط دیر سے موصول ہو رہے ہیں وہ انشاءاللہ اگلے ماہ لگیں گے۔

✉ : ریحانہ مجاہد لکھتی ہیں ڈیئر رضوانہ پرنس، اسلام وعلیکم! آج انتظار کے 'پُر لطف لمحات' کے بعد دوشیزہ کا دیدار ہوا۔ سالانہ خریدار ہونے کے ناطے رسالہ نہ ملنے کے لیے آفس ایک فون کرنے پر ہمیں 'خاص' بنادیا۔ دوشیزہ کے اسٹاف نے ہمیں اتنی اہمیت دی کہ شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ اس کے لیے ہم انتہائی شکر گزار ہیں۔ خاص طور پر مس شبانہ اقبال صاحب، رضوانہ آپ اور منزہ سہام صاحبہ کے۔ دوشیزہ کا ٹائٹل بے حد حسین ہے۔ دوشیزہ کی محفل میں جاکر بے حد اپنائیت کا احساس ہوا۔ دوشیزہ گلستان کا انتخاب لاجواب ہے اور نئے لہجے نئی آوازیں میں بھی غزل ونظم عمدہ ہیں۔ افزاء نقوی کی غزل نے متاثر کیا۔ دامِ دل رفعت سراج کا ناول بھی اشتیاق سے پڑھ رہے ہیں۔ رُخ چوہدری ہماری پسندیدہ مصنفہ ہیں اُن کا افسانہ اب خط لکھنے کے بعد پڑھنے کی باری آئے گی ورنہ خط لیٹ ہو جاتا باقی تبصرہ آئندہ ماہ۔

ج: پیاری سی ریحانہ! بہت معذرت کہ اِس بار پرچہ لیٹ ملا۔ انشاءاللہ اگلی بار تم اپریل کے شمارے پر بھی تبصرہ بھیج دینا۔ ویسے تم اِس محفل کی بہت ریگولر مہمان بن چکی ہو تمہارا انتظار رہتا ہے۔

✉ : افزاء نقوی کراچی سے لکھتی ہیں پیاری رضوانہ آپی، اسلام وعلیکم! اب کی مرتبہ دوشیزہ نے بہت انتظار کروایا۔ جیسے جیسے انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی جارہی تھیں۔ ہمارا اشتیاق بڑھتا جارہا تھا۔ آخر 23 اپریل کو دوشیزہ میگزین مل گیا۔ بہت خوبصورت اور زبردست ٹائٹل تھا۔ 'نئے لہجے نئی آوازیں' میں پہلی غزل اپنی دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ یہاں پر میرا ایک شعر غلط چھپ گیا ہے۔ ''باغ میں جھولتی رہتی تھی میں جھولا اکثر، زور سے پینگ وہ دینا وہ ہنسانا تیرا، چاندنی رات میں چھت پر اس حسین محفل میں ایک سے ایک غزل پڑھ کر سنانا تیرا'' یہ صحیح ہے۔ آپ کی حوصلہ افزائی ہے جو مجھ میں ایک انرجی لاتی ہے اور مجھے مسلسل لکھنے کے لیے آمادہ کرتی رہتی ہیں۔ آپ کے پیار آپ کی محبت کا بہت شکریہ۔

دنیا میں کس جگہ دوشیزہ کے چرچے نہیں

آپ دوشیزہ کے خریدار بن کر ملک کو

زرِ مبادلہ دیجیے

اندرون ملک =/890 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زر سالانہ

ملک	زر سالانہ	ملک	زر سالانہ
کویت	55 امریکی ڈالرز	ایران	55 امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55 امریکی ڈالرز	سری لنکا	55 امریکی ڈالرز
یو اے ای	55 امریکی ڈالرز	جاپان	55 امریکی ڈالرز
مصر	55 امریکی ڈالرز	لیبیا	55 امریکی ڈالرز
یونان	55 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55 امریکی ڈالرز
فرانس	55 امریکی ڈالرز	جرمنی	55 امریکی ڈالرز
برطانیہ	55 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55 امریکی ڈالرز
ناروے	55 امریکی ڈالرز	پولینڈ	55 امریکی ڈالرز
امریکہ	65 امریکی ڈالرز	کینیڈا	65 امریکی ڈالرز
افریقہ	65 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65 امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے — II C-88 - فرسٹ فلور - خیابانِ جامی کمرشل - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز 7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

عقیلہ حق کا افسانہ 'لکیر' بھی حقیقت پر مبنی اور خون کے رشتوں میں دوری خودغرضی اور اونچ نیچ کے فرق کو نمایاں کرتی ایک بہت حقیقت سے قریب تر تحریر ہے۔ ظفر عمر زبیری کا 'ہٹ لسٹ' بھی فنِ ظرافت کا رنگ لیے ہوئے ایک اچھی مزاحیہ تحریر ہے۔ کاشی چوہان کا 'اپنا احتساب آپ' بھی بہت اچھا تھا۔ وطن کی سالمیت اور مستقبل انشاء اللہ آنے والے کل میں بہت روشن ہوگا۔ اسکن اسپیشلسٹ ڈاکٹر خرم مشیر 'بیوٹی گائیڈ' میں بیوٹی کے مسائل بہت اچھی طرح حل کرتے ہیں اور صحیح گائیڈ کرتے ہیں۔

ج: سوئٹ سی انزا، شعر غلط چھپ جانے پر معذرت قبول کرو۔ ایسے ہی تبصروں اور اپنی خوب صورت شاعری کے ساتھ آتی رہنا۔

✉: نگہت غفار کا محبت سے مہکتا ہوا خط ہمیں کراچی سے موصول ہوا ہے پیاری رضوانہ جی سدا سلامت رہیں۔ شادوآباد رہیں۔ اس ماہ مارچ کا دوشیزہ منگوایا۔ آج نزہت کے گھر آئی تھی ان کے بیٹے منہاج کی شادی 27 مارچ کو ہے آج 20 تاریخ کو قرآن خوانی اور میلاد تھی مجھے پتا چلا کہ دوشیزہ آگیا۔ بس جی اب کہاں صبر ہوتا فوراً اپنی بہو (جبین کی بیٹی) کو مارکیٹ بھیجا رسالہ لے آئے۔ ماشاء اللہ سرورق بہت پیارا لگا اللہ اس بیٹی کو باعزت باآبرو رکھے (آمین) ماہ مارچ کاشی چوہان، ہونہار اور قابلِ تعریف ہے بہت ہی خوبصورت انداز میں عورت کی عزت واحترام کے لیے تمہید باندھی بے حد متاثر کن الفاظ اور انداز میں ہے جیتے رہو، سلامت رہو۔ ہمیشہ کی طرح قابلِ احترام اور مفید تحریر 'زادِ راہ' تھی۔ پھر پُرخلوص اپنائیت ومحبت سے بھری چاشنی میں گھلی محفل جی، دوشیزہ کی محفل' میں قدم رکھا۔ فریدہ فری جی اسلام علیکم اللہ رب العزت آپ کو لمبی عمر صحت کلی اور دین ودنیا کی ہر کامیابی اور خوش نصیب کرے۔ آپ کو میری تحریر اچھی لگی بہت شکریہ۔ خولہ عرفان جی...... مجھے نہیں خبر کے آپ کو بیٹا کہوں یا بہن بہر حال آپ میرے لیئے پیاری ہوگئی ہیں آپ نے بھی میرے افسانے کو پسندیدگی کی سند سے نوازا ہے۔ اللہ آپ کو زندگی کی ہر کامیابی اور مسرت نصیب کرے۔ عقیلہ حق بہت پیاری سی پُرخلوص اپنائیت سے بھری جنہیں میں کئی بار مل چکی ہوں بہت پیاری ہستی ہیں جو خود پیارا ہوتا ہے وہ دوسروں کو بھی پیار کرتا ہے آپ کے یہ ریمارکس میرے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ پیاری رضوانہ کوثر جی اَن دیکھی شخصیت مجھے بہت متاثر کرتی ہیں ان کی خوبصورت نظمیں مجھے موصول ہوتی رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے جتنی بھی تحریریں رضوانہ پرنس کے اعزاز میں نظر سے گزریں بالکل سچ لگیں۔ رضوانہ پرنس کی شخصیت سحر انگیز ہے میں جتنے بھی لوگوں سے پیار کرتی ہوں اُن میں تکبر، یا بے رُخی بالکل نہیں ہے بہت ہی خوبصورت اور اپنائیت کے انداز میں ملتے ہیں۔ آنگن میں بارات پڑھ کر دل سے یہ ہی دعا نکلی کہ اے مالک دوجہاں جتنی بھی بچیاں گھر میں رشتوں کے انتظار میں بیٹھی ہیں اُن سب کے لیے رشتے بھیج دے (آمین) افسانوں میں تقریباً سب ہی اچھے تھے لیکن جو زیادہ پسند آئے اُن میں 'اک ستم اور' رضوانہ جی 'میرے پرندہ دل' نعمان اسحٰق 'کیسی یہ تنہائی' روبینہ شاہین 'صفائی کی مہک' تحسین انجم 'بے نام مسافتیں' نزہت جبیں کے افسانے اچھے لگے۔ دوشیزہ گلستان میں بہت اچھی تحریریں تھیں۔ نئے لہجے نئی آوازیں فریدہ فری، معاویہ عنبر، نوشین اقبال، یاسمین اقبال کے لہجے اور

آوازیں بھلی لگیں۔ اجازت چاہنے سے پہلے چند دعائیہ کلمات حاضر ہیں۔ اللہ رب العزت پیاری رضوانہ جی، اچھے بیٹے کاشی، منزہ جی اور دیگر اسٹاف کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے۔ زندگی نے وفا کی تو اگلے ماہ حاضر ہوں گے۔

ھ: پیاری نگہت جی آپ کی بے لوث محبت ہم سب کے لیے کتنی قیمتی ہے اس کو بتانے کے لیے آپ ہی کہیے ہم الفاظ کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں۔ ہمیشہ سلامت رہے مفصل تبصرے کا بھی شکریہ۔

✉: آج پہلی بار ہم سے ملنے سینئر پروڈیوسر براڈ کاسٹر اور افسانہ نگار سیما رضا ردا بھی ہماری محفل میں آئی ہیں لکھتی ہیں رضوانہ پرنس آپ کو دوشیزہ میں دیکھ کر اور پڑھ کر اچھا لگا۔ اُمید ہے دوشیزہ کی کہانیوں میں اور نکھار آئے گا۔ نئے نئے سلسلے سامنے آئیں گے۔ ماہِ اپریل کی 27 تاریخ کو مجھے بہاالدین زکریا ایواڈ سے نوازا گیا۔ میں نے سوچا میں یہ خوش خبری منزہ سے اور آپ سے شیئر کروں۔ بہت جلد آپ سب کی خدمت میں اپنا ایک ناول ''ہم کو عبث بدنام کیا'' روانہ کر رہی ہوں۔ اِسے دوشیزہ کی زینت بنا کر شکریہ کا موقع دیں۔

ھ: سیما ڈیئر محفل میں خوش آمدید، منزہ اور ہم سب کی طرف سے ایوارڈ کی بے شمار مبارکباد۔ تمہارے ناول کا سُن کر دیکھو تو سبھی سب کے چہرے کھل اٹھے۔ بس اب فٹافٹ بھجوادو۔

✉: ہماری محفل اختتام کے قریب تھی کہ انڈیا سے بناویزا کے تحسین عابدی نے ہماری محفل میں آ کر ہم سب کو خوبصورت سرپرائز دیا ہے۔ پیاری رضوانہ باجی اور حاضرین محفل مجھے بے انتہا خوشی ہو رہی ہے کہ میں آج آپ سب کے درمیان بیٹھی ہوئی ہوں۔ میں تحفے کے طور پر آپ سب کے لیے اپنا ایک افسانہ بھی لے کر حاضر ہوئی ہوں اور مجھے اتنا اچھا لگ رہا ہے کہ میرا افسانہ پاکستان کے مشہور ڈائجسٹ دوشیزہ میں چھپے گا۔ ویسے اِسی ڈائجسٹ میں چند سال پہلے بھی میرا ایک افسانہ شائع ہو چکا ہے جو بدقسمتی سے میں نہیں دیکھ سکی۔ میں ایڈیٹر صاحبہ کی مشکور ہوں جن کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے آج میں پاکستانی میگزین میں بھی چھپنے کا اعزاز حاصل کر رہی ہوں۔ اللہ انہیں ہمیشہ خوش رکھے۔

ھ: بہت پیاری تحسین! ہم سب لوگ مل کر تمہیں دل سے اپنی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ جم جم آؤ کہ تم تو ہماری خاص مہمان ہو تمہارا افسانہ شائع ہو رہا ہے۔ اُمید ہے کہ آئندہ بھی تم آتی رہو گی کہ تمہارے ناطے اب مزید انڈیا کے پیارے پیارے لوگ دوشیزہ کے یقیناً گرویدہ ہو جائیں گے۔

اچھا دوستو!

اب اپنی میزبان کو اگلے ماہ تک کے لیے اجازت دیں۔ اُمید ہے آپ لوگوں کو افسانہ نمبر پسند آیا ہوگا۔ جون کی تپتی گرمیوں میں ہم انشاء اللہ آپ کے لیے ایک بہت خوبصورت ناولٹ نمبر لے کر آ رہے ہیں جو یقیناً آپ کے دل اور آنکھوں کو بہت پیاری سی ٹھنڈک پہنچائے گا۔

ہمیشہ خوش اور مسکراتے رہیں، بے شمار دعاؤں کے ساتھ

دعاؤں کی طالب

رضوانہ پرنس

آج کی ہر دلعزیز اور کامیاب اداکارہ

سجل علی

ذیشان فراز

☆ وہ نام جو شناخت کا باعث ہے؟

♥: سجل علی۔

☆ گھر والے کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟

♥: سجایا بجو۔

☆ وہ مقام جہاں سے آشنا ہو کر آنکھ کھولی؟

♥: لاہور۔

☆ زندگی کس برج (star) کے زیر اثر ہے؟

♥: کیپری کورن۔

☆ علم کی کتنی دولت کمائی؟

♥: تعلیم جاری ہے فی الحال گریجویشن کیا ہے۔

☆ کتنے بھائی بہن ہیں۔ آپ کا نمبر؟

♥: ہم تین بہن بھائی ہیں۔ میرا نمبر پہلا ہے۔

☆ اداکاری کے لیے اپنی طبیعت اور مزاج کے برعکس موڈ بنانا ضروری ہوتا ہے؟

♥: بالکل ایک اداکار کے لیے یہ لازمی چیز ہے۔ اداکار ہر حالت میں اپنا کام ایمانداری سے انجام دیتا ہے۔ یہی کامیابی کی نشانی ہے۔

☆: اس زندگی میں کون سا کام سب سے مشکل ہے؟

♥: زندگی میں اپنے لیے وقت نکالنا سب سے مشکل کام ہے۔

☆: کوئی ایسی خواہش جو اب تک پوری نہ ہوئی ہو؟

♥: اللہ کا شکر ہے ہر خواہش اب تک پوری ہوئی ہے۔

☆: اپنی کون سی عادت بہت پسند ہے؟

♥: میں دوسروں کی باتوں کو بہت غور سے سنتی ہوں۔

☆: اپنی کون سی عادت سخت ناپسند ہے؟

♥: میری سب سے ناپسندیدہ عادت یہ ہے کہ میں بہت جلد غصے میں آجاتی ہوں۔

☆: کبھی مصروفیات میں سے وقت نکال کر روڈ پر سے بھی کچھ کھایا ہے؟

♥: دل تو بہت چاہتا ہے۔ مگر......

☆: اردو والے "سفر" کا ذریعہ کیا ہے؟

♥: اپنی گاڑی۔

☆ صبح کا آغاز کس طرح کرتی ہیں؟

♥: صبح اٹھتے ہی شوٹ پر جانے کو دل چاہتا ہے۔

☆ دن کا کون سا پہر اچھا لگتا ہے؟

♥: مجھے دن کا ہر پہر اچھا لگتا ہے۔

☆: کون سے ایسے معاشرتی رویے ہیں جو آپ کے لیے دکھ اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں؟

♥: مجھے نظر انداز کیے جانا بالکل پسند نہیں۔ لوگ اکثر دوسروں کو اپنی اناؤں کی تسکین کے لیے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

☆: دولت، عزت، شہرت، محبت اور صحت اپنی ترجیح کے اعتبار سے ترتیب دیجیے۔

♥: محبت، صحت، عزت، شہرت، دولت۔

☆: سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

☆: موت خوف کا باعث ہے؟ اور اس کے علاوہ ڈرنے کی کوئی وجہ؟

♥: ہائے اللہ مرنے مارنے کی باتیں تو نہ کریں۔ ابھی میں نے دیکھا ہی کیا ہے۔

☆: فراز کے اس خیال پر کس حد تک یقین رکھتی ہیں کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا؟

♥: یہ تو سچ ہے کہ ہر ہاتھ ملانے والا دوست نہیں ہوتا لیکن پھر بھی ہمیں ہر ہاتھ ملانے والے پر بھروسہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

☆: کھانا گھر کا پسند ہے یا باہر کا فاسٹ فوڈ؟

♥: سمندر کو دیکھ کر بس یہ خیال آتا ہے کہ انسان کو بھی سمندر ہی جیسا گہرا ہونا چاہیے۔

☆: خودستائشی کی کس حد تک قائل ہیں؟

♥: خودستائشی ایک انسان کا پیدائشی حق ہے اور شوبزنس کا دوسرا نام ہی خودستائشی ہے۔

☆: کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟

♥: غصے میں بھوک ہی کب لگتی ہے۔

☆: آپ کی نظر میں خدا کی حسین تخلیق کیا ہے؟

♥: میں خود۔ (قہقہہ مار کر جواب دیا گیا)

♥: میری مما بہت مزے کا کھانا بناتی ہیں اور مجھے اپنی مما کے ہاتھ کا کھانا بہت پسند ہے۔

☆: زندگی کے معاملات میں آپ تقدیر کی قائل ہیں یا تدبیر کی؟

♥: دونوں کی۔

☆: ویک اینڈ کیسے گزارتی ہیں؟

♥: چھٹی کے دن میں گیارہ بجے تک سوتی ہوں اور پھر اُٹھ کر فریش ہونے کے بعد اپنا اسکرپٹ لے کر بیٹھ جاتی ہوں۔

☆آپ کا پسندیدہ لباس؟
♥:جس لباس میں انسان کمفرٹیبل فیل کرے وہی سب سے اچھا لباس ہے۔
☆شاپنگ کرنا کیسا لگتا ہے؟
♥:اتنا ہی جتنا ایک لڑکی کو اچھا لگنا چاہیے۔
☆جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے یا نہیں؟
♥:ایسے سوال تو نہ پوچھیں۔ (قہقہہ لگا کر کہا گیا)
☆آپ کی نظر میں بہترین تحفہ کیا ہے؟
♥:تحفے سے زیادہ تحفہ دینے والے کی اہمیت ہوتی ہے۔
☆محبت کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟
♥:محبت تو از خود اظہار ہوتی ہے۔
☆آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟
♥:شوبز کی دنیا کی صبح اور شام کام پر منحصر ہے۔
☆بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟
♥:میں اتنی جولی ہوں کہ اپنے آپ کو بور ہونے نہیں دیتی۔ آپ مجھے اکیلے کمرے میں بھی چھوڑ دیں تو بھی میں انجوائے کروں گی۔
☆شہرت، رحمت ہے یا زحمت؟
♥:شہرت تو شہرت ہوتی ہے۔ اور بھلا یہ سب کو کہاں ملتی ہے۔ اس لیے اسے زحمت کہنے والے سب سے بڑے بے وقوف ہیں۔
☆:کیا آپ اچھی رازداں ہیں؟
♥:آف کورس!
☆:لوگ آپ سے مل کر سب سے پہلے کیا اظہار کرتے ہیں؟
♥:تم بہت کیوٹ ہو۔
☆:آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
♥:بس ایک شعر اکثر آئینہ دیکھ کر یاد آتا ہے۔ ''آئینہ دیکھ کر بھی لگتی ہے
خود کو اپنی نظر بھی لگتی ہے''

☆:''ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا'' کس حد تک عمل کرتی ہیں؟
♥:میں بھلا کسی کے کیا کام آسکتی ہوں۔ میں تو خود اپنے پیرنٹس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرتی۔ میرے پیرنٹس بہت کیئرفل اور دوسروں کے لیے انتہائی Sensitive ہیں۔
☆:کس ملک کی شہریت لینا چاہتی ہیں؟
♥:پیرس۔
☆:زندگی کب بری محسوس ہوتی ہے؟
♥:زندگی خوبصورت ہے اس لیے زندگی بھلا کس طرح بُری محسوس ہوسکتی ہے۔
☆:مطالعہ عادت ہے یا وقت گزاری؟
♥:مطالعہ عادت ہے۔
☆:انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی کس حد تک ہے؟
♥:بہت زیادہ ہے۔ مگر میں چاہنے کے باوجود بھی ان چیزوں کو وقت نہیں دے سکتی۔
☆:کوئی ایسا تحفہ ہے جسے پاکر بہت خوش ہوئی ہوں؟
♥:17 جنوری کو میرا برتھ ڈے آتا ہے۔ اسی دن میں نے اپنا پہلا کانٹریکٹ سائن کیا تھا۔ تو میں یہ سمجھتی ہوں کہ اللہ کی طرف سے یہ میرے لیے بہت قیمتی تحفہ تھا۔
☆:کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش مند ہیں۔
♥:قائداعظم
☆:حرف آخر کیا چاہنا چاہیں گی؟
♥:میں چاہتی ہوں کہ ہمارا ملک خواندہ ہوجائے۔ ہمیں تعلیم کی اہمیت کو ماننا چاہیے۔ تعلیم ہمیں شعور بخشتی ہے۔ جب ہماری آنے والی نسلیں تعلیم یافتہ ہوجائیں گی تو تعصب اور تفرقے کی تمام دیواریں ڈھے جائیں گی۔ پاکستان قائداعظم کا پاکستان بن جائے گا اور علامہ اقبال کے خواب کی اصل تعبیر بھی تعلیم میں ہی پوشیدہ ہے۔ ☆☆

☆☆......☆☆

مینی اسکرین

اے آر وائی کے خوبصورت پروگرام

مشرخ

قارئین گرامی آیئے ARY کے پروگراموں کی طرف سیریل ''کھلونا'' ایک امیر شخص عمر سے وابستہ کہانی ہے۔ عمر کے والد کا انتقال ہوگیا ہے اب ان کی فیملی میں عمر اور اس کی والدہ اور فوزیہ رہتے ہیں۔ ان کے گھر کے قریب ہی عمر کی ممانی اور ان کی بیٹی ماریا رہتی ہے۔ ماریا عمر کو پسند کرتی ہے۔ حرا ایک سیدھی سادھی لڑکی ہے۔ اتفاق سے حرا جس کمپنی میں کام کرتی ہے اس کمپنی کے لیے عمر بھی کام کررہا ہے۔ وہ حرا کو دیکھ کر اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ سیریل کھلونا ہر منگل کی رات نو بجے دکھائی جائے گی۔ سیریل ''رنگ لاگا'' کو تحریر کیا ہے ثناء فہد نے جب کہ ہدایت انجم شہزاد کی ہیں اس کے فنکاروں میں فیصل قریشی، صائمہ، نیلم منیر، ذالے سرحدی، صلاالدین تنیو، افشاں قریشی، اور مومل خالد شامل ہیں۔ سیریل ''رنگ لاگا'' ہر بدھ کی رات 8 بجے دکھائی جائے گی۔ جبکہ خوبصورت سیریل ''پیوند'' ہفتہ کی رات 9 بجے دکھائی جائے گی۔ سیریل ''ممکن'' میں ہر بات ممکن ہے سعد خان کی فوزیہ سے

سیریل 'رنگ لاگا' میں صائمہ' ژالے سرحدی' نیلم منیر اور فیصل قریشی

ہے۔ اب دیکھنا ہے عمر کو بحیثیت شوہر ماریا یا حرا ان دونوں میں سے کون عمر کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں اس سیریل کو تحریر کیا ہے بینا صدیقی اور مبارک کملانی نے جبکہ اس کے فنکاروں میں اریج فاطمہ، گوہر رشید، حمیرا ذاہد اور ذیبا بختار قابل ذکر ملاقات پچیس برس پہلے ہوئی تھی جب وہ اُس کی سیکریٹری تھی پھر سعد نے اور فوزیہ نے خفیہ طور پر شادی کرلی اور فوزیہ کو سعد خان خاموشی سے چھوڑ کر ملک سے باہر چلا جاتا ہے۔ فوزیہ کے ہاں ایک بچی سادیہ جنم لیتی ہے سادیہ کی عمر بائیس سال ہے۔ اس

سیریل کی کہانی کا اختتام کیسے ہوگا اس کے لیے آپ سیریل ''ممکن'' دیکھنی ہوگی اس سیریل کو تحریر کیا ہے ثروت نذیر جبکہ ہدایت فرقان خان کی ہیں، اس کے فنکاروں میں سارہ خان، جنید خان، ساجد حسن، فرح شاہ، طاہرہ امام اور سعدیہ فضل قابل ذکر ہیں سیریل ''ممکن'' ہر منگل کی رات 8 بجے دکھائی جارہی ہے۔
سیریل ''وہ عاشق تھا شاید'' کو تحریر کیا ہے مہوش حسن اور اس کا مرکزی کردار ثناء نے ادا کیا ہے جو خوش شکل اور خوش مزاج لڑکی ہے۔ ثناء کا تعلق ایک مڈل کلاس گھرانے سے ہے جو اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ ایک چھوٹی بہن اپنے شوہر کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہی ہے ثناء کے والد نے مرنے کے بعد

سیریل 'کھلونا' میں گوہر رشید اور اریج فاطمہ

اتنا کچھ چھوڑا کہ ثناء کی ماں کو کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑا۔ ثناء اپنے کلاس فیلو شہریار سے جنوں کی حد تک عشق کرتی ہے جو ایک بہت بڑے بزنس مین کا بیٹا ہے۔ اب دولت اور محبت کا مقابلہ ہے دیکھنا یہ ہے کہ اس کھیل میں دولت کی جیت ہوتی ہے یا محبت کی۔ اس سیریل کے فنکاروں میں صنم چوہدری، سلیمان سعید، صبا فیصل، ثناء عسکری، عدنان جیلانی، اور فضیلہ کافی قابل ذکر ہیں۔ یہ سیریل ہر پیر کی

سوپ 'گڑیا رانی' میں موبل خالد

رات 9 بجے دکھائی جارہی ہے۔
خوبصورت سوپ ''گڑیا رانی'' اپنی مثال آپ ہیں اس کے فنکاروں میں موبل خالد، علی عباس قابل ذکر ہیں۔ یہ سوپ پیر سے لے کر جمعرات تک روزانہ ARY ڈیجیٹل سے روزانہ دکھایا جائے گا۔ ''گڈ مارننگ پاکستان'' ندا یاسر خوبصورتی سے کر رہی ہیں اور شائقین ٹی وی ندا یاسر کی خوبصورت

سیریل 'پیوند' میں ثناء جاوید

باتوں سے خاصے محظوظ ہوتے ہیں۔

☆☆......☆☆

ناول

رفعت سراج

دامِ دل

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں بے ترتیب کردیں گی
رفعت سراج کے جادوگر قلم سے، نئے سلسلے وار ناول کی چوتھی کڑی

''اب تم خود ہی بتاؤ ایک ہی ایک میرا بیٹا...... اگر ایک بیٹے کا باپ نہ بنا تو سمجھو ہمارا تو نام و نشان مٹ جائے گا۔ نسل تو بیٹے سے چلتی ہے۔'' فردوس نے اپنی لنگوٹی سہیلی کو دن چڑھتے ہی اپنے گھر طلب کرلیا تھا۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو شوہر اور بیٹے سے کرنے کی نہیں ہوتیں۔ کسی رازدار سہیلی سے
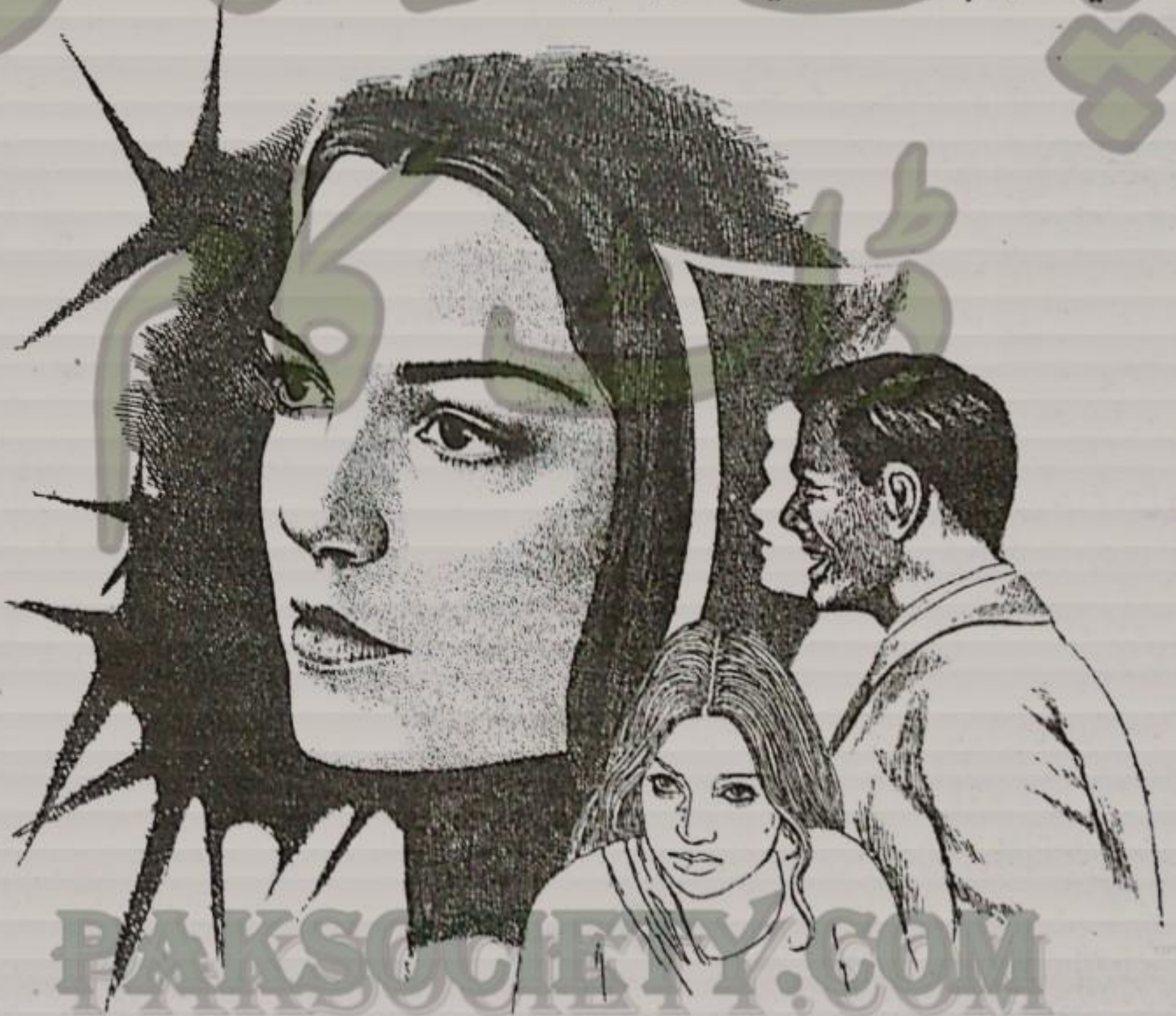
کر کے ہی طبیعت ہلکی ہوتی ہے کیونکہ سننے والی حسب توفیق مفت کے مشوروں سے نواز کر حق 'Share'
دوستی بھی ادا کر رہی ہوتی ہے۔
''تم نے بالکل ٹھیک کہا۔'' فردوس کی بچپن' مکتب' مدرسہ' اسکول کی دیرینہ رفیقہ غزالہ نے تائید کرنے میں لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ دوست دوست سے پہچانا جاتا ہے۔ جیسی روح ویسے فرشتے...... تب ہی دوستانے میں دل کے بوجھ اترتے ہیں۔
''بھلے سات بیٹیاں پیدا ہوں مگر ایک بیٹا بھی ہونا چاہیے' خاندان میں عزت ہوتی ہے۔''
''اور نہیں تو کیا' ہم تو سمجھو ذلیل ہو کر رہ گئے ہیں۔'' فردوس نے غزالہ کے ہم خیال ہونے پر اور زیادہ شدت سے اپنی محرومی کو محسوس کیا۔
''میں تو یاور سے کہہ رہی تھی کہ ہم تمہاری دوسری شادی کا اعلان کرائے دیتے ہیں۔ پھر دیکھو کیسے ایمن کے ماں باپ گرتے پڑتے بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر آتے ہیں اور ہمارے پاؤں پڑتے ہیں۔'' فردوس نے اپنی سوچی ہوئی ترکیب بھی لگے ہاتھوں بتادی۔
''جھوٹ موٹ اعلان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سچ میں یاور کی دوسری شادی کیوں نہیں کر دیتیں؟'' غزالہ نے بہت بڑی بات بہت آرام سے کی۔ فردوس حق دق غزالہ کی شکل دیکھنے لگی۔
''ارے سوکن اور اوپر سے تین بچوں کی ماں...... کون دینے لگا یاور کو اپنی بیٹی! فرض کر و اگر میں یاور کی دوسری شادی کروں گی بھی تو کسی بیوہ یا طلاق یافتہ سے تو نہیں کروں گی۔ گوری چٹی' بڑی بڑی آنکھوں والی مورنی جیسی کنواری سے کروں گی جو ہر لحاظ سے ایمن پر بھاری ہو۔'' فردوس نے پروجیکٹ کا ماڈل بنا کر غزالہ کے سامنے رکھ دیا۔
غزالہ نے بڑے اعتماد وغرور سے یوں مسکرا کر فردوس کی طرف دیکھا گویا کوئی انٹرنیشنل ایوارڈ یافتہ سول انجینئر کسی Heavy Project کی ذمہ داری بڑے اعتماد سے اٹھالیتا ہے اور ایگریمنٹ سائن کر دیتا ہے۔
''حسین وجمیل' بیس اکیس سال کی گریجویٹ جو ٹرک بھر کے جہیز بھی لائے گی۔ شہ زور ٹرک نہیں...... کھیتوں سے گندم اٹھانے والا بڑا ٹرک۔'' غزالہ اس شانِ بے نیازی سے بات کر رہی تھی جیسے کوئی جنتی ہاتھ بڑھائے اور من پسند پھل توڑ لے۔ فردوس تو مارے خوشی کے ریشہ خطمی میں مبتلا ہونے لگی۔ کوئی دیکھنے والا دیکھتا تو اندیشہ مند ہوتا کہ غش نہ پڑ جائے۔
''ارے سچ کہو۔''
''تم کرنے والی بنو...... باقی مجھ پر چھوڑو۔ ارے میں تو لڑکی والوں کو صرف ایک ہی بات بولوں گی۔ اکلوتا لڑکا ہے۔ ذاتی گھر ہے۔ باپ اے۔جی سندھ سے ریٹائرڈ ہیں۔ لاکھوں کی گریجویٹی' فنڈ ملے جو بنک میں دھرے ہیں۔ پنشن آتی ہے، دو دکانوں سے کرایہ آتا ہے۔ لڑکا خود P.P.L میں ہے۔ بھاری تنخواہ' گاڑی' میڈیکل فری' بس اس کے بعد تو لڑکی والے بولیں گے نکاح شام کو کرنا ہے یا ابھی؟ ارے گھر گھر لڑکیاں بیٹھی ہیں' اچھے شریف نیک لڑکے نایاب ہو گئے ہیں۔ تمہاری تو کوئی بیٹی نہیں تمہیں کیا خبر۔'' غزالہ نے تھیلا بھر کر خوب کس کے گرہ لگائی۔
''ارے میں صدقے جاؤں تمہارے! میں تو سب کچھ بھول بیٹھی۔ یہ بھی بھول گئی کہ میرا بیٹا شادی

شدہ اور ڈھائی بچوں کا باپ ہے۔ میں تمہارے لیے چائے اور رس گلے لے کر آتی ہوں۔''
''ڈھائی نہیں' پونے تین بچے...... تیسرا آنے میں دو مہینے ہی تو بچے ہیں۔'' غزالہ بھی رس گلے کی متوقع مدارت سے پھولی نہ سمائیں۔ ابھی تو مُشک کی تھیلی دکھائی تھی کھولی نہیں تھی تو رس گلے کھانے کو مل رہے تھے۔ من چاہی بہو گھر میں لاکر سجادی تو جانے کس کس طرح نوازا جائے گا۔ یہ تو غزالہ کو اچھی طرح پتا تھا کہ فردوس کنجوس تو بالکل نہیں ہے۔ گرمیوں میں گل احمد اور سردیوں میں الکرم کا سوٹ تو بطور تحفہ فردوس کی طرف سے تو ویسے ہی ملتا تھا۔
فردوس چائے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی اور پیاری سہیلی معرکۃ الآراء پروگرام ترتیب دے رہی تھی۔

☆......☆......☆

ثمر کا معمول تھا کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر ماں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتا پھر اپنے کمرے میں جا کر لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ جاتا۔ پہلے In Box چیک کرتا پھر ضروری Reply کرتا کچھ ضروری فون بھی نمٹا لیتا۔ اس دوران چمن کچن کی صفائی سے فارغ ہو کر سونے کی تیاری کرتی اگر نماز پڑھنا ہوتی جو کبھی کبھی وقت پر نہیں پڑھ پاتی تھی تو سونے کی تیاری سے پہلے نماز پڑھ لیتی۔ اس کے بعد کے ایک دو گھنٹے وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے۔ کبھی ثمر زیادہ تھکا ہوا ہوتا تو جلدی سو جاتا تھا۔ چمن اس کے سو جانے کے بعد لاؤنج میں جا کر T.V دیکھ لیتی تھی مگر آج کیونکہ شدید جھڑپ نے ماحول مکدر کیا ہوا تھا اس لیے ثمر اسے جتانے کے لیے بیڈ روم سے آؤٹ تھا اور اپنا لیپ ٹاپ لاؤنج میں کھول کر بیٹھ گیا تھا۔
بانو آپا کی اتفاق سے ثمر پر نظر پڑ گئی تھی، کچھ بولنے کو دل مچلنے لگا۔ یاد آیا ان کی بھانجی ثوبیہ کی شادی کا کارڈ آیا ہوا ہے۔ کارڈ کے بہانے ثمر سے کچھ دیر بات چیت ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے اسی بہانے جلے دل کے کچھ پھپھولے بھی پھوٹ جائیں۔ فوراً اپنے کمرے میں گئیں اور کارڈ اُٹھا لائیں۔ ایک نظر ثمر کی طرف دیکھ کر اس کی مصروفیت کا اندازہ کیا۔ ثمر نے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کر انگڑائی لی اور ساتھ ہی لمبی جماہی بھی...... یہ شارٹ بریک بہت تھا۔ جھٹ کارڈ اُس کی گود میں رکھ دیا۔
ثمر اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا ایک دم گڑ بڑا گیا۔
''یہ کیا ہے؟'' اس نے گود میں پڑا کارڈ اُٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔
''ثوبیہ کی شادی کا کارڈ ہے۔'' بانو آپا ثمر کے سامنے آرام سے بیٹھ گئیں۔
''اوہ...... ثوبیہ کی شادی ہو رہی ہے۔ بہت بہت مبارک ہو۔'' ثمر نے کارڈ کھولتے ہوئے خوشگوار موڈ میں کہا۔
''ثوبیہ میری سگی بھانجی ہے۔ لفافے سے کام نہیں چلے گا۔ سوچ رہی ہوں کوئی قیمتی تحفہ دینا چاہیے' کیا کہتے ہو؟''
''نو پرابلم...... آپ سوچ لیجیے کیا دینا چاہتی ہیں۔ پھر بتا دیجیے گا۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔''
''اللہ تمہیں خوش رکھے۔ جگ جگ جیو۔ یہ وہی ثوبیہ ہے جس پر میری شروع سے نظر تھی اور میں اسے اپنی بہو کے روپ میں دیکھا کرتی تھی۔''

''امی جان چھوڑیں پرانی باتیں...... کرنٹ افیئر پر بات کریں۔'' ثمر نے ماں کی خوابیدہ حسرت کو زور کی تھپکی دے کر گہری نیند سلانے کی کوشش کی' ساتھ ہی ایک زور کی جماہی لی...... مخاطب زور کی جماہی لے رہا ہو تو یہ اس کی بے توجہی کی علامت ہوتی ہے۔ مگر بانو آپا پر اس وقت سو جماہیوں کا بھی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ ابھی تو خبر سنائی تھی۔ پھپھولے تو نہیں پھوڑے تھے۔

''عمر بھر اس بات کا قلق تو رہے گا کہ بھائی صاحب نے تمہیں رشتہ دینے سے کیوں انکار کیا تھا۔ کیا کمی تھی میرے بیٹے میں۔''

''امی جان! بس چھوڑیں بھی...... سانپ گزر گیا اب لکیر پیٹنے کا فائدہ؟ آپ خود ہی تو یہ مثال دیتی ہیں۔ ہر انسان کی اپنی اپنی چوائس ہوتی ہے۔''

ثمر کو اس موضوع سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ جوں جوں نیند کا خمار بڑھ رہا تھا اور بیڈ روم میں جانے کا وقت قریب آ رہا تھا' اندر ایک رسہ کشی شروع ہو چکی تھی۔ سونے سے پہلے اُس کا سامنا...... جو ہر آن اُس کی مردانگی کو ٹھیس پہنچاتی رہتی تھی۔

''سُنا ہے کسی بہت بڑے زمیندار کا بیٹا ہے۔ امریکہ سے پڑھ کر آیا ہے۔ زمینوں جائیدادوں والے لوگ ہیں۔''

''اللہ مبارک کرے ثوبیہ کو زمینیں' جائیدادیں۔'' ثمر نے بڑی توانا سی جماہی کو پہلوان بن کر پچھاڑنے کی کوشش میں منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

مگر بانو آپا کا خیال تھا روز جماہیاں بھی آتی ہیں۔ روز سوتے بھی ہیں۔ کیا ہوا جو آدھا گھنٹہ مزید جاگ لیے۔

''کل مہندی کا فنکشن ہے بہت بڑے ہوٹل میں۔'' انہوں نے خبر مکمل کی۔

''اچھی بات ہے۔ میں گاڑی بھجوا دوں گا۔ آپ چمن کے ساتھ چلی جایئے گا۔ یہ تو ویسے بھی لیڈیز فنکشن ہوتا ہے۔''

''چمن کو تو میں کسی صورت نہیں لے کر جاؤں گی۔ میری معصوم بھولی بھالی سی بھانجی! اللہ اسے خوشیاں مبارک کرے۔ اس پر کسی بانجھ بنجر کا سایا نہیں ڈالوں گی۔ مہندی والے دن سات سہاگنیں شگن کرتی ہیں۔ اگر نفیسہ نے دلہن کو مٹھائی کھلانے کے لیے چمن کو بھی پکار لیا۔ تو اچھی بات نہیں۔'' بانو آپا نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کانا پھوسی کے انداز میں کہا۔

''امی جان اس سائنسی دور میں بھی آپ شگن کی باتیں کرتی ہیں؟'' اور یہ مسلمانوں کے ہاں شگن دگن نہیں ہوتے۔ آپ چمن کو ساتھ لے جایئے گا۔'' ثمر نے کارڈ ٹیبل پر رکھ کر لیپ ٹاپ Shut Down کر دیا اور ایک زور کی انگڑائی لی۔

''توبہ...... توبہ...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... خوشی کے موقع پر تو بانجھ عورت کو دور ہی رکھنا چاہیے۔ تم جتنے مرضی بیگم کے چونچلے کرو۔ مگر مجھے کسی بات پر مجبور نہ کرو۔'' بانو آپا کا موڈ خراب ہو گیا۔ بیٹے نے دل رکھنے کو بھی بیوی کی کوئی برائی نہیں کی تھی۔ ابھی تعویذ پلاتے چالیس دن کہاں ہوئے ہیں...... فی الحال تو ایسی ہی باتیں کرے گا۔ انہوں نے اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے دل کو سمجھایا۔

☆......☆......☆

ثمر بیڈ روم میں داخل ہوا تو چمن ٹیبل لیمپ کی ہلکی روشنی میں کوئی ناول پڑھ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر ایک پل کے لیے اس نے دروازے کی طرف دیکھا تھا پھر دوبارہ نظریں ناول پر جمادی تھیں۔

ثمر نے بھی اس پر ایک نگاہِ غلط نہیں ڈالی۔ چپ چاپ بیڈ پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر آنکھیں بند کیے سینے پر دونوں ہاتھ رکھے بے حس وحرکت لیٹا رہا پھر پھٹ پڑنے کے انداز میں بولا۔

''یہ لیمپ بند کرو...... تمہیں پتا ہے ناں جب تک کمرے میں ہلکی سی بھی روشنی ہو میں سو نہیں سکتا۔''

چمن نے کوئی جواب دیے بغیر لیمپ سوئچ آف کر دیا اور ناول سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر ثمر کی طرف سے کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

ہر جھگڑے کے بعد وہ بات کرنے میں پہل کرتی تھی۔ مجرم نہ سہی ملزم تو تھی۔ جسے قدم قدم پر اپنے ناکردہ جرم کا احساس دلایا جاتا تھا اور وہ ناکردہ مجرم بھی اتنا بھیانک کہ جس کے ناقابلِ ضمانت وارنٹ نکلے ہوئے تھے۔

میاں بیوی کا رشتہ بھی بڑا عجیب و غریب رشتہ ہے۔ بعض اوقات دلوں میں سیاروں جتنا فاصلہ محسوس ہوتا ہے۔ مگر ایک بیڈ روم اور ایک بیڈ پر مٹی کے ڈھیر کی طرح پڑے ہوئے قانونی بندھن کی لاج رکھ رہے ہوتے ہیں۔ ناراضگی شدت کی ہو تو رات کا دامن' دامنِ قیامت سے بندھ جاتا ہے۔ صبح ہو کر ہی نہیں دیتی۔ بیوی ادھیڑ بن میں لگ جاتی ہے کہ صبح اس ظالم کو ناشتا دے یا خالی پیٹ جانے دے تاکہ پتا چلے کہ بیوی کیا ہوتی ہے۔

شوہر سوچتا ہے۔ صبح ناشتا لا کر رکھے گی تو کہوں گا میرے لیے تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ باہر بہت ہوٹل ہیں۔ بنا ہوا ناشتا چھوڑ کر جاؤں گا تو سارا دن جلتی پھنکتی رہے گی۔ ایسی عورت کی یہی سزا ہے۔

چمن کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ مگر آج وجہ ثمر کی ناراضگی نہیں...... ایمن تھی۔

سگی بہن کی گرہستی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ اس عظیم اندیشے کے سامنے ثمر کی ناراضگی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ہیپاٹائٹس کے مریض کو ڈاکٹر پہلے دیکھے گا یا Virol سے ناک پونچھتے مریض کو؟

☆......☆......☆

''بیٹا...... تم عاقل و بالغ ہو۔ شادی شدہ بچوں والی ہو۔ تمہاری شادی کرتے وقت تمہاری رضامندی معلوم کی تھی۔ یہ اُس وقت کنواری بیٹی کا حق تھا۔ آج خلع کا اختیار بھی تمہارا حق ہے۔ میں تمہارے کسی فیصلے پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مگر باپ ہونے کے ناتے یہ سمجھانا میرا فرض ہے کہ جو فیصلہ بھی کرو، پہلے ان بچیوں کی طرف دیکھو...... ان کے نفع و نقصان کا سوچو۔''

مشکور احمد ایمن کے سر پر ہاتھ رکھے اپنا کرب چھپا کر بہت وقار سے سمجھا رہے تھے۔ اجڑی ہوئی دکھ سے ٹوٹتی ہوئی بیٹی کو سمجھانا کچھ اتنا آسان بھی نہیں ہوتا جبکہ جی چاہتا ہو کہ کوئی کرامت کا لمحہ ہاتھ آ جائے اور پلک جھپکتے میں بیٹی کے دُکھ دور ہو جائیں۔

''ابو جان جو کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے اس کے بعد بھی آپ چاہیں گے کہ میں اس دوزخ میں

واپس چلی جاؤں؟'' بولتے بولتے ایمن کی آواز بھرانے لگی۔
''نہیں! میرا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تم ابھی بچیوں کو لے کر چلی جاؤ۔ مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ یاور تمہیں لینے آئے تو ضد نہ کرنا۔ غصے کی کیفیت جب ضد میں تبدیل ہوتی ہے تو غصے سے زیادہ نقصان ضد سے ہوتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں ناں غصہ حماقت سے شروع ہو کر ندامت پر ختم ہوتا ہے۔''
''بس اب کسی قسم کی گنجائش نہیں ہے مشکور صاحب۔ بیٹی کی طرف دیکھیں کیا حال ہے اس کا...... باپ تو باپ کی شفقت سے محروم رکھے ہوئے ہے۔ ماں کو تو زندہ رہنے دیں۔ تاکہ اپنی بچیوں کی ٹھیک سے دیکھ بھال تو کر سکے۔'' عطیہ بیگم کچن سے نکل کر دوپٹے کے آنچل سے ہاتھ پونچھتی اُن کے پاس آگئیں۔ وہ کافی دیر سے کچن میں مشکور صاحب کی بات سن رہی تھیں۔ مگر اب جیسے رہا نہ گیا، کام چھوڑ کر چلی آئیں۔ انہیں تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مشکور احمد بیٹی کو واپس بھیجنے کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں۔ ماں کے سامنے دلائل پانی کے بلبلے ہوتے ہیں۔ وہ تو ایمن کی آنکھوں کے گرد پھیلے ہوئے سیاہ حلقے اور بات بات پر ٹپکتے آنسو دیکھ رہی تھیں اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔
''میں اس وقت صرف اور صرف ان معصوم بچیوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں جن کے سامنے زندگی کے بہت سے دور ہیں، ابھی تو بچپن ہے۔ پھر نوعمری اس کے بعد جوانی، پھر ادھیڑ عمری......''
''آپ رہنے دیں، جن بچوں کے باپ نہیں ہوتے تو کیا وہ جیتے نہیں ہیں؟'' عطیہ بیگم نے جذباتی انداز میں فوراً بات کاٹ دی تھی۔
''مرے ہوئے باپ اور زندہ باپ میں کیا فرق نہیں ہوتا؟'' مشکور احمد کے لہجے میں نہ جلد بازی تھی، نہ غصہ وجذباتیت، بہت ٹھہراؤ اور غور وخوض تھا۔
''ابو جان آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کر رہے۔ یاور بچیوں کو نہ توجہ دیتے ہیں نہ ٹائم...... انہیں اپنے والدین کی باتیں، نصیحتیں، مشورے سننے سے ہی فرصت نہیں۔'' ایمن نے کہا اور بھل بھل رو پڑی۔
''میں کیسے مان لوں۔ دنیا کا وہ کون سا باپ ہے جسے اپنی اولاد سے محبت نہ ہو، یہ خلافِ فطرت بات ہے بیٹا۔ تمہاری بدگمانی کی دو وجوہات ضرور ہو سکتی ہیں۔ نمبر ایک کہ وہ ذہنی طور پر اتنا اُلجھا ہوا رہتا ہو کہ اپنا ہی ہوش نہ ہو۔ نمبر دو اپنے والدین کو تمہارے مقابلے میں اتنا سچا اور دیانتدار سمجھتا ہو کہ تمہاری ہر بات اسے غلط لگتی ہو۔ ایک شدید ذہنی دباؤ کا شکار انسان اس سے ہم نارمل اور متوازن رویے کی اُمید کیسے رکھ سکتے ہیں۔ اسی لیے مشکل وقت پر صبر کرنا چاہیے کیونکہ صورتِ حال بدلتی ضرور ہے۔ وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔''
''اجی بس رہنے دیں...... وہاں اولاد کا مطلب صرف بیٹا ہے۔ بیٹیوں کو تو اولاد ہی نہیں مانتے۔ یہ تو بس بھیڑ بکریاں ہیں۔ آپ اسے کچھ دن سکون سے رہنے دیں۔ دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھائے گی تو دماغ بھی سوچنے سمجھنے کے قابل ہوگا۔ بھوکی رہ رہ کر پیلی زرد ہو رہی ہے۔ اس حال میں تو عورت کا ویسے ہی زیادہ خیال رکھا جاتا ہے، دوسری جان اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اسے بھی ماں کے ذریعے ہی کھانا پینا ملتا ہے۔'' عطیہ بیگم مشکور احمد کے سمجھانے بجھانے سے بری طرح چڑ چکی تھیں۔

''میں اسے ابھی جانے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ اس کی حالت دیکھ کر جتنا دکھ تمہیں ہے عطیہ مجھے بھی اتنا ہی ہے۔ میرے سمجھانے بجھانے کا مقصد اسے مزید بڑے دکھوں سے بچانے کی کوشش ہے۔'' مشکور احمد نے عطیہ بیگم کو بھی مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''یقین کیجیے ابو جان وہاں صبح سے رات تک صرف بیٹے کی بات ہوتی ہے۔ اگر یاور ان بچیوں کو وہ پیار دیتے جو ان کا پیدائشی حق ہے تو میں ان کو پیار کرنے والے باپ سے دور کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔''

''اور نہیں تو کیا......'' عطیہ بیگم نے گرہ لگانے میں ذرا برابر تاخیر نہیں کی۔ بالکل عینی شاہد کی سی کیفیت تھی جو کہ اکثر ماؤں کی ہوتی ہے۔

''بچیاں اس طرح ڈری سہمی رہتی ہیں جیسے اپنے گھر میں نہ ہوں کسی کے گھر رہنے آئی ہوئی ہوں۔ ظالم اور سفاک لوگ ہیں۔ یہ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ نرمی ایمان کی علامتوں میں سے ہے جسے نرمی عطا کی گئی اسے خیر عطا کی گئی۔ جو پھول جیسی بچیوں کے ساتھ نرمی نہ کریں، جو ان کا اپنا خون ہیں۔ ان کے اوپر تو ویسے ہی اللہ کی پھٹکار ہے۔''

''سخت دلوں کا علاج نرمی ہے عطیہ! حسن اخلاق سے ہی دلوں کو نرم کیا جاتا ہے۔'' مشکور احمد مزید بگاڑ کے حق میں کسی صورت نہیں تھے اور عورتوں کا جذباتی پن کسی حد تک چلا جاتا ہے اس سے کماحقہٗ واقف و آگاہ تھے۔

''چٹانوں میں بیج نہیں بوئے جاتے۔ زمین ہو تو نرم کریں اور بیج ڈالیں...... جسے معصوم بچوں پر پیار نہ آئے اس کا دل تو ویسے ہی رحمت سے خالی ہے۔ بس اب آپ اپنا کام کریں اور اسے چار دن سکون سے کھانے سونے دیں۔'' عطیہ بیگم کی مامتا ہر مصلحت سے عاری تھی اور ممتا مصلحت سے عاری ہی ہوتی ہے۔

انہوں نے کبھی مشکور صاحب کے سامنے اتنی بحث نہیں کی تھی مگر اس وقت سمجھاتے بجھاتے مشکور احمد انہیں یاور کی پارٹی کے ممبر ہی دکھائی دے رہے تھے۔ اولاد کی محبت نے برسوں کے تعلق کو بھی کنارے رکھ دیا تھا۔

اچھا بھئی فی الحال تمہاری ماں کے حسب خواہش اس Chapter کو Close کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ یاور اب کیا کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے بعد آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ آرام سے کھاؤ پیو، نیند پوری کرو یہ تمہارے باپ کا گھر ہے۔ جہاں تمہیں سارے انسانی حقوق حاصل ہیں۔'' مشکور احمد نے بڑی شفقت سے ایمن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر عطیہ بیگم کی طرف دیکھا۔

''اب تو خوش ہیں؟'' عطیہ بیگم نے خفا خفا نظروں سے مشکور احمد کی طرف دیکھا۔

''یہ ہنسی مذاق کا ماحول نہیں ہے مشکور صاحب! اس کے آنسو میرے دل پر آگ بن کر گر رہے ہیں۔''

''میں آگ میں پھول کھلانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ آگے جو اللہ کی مرضی۔'' وہ یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایمن آنچل میں آنسو جذب کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

''امی جان آج بھابی صاحبہ دکھائی نہیں دے رہیں، خیریت ہے ناں؟''

''ارے اس کے لیے تو فی الحال سب خیریت ہے۔ مشکل تو ہمارے لیے ہے بند کمرے میں پڑی اخبار کتابیں چاٹ رہی ہوگی اور تو کوئی کام نہیں ہے اور اللہ نے بھی ابھی تک کسی کام سے نہیں لگایا۔ فرصت ہی فرصت ہے۔''

بانو آپا کی لاڈلی اکلوتی بیٹی آج صبح ہی صبح آدھمکی تھی اور اس نے ماں کو دل کی بھڑاس نکالنے کا ایک خوبصورت وقت ہدیہ کیا تھا۔

''امی جان بس آپ ایک نظر وجیہہ کا دیکھ لیں، بس دیکھتی رہ جائیں گی۔'' افشاں نے ٹھنڈی سانس بھر کر ماں کی آتشِ شوق بھڑکانے کی سعی کی۔

''ارے کیا اس کی فوٹو کھینچ کر گھر میں سجالوں؟ بھائی تو تمہارا فی الحال پٹھے پر ہاتھ دھرنے نہیں دیتا۔'' بانو آپا کلس کر بولیں۔ بیٹی نے انجانے میں زخموں پر نمک چھڑک دیا تھا۔

''شاہ جی کے تعویذ کا کوئی اثر نہیں ہوا؟'' افشاں نے ماں کے کان کے قریب منہ لے کر کھسر پھسر شروع کی۔

''حیرت ہے مجھے بھی مگر میرا دل کہتا ہے، اس کی ماں بھی کسی کالے علم والے کے چرن چھونے جاتی ہے۔ ورنہ شاہ جی کا ایک تعویذ چوبیس گھنٹے میں اپنا کام دکھاتا ہے۔'' بانو آپا کے سوئے ہوئے تفکرات ان کی شکل بگاڑنے لگے۔

''لو یہ کیا بات ہوئی، پھر کہاں کے عامل کامل ہوئے جب کسی کے کرائے کا توڑ بھی نہ کرسکیں۔'' افشاں کے چہرے سے مایوسی ٹپکنے لگی۔ سارا جوش وخروش نقشِ برآب کی طرح لمحے میں غائب ہوگیا۔

''خبردار! ان کے بارے میں کوئی الٹی سیدھی بات منہ سے نہ نکالنا۔ ان کے مؤکل دماغ اُلٹا کردیتے ہیں۔'' بانو آپا نے دہل کر تنبیہ کی۔

''اتنے ہی طاقتور مؤکل ہیں تو دشمنوں کو چھوڑ کر ہمارے سر پر کیوں سوار ہیں؟ مؤکلوں کو اتنا بھی نہیں پتا کہ پیسہ ہم نے خرچ کیا ہے۔'' افشاں بری طرح مایوس اور بدمزہ ہوچکی تھی۔ اس کا بے قرار ہوکر آنے

کا مقصد تو یہ تھا کہ ماں خوش خبریوں کے خوان سجائے بیٹھی ہوگی۔ اچھی اچھی خبریں سُن کر سارا دن اچھا گزرے گا۔

اسے تو رکشے کو دیے ہوئے سو روپے تک کھلنے لگے۔ اس کے حساب سے تو یہ بھی شاہ جی کے کھاتے میں چلے گئے تھے جو ابھی تک سراسر نقصان کا کھاتا تھا۔

''تم فکر نہ کرو! چینی گھول گھول کر بھی پلا رہی ہوں اور تعویذ بھی، شاہ جی اس کی ماں کے کرائے کو جڑ سے کاٹ کر ہی دم لیں گے۔ پچھلی شب جمعہ کو بھی انہوں نے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر پڑھائی کی تھی۔''

بانو آپا کی قوتِ یقین میں افشاں دراڑ ڈالنے میں ابھی تک ناکام تھی۔

''آپ نے دیکھا تھا انہیں ایک ٹانگ پر کھڑے ہوئے؟'' افشاں پہلے سے زیادہ بدک گئی۔ ''آپ نے غور سے دیکھا ہے انہیں۔ کہیں وہ ایک ٹانگ ہی کے تو نہیں ہیں؟'' افشاں نے نظروں کا رُخ اس سمت موڑا جہاں ثمر اور چمن کا بیڈ روم تھا۔ آنکھوں سے لگتا تھا روحانی طور پر بند دروازہ پھلانگ کر اندر چلی گئی ہو اور چمن کے نرخرے پر دونوں ہاتھ رکھ دیے ہوں۔

''ارے ذرا صبر سے کام لو۔ بابا جی کے پاس کوئی ایک تعویذ ہے...... ارے وہ تو علم کا سمندر ہیں۔''
بانو آپا نے اب رسانیت سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہمارا ایک ہی بھائی ہے، وہ بھی جورو کا غلام۔ دنیا کے بھائی چھپ کر دو دو شادیاں کر لیتے ہیں۔ ہماری تو قسمت ہی خراب ہے۔'' افشاں بڑبڑانے لگی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے قسمت کو کوسنے کی۔ تم نے اپنی ماں کو ہار مانتے دیکھا ہے۔ انشاء اللہ...... بہت جلد تم وجیہہ کو دلہن بھابی بنا کر اس گھر میں لاؤ گی۔'' بانو آپا کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا۔

''اللہ وہ حسین دن جلد لائے۔ اس بند کمرے کے بھوت سے تو نجات ملے۔ کیا میری آواز نہیں سنی ہوگی؟ اتنا نہیں ہوتا کہ چلو گھر میں اکلوتی نند آئی ہے باہر آ کر چائے پانی پوچھ لیں۔'' افشاں منہ ہی منہ میں پھر بدبدائی تھی۔

''ارے ہم تو چپکے چپکے باتیں کر رہے ہیں کہاں سے سنے گی۔'' بانو آپا نے ناگوار لہجے میں کہا تھا۔

''سلام تو زور سے کیا تھا اور آپ نے جواب بھی دیا تھا۔ وہ تو میرے کان میں نہیں بولا تھا۔'' افشاں کی بدگمانی تو یوں بھی اُدھار کھائے بیٹھی رہتی تھی ذرا سا روزن بھی ملا تو سرپٹ دوڑی۔

''اچھا امی اب میں چلوں گی...... کچھ گروسری بھی لینی ہے۔ دکانیں کھل گئی ہوں گی۔ یہاں تو جب آتے ہیں ذلیل ہو کر ہی جاتے ہیں۔ کہنے کو ماں کا گھر ہے۔'' افشاں چمن کو سنانے کی خاطر اب اونچا بول رہی تھی۔

چمن نیند کی گولی کھا کر بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے فرشتے بھی فرصت پا کر سیر کو نکل گئے تھے ورنہ افشاں کے فرشتوں کو بتا ہی دیتے کہ وہ سو رہی ہے۔

☆......☆......☆

ندا ثمر کے آفس میں نئی نئی اپائنٹ ہوئی تھی مگر اپنی بے ساختگی اور چرب زبانی کے باعث سب میں اِس طرح گھل مل گئی تھی بلکہ لگتا ہی نہیں تھا کہ 'New Entery' ہے۔ مگر ابھی تک اس کا ثمر سے آمنا

سامنا نہیں ہوا تھا وجہ یہ تھی کہ ثمر گزشتہ ایک ہفتے سے باہر میٹنگز میں جا رہا تھا کیونکہ چیئر مین ٹور پر گئے ہوئے تھے اور اضافی ذمہ داریاں سنبھالنا ثمر کی جاب کا حصہ تھا۔

اس وقت بھی آفس میں افسرانِ بالا اور اعلیٰ افسران موجود نہیں تھے اس لیے آفس میں کام سے زیادہ ہلڑ بازی مچی ہوئی تھی۔

کوئی چائے لے کر آ رہا تھا، کوئی Sports چینل لگا کر کوئی یادگار فٹبال میچ دیکھ رہا تھا، کوئی کرسی کے بجائے ٹیبل پر چڑھا بیٹھا تھا۔

اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ منہ پر Cap رکھے اپنی نیندوں کی قضا ادا کر رہا تھا۔ ندا کی نظر پڑی تو اسے جا لیا۔

''عمیر...... عمیر...... ایک پہیلی بوجھو تو جانیں تم کتنے اسمارٹ ہو۔ اور ابھی پتا چل جائے گا کہ تم اکاؤنٹ کے لیے مس سلیکشن تو نہیں ہو۔''

اگر مس سلیکشن ہوں بھی تو تمہیں کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر میں نے کسی کو 300 کے بجائے تین ہزار دے دیے تو ستائیس سو تم اپنی جیب سے دو گی؟'' عمر نے اونگھتے اونگھتے چونک کر ٹکا سا جواب دیا۔

''کھیلنے سے پہلے ہارنے کی ضرورت نہیں۔ میری پہیلی بوجھنا ہوگی۔''

''زبردستی ہے؟'' عمیر نے کیپ اور اچھی طرح چہرے پر جمالی اور ٹانگیں مزید پھیلائیں۔

''تم پہیلی تو بوجھو...... ہم مر گئے ہیں کیا؟'' نعمان نے چائے کا سپ لے کر شرارت سے اپنے کولیگ شارق کو آنکھ ماری۔

''بھئی پہیلی تو سب کے لیے ہے۔ میں تو عمیر کو اٹینشن کر رہی ہوں۔ اسے بھی تو Participate کرنا چاہیے۔ کیا مفت کی سیلری لیتا ہے؟'' ندا ہاتھ دھو کر عمیر کے پیچھے پڑی ہوئی تھی جو سب سے زیادہ

اس کے ساتھ تعاون کرتا تھا اور اس وقت گوشۂ عافیت میں بیٹھنے کی نیت کر بیٹھا تھا جو ندا کو تو برداشت ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''پہیلی بوجھ رہی ہو یا ہم جائیں۔ میری چائے ختم ہونے والی ہے۔'' نعمان نے پھر ندا کو چھیڑا۔

''تم نے اگر سچ مچ میری پہیلی بوجھ لی تو دوسرا کپ اپنے ہاتھوں سے بنا کر پلاؤں گی۔'' ندا نے اپنی فطری برجستگی کا مظاہرہ کیا۔

''یہ سُن کر تو جی چاہ رہا ہے کہ بس زندگی بھر تم پہیلیاں بوجھتی رہو اور میں بغیر ہاتھ پیر ہلائے چائے پیتا رہوں۔'' وہ پھر شرارت سے گویا ہوا۔

''ہاتھ تو ہلانا پڑیں گے۔ میں گرم گرم چائے تمہارے منہ میں تو نہیں ڈال سکتی۔''

''یہ پتا نہیں پہیلی کب بوجھے گی۔ یار کسی پہلوان کو بلوا کر اِسے اٹھواؤ۔ میں ذرا سی نیند کرلوں۔'' عمیر نے اونگھتے ہوئے بری طرح چڑ کر کہا۔

''کوئی ہاتھ تو لگا کر دیکھے۔''

''اچھا خیر میں پہیلی پوچھ لیتی ہوں، کہیں یہ سچ مچ گہری نیند نہ سو جائے۔'' ندا نے عمیر کو تند نظروں سے گھورا۔

''ہم اٹینشن ہیں۔ ہمیں سانپ سونگھ گیا ہے جلدی سے پوچھو۔'' شارق نے کہا اور بُت بن کر بیٹھ گیا۔

''سانپ تو ابھی سونگھے گا بچو...... جب میں پہیلی پوچھوں گی۔'' ندا نے بڑے فخر و اعتماد سے کہا تھا۔

''یار کہیں سے سانپ ہی پکڑ کر لے آؤ۔ یہ تو جائے یہاں سے۔'' عمیر نے پھر اونگھتے اونگھتے کہا تھا۔

''اچھا...... خواتین و حضرات پہیلی بوجھیے۔''

''خواتین کہاں ہیں! جلدی سے بلاؤ۔'' شارق نے بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''تمہیں تو سانپ سونگھا ہوا تھا...... کیوں بولے؟'' ندا نے اسکیل اٹھا کر ٹیچر کی طرح دھمکایا۔

''اوہ...... سوری......؟'' شارق پھر 'اچھا بچہ' بن گیا۔

''جناب پہیلی سنیے! ایک کنوئیں میں پانچ چوہے تھے۔ دو مر گئے باقی کتنے کنوئیں کے اندر ہیں؟''

''ہاہا...... ہا...... ہا...... یہ بھی کوئی پہیلی ہے۔ اسے کہتے ہیں کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ سیدھی سی بات ہے تین بچے۔ یہ پہیلی ہے یا میتھ کا سوال۔'' نعمان نے جی بھر کر مذاق اڑایا۔

''یہی تو پہیلی ہے۔ شارق تم بتاؤ۔'' ندا نے شارق کا پیچھا لیا۔

''میں کچھ غور کر رہا ہوں...... ہار نہیں مانی۔''

''عمیر تم بتاؤ!'' ندا نے عمیر کا کندھا ہلایا۔

''نہیں بتاتا، جو کرنا ہے کرلو...... دیکھ نہیں رہیں کہ میں آرام فرما رہا ہوں۔''

''تمہیں پتا ہے کہ تم ہار جاؤ گے اس لیے شروع سے ڈرامہ کر رہے ہو۔'' ندا چڑ کر بولی۔ اس کی ساری ترکیبیں اکارت گئی تھیں۔ عمیر پر کوئی اثر ہی نہیں تھا۔

''بھئی میرا حساب تو یہ بتاتا ہے کہ تین ہی بچے ہیں۔'' شارق میں اب مزید غور خوض کا یارانہ رہا۔

''ہاہا...... '' ندا نے مذاق اڑانے والے انداز میں قہقہہ لگایا۔ بے وقوفوں کنوئیں میں ابھی بھی پانچ ہی چوہے ہیں۔ دو مردہ تین زندہ۔ دیکھا...... کتنی مشکل پہیلی تھی۔'' ندا تینوں کی طرف بڑے تفاخر سے دیکھ رہی تھی۔

''چلو زیادہ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب میں تمہیں ایک لطیفہ سناتی ہوں تاکہ تمہارا تھکا ہوا ذہن فریش ہو جائے۔'' یہ کہتے ہی ندا نے لطیفہ سنانا شروع کر دیا۔

''ایک ٹیکسی ڈرائیور بڑی ہائی اسپیڈ میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ برابر میں لالہ جی بیٹھے تھے۔ تیز رفتاری سے گھبرا کر بولے...... مڑا آہستہ چلاؤ۔ امارا چوٹا چوٹا گیارہ بچہ اے......

ٹیکسی ڈرائیور نے غصے سے لالہ جی کو گھورا اور بولا۔

''اپنی اسپیڈ دیکھی ہے۔''

نعمان اور شارق سچ مچ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔ ندا یوں ان کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے ریمپ پر Cat Walk کرنے کی تیاری کر رہی ہو۔ عین اسی لمحے ثمر نے اندر قدم رکھا تھا۔ شارق اور نعمان بدحواس ہو کر اپنی اپنی ٹیبل کی طرف دوڑے۔ ندا ان کی بھاگ دوڑ سے بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔ یہ اس کا ثمر سے پہلا آمنا سامنا تھا کولیگز کی بدحواسی نے اس کے بھی چھکے چھڑا دیے۔

''السلام علیکم سر! میں ندا شیخ۔ وہ سر میں تو عمیر کو جگانے آئی تھی۔ اس کو ٹمپریچر ہے ناں۔ دو پیناڈول کھلا دی تھیں اس لیے اسے نیند آ گئی۔ ورنہ یہ سوتا تھوڑا ہی ہے۔ بہت کام کرتا ہے۔ بتا رہا تھا کہ اوور ٹائم بھی کرتا ہے۔''

''Stop...... کیا میں نے آپ سے کچھ پوچھا۔ آپ کا یہی بتانا کافی ہے کہ آپ Fresh Employ ہیں۔''

عمیر نے ثمر کی آواز سنی تو سنبھلنے کے بجائے سرو قد کھڑا ہو گیا۔ Cap ہاتھ میں تھی۔ ثمر کی آواز سنتے ہی اس کے اوسان جاتے رہے۔

''آپ کو ٹمپریچر ہے تو آپ اوپر جا کر ریسٹ کیجیے۔'' ثمر نے ندا کو نظر انداز کر کے براہِ راست عمیر کو مخاطب کیا۔

''جی سر...... تھینک یُو سر...... اب کافی بہتر ہوں۔'' عمیر بوکھلا کر ندا کی طرف دیکھنے لگا۔

''جی سر میں نے دو ٹیبلیٹ دی تھیں۔ جب ٹمپریچر ہوتا ہے تو دو ہی کھاتے ہیں سر۔''

''شارق، نعمان! آپ میرے چیمبر میں تشریف لائیں۔ عمیر کو ٹمپریچر ہے اور آپ اس کے سر پر کھڑے قہقہے لگا رہے ہیں۔'' ثمر یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

''مروا دیا۔'' شارق نے ندا کو گھورا۔

''آتے ہی ہماری ریپوٹیشن خراب کر دی۔'' نعمان کا موڈ بھی آف ہو گیا تھا۔ ندا کو سنانے سے باز نہ آیا۔

''میں نے کیا کیا ہے۔ ابھی تو خوب ہنس رہے تھے۔'' ندا بھی منہ پھلا کر اپنی ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔

اسے ٹمپریچر چڑھا کر بچا لیا۔ ہمیں بھی کوئی فلو، انفلوئنزا لگا دیتیں۔''

''تم ہنس رہے تھے۔ فلو والے کی آنکھوں سے پانی بہتا ہے۔'' ندا نے چڑ کر جواب دیا۔

''یہ تمہارا ماموں لگتا ہے؟'' نعمان نے عمیر کی طرف اشارہ کیا جواب بڑی سنجیدگی سے ونڈو اوپن کر رہا تھا۔

''میری ماں کا بھائی بنانے کی ضرورت نہیں۔ اسے میں نے اپنا بھائی بنایا ہے۔ جاؤ! سر تمہارا ویٹ کر رہے ہیں۔'' ندا نے اپنا کمپیوٹر آن کرتے ہوئے بڑی بے مروتی سے کہا۔

نعمان اور شارق بڑی بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''جاؤ یار! سوری کرلو۔ دیر کرو گے تو غصہ بڑھے گا۔'' عمیر نے Mouse اُٹھا کر غور سے دیکھا کہ لائٹ جلتی نظر نہیں آ رہی تھی' شاید خراب ہو گیا تھا۔ نعمان اور شارق ثمر کے آفس کی طرف بڑھے تو عمیر نے ندا کی طرف دیکھا۔

''تھینک یُو! مگر اُن بے چاروں کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔''

''غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔'' ندا نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''یہ تو ثمر صاحب ہیں، زیادہ غصہ نہیں کرتے مگر چیئر مین ٹور سے واپس آ جائیں تو احتیاط کرنا۔ غصے کے بہت تیز ہیں۔ Suspend نہیں کرتے Terminate کر دیتے ہیں۔''

''باپ رے! اتنی مشکل سے تو Job ملی ہے۔ اچھا کیا بتا دیا۔ تم بہت اچھے ہو عمیر۔ جب ہی تو میں نے تمہیں بھائی بنایا ہے۔'' ندا اب بہت محتاط انداز میں بات کر رہی تھی۔ عمیر مسکرا دیا۔ وہ پہلی ملاقات ہی میں جان گیا تھا کہ ندا صاف دل کی با کردار لڑکی ہے۔ پہلی بار Job کے لیے نکلی ہے۔ قدرے سادہ اور بے وقوف ہے۔ بچوں جیسی بے ساختگی اور معصومیت کی حامل ہے اسی لیے وہ اس کو بلا شرائط اپنا تعاون فراہم کر دیتا تھا اور ندا کو اس کی وجہ سے نئے ماحول میں بڑی ڈھارس اور تقویت تھی۔

☆......☆......☆

ندا ابھی کام میں ٹھیک سے Involve بھی نہ ہوئی تھی کہ شارق اور نعمان منہ لٹکائے واپس آ گئے۔

''ہمیں تو معافی مل گئی۔ مگر تمہاری خیر نہیں۔'' نعمان نے اپنی چیئر پر ڈھیر ہوتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ندا بدحواس ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''نوکری سے نکالنے کا بول رہے ہیں؟'' وہ بری طرح پریشان ہو گئی۔ عمیر بھی متفکر نظروں سے نعمان کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ تو تمہیں وہاں جا کر ہی پتا چلے گا۔'' شارق نے Key Board کھینچ کر سامنے کیا۔

''میں کیوں جاؤں؟'' ندا نے پریشان ہو کر عمیر کی طرف دیکھا جیسے وہ اس کی اس موقع پر بھی بھرپور مدد کرے گا۔ آنکھوں میں ایک آس تھی۔

''بلا رہے ہیں تمہیں۔'' نعمان نے کہا اور Chair گھما کر رُخ پھیر لیا۔

''مم...... مم مجھے بلا رہے ہیں؟'' ندا کے دل کی دھڑکن رُکنے لگی۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفاکی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

ایم اے راحت کے قلم سے تخلیق پانے والا ایک لافانی سلسلہ
ہم شکل
ایک نوجوان کی سرگزشت، جسے بچپن کی ایک بات یاد تھی،
جب اُس کی دادی اماں نے کہا تھا۔
''اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر انسان کے سات ہم شکل بنائے ہیں......''
کیا یہ روایت دُرست ہے؟
اسی روایت کی کھوج میں موت سے پنجہ کش اُس سرکش نوجوان کی
ناقابلِ فراموش داستان......
کیا اُسے ساتوں ہم شکل ملے؟
کیا اُس نے موت سے جنگ کی؟
ایک انوکھی داستان...... جو ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں دھوم مچا رہی ہے
آپ بھی پڑھنا مت بھولیے اور ناول ہم شکل کا حصہ بن جائیے

افسانہ

دردانہ نوشین خان

بارش میں گلابی ٹہنی

کمیل خان پشتو گیت گا رہا تھا۔ اس کے گرد میمونہ، جام عادل، راعبہ عظیم ٹھہری تھیں۔ مرجان بھی وہیں جا رکی۔ وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے گنگنا رہا تھا۔ کم بخت مردانہ وجاہت کی اس میں کوئی کمی نہ تھی۔ شاید سب ہی یہی سوچ رہے تھے۔ پھر سب نے......

قارئین دوشیزہ کے لیے، ایک سوغات افسانے کی صورت

ہاں ہوگی محبت سحر انگیز، پُرکشش، یونہی تو نہیں یہ لاکھوں کہانیوں پر راج کر رہی مگر...... سخت ناپائیدار ہے......نہیں مانا......؟......کہانی پڑھو۔

گہرے بادل اچانک برسنے لگے تھے۔ مرجان نے تقریباً دوڑتے ہوئے بس اسٹاپ کی چھتری تلے پناہ لی۔ وہ موبائل کان سے لگائے غالباً کسی سے لینے آنے کا کہہ رہی تھی۔ سڑک پار پوسٹ گریجویٹ کالج تھا جہاں وہ کلاس لیتی تھی۔ کالج کے گیٹ سے باہر نکلتے ہی کمیل خان کی اس پر نظر پڑی۔ وہ پارکنگ سے گاڑی نکال کر بڑھا تو چھتری کے نیچے ٹھہری اِس دبلی پتلی لمبی لڑکی پر دوسری بار نگاہ پڑی۔ وہ گلابی لباس میں تھی اور ہوا کے زور پر لہرا سی جاتی بے ساختہ عنوان دیا۔ ''بارش کی ٹہنی'' اس بار گلگت کا گورا چٹا کمیل خان چونکا...... ''ارے یہ تو اپنی کلاس والی مرجان ہے......'' گاڑی آہستہ سے بڑھاتے ہوئے وہ اس کے سامنے پل بھر رکا۔ سر کے اشارے سے سلام کا تبادلہ ہوا۔ وہ فلمی سین کی طرح ڈراپ کرنے کی پیشکش کو اچھا نہ سمجھ کر چلا گیا۔

تعارف کا پہلا باقاعدہ آغاز یہ تھا۔

یوں تو سپوکن لینگویج کی پہلے دن کی ڈسکشن میں پُراعتماد مرجان توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ یہاں ہر عمر کے سیکھنے والے تھے۔ سب ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ، شائستہ اور مہذب تھے۔ مرجان کی پہچان پُراعتماد لہجہ، پُرسکون مسکراہٹ اور ہلکے رنگوں کے ملبوسات تھے۔ اس کے علاوہ وہ بھی ایک عام سی لڑکی تھی۔ سیکھنے والوں میں سے کچھ جاب کرتے تھے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ وہ موجودہ یا متوقع ضرورت کے تحت روانی سے انگلش بولنے پر ملکہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کمیل خان کمرشل بینک سے ملٹی نیشنل بینک میں سوئچ ہونے کی وجہ سے انٹرنیشنل زبان پر عبور حاصل کر رہا تھا مگر اس کا لہجہ پختون تھا۔ جسے جو لبادہ اوڑھا دو پہنچانا جاتا ہے۔ مرجان کو اس لمبے پٹھان کا پختون لہجہ میں انگریزی بولنا گدگداتا۔ وہ جہاں بھی بیٹھی ہوتی کہیں چار نشستیں آگے یا پیچھے، اس کے بولنے پر آہستہ سے نقل اتارنے سے باز نہ آتی ویسے بھی اس کے چہرے کی معصومیت اسے اپنی عمر سے کم

دکھاتی تھی۔ اور شرارتیں شوخیاں اس پر جچی تھیں۔ عورت جب اپنی ذات کے میسر لمحوں میں سماج کے بھاری چوغے اتار کر سانس لیتی ہے تو چنچل حسینہ بن جاتی ہے۔ جنت بھی ذات کے لمحات سے مزین کی جائے گی۔

ایک بار کمیل خان پچھلی نشست پر تھا اور مرجان اس کی موجودگی سے بے خبر اپنے ساتھ والی اس کو اس کے لہجے کی نقل کر کے دکھا رہی تھی۔ وہ دونوں ہنس رہی تھیں۔ کمیل خان ہلکا سا کھنکارا تو مرجان نے پلٹ کر دیکھا۔ کمیل خان کی مسکراتی آنکھیں، افوہ وہ سن رہا تھا۔ مرجان شرمندگی سے لال پڑ گئی۔ ......''سوری''، بمشکل پھنسی آواز نکلی۔ اُسی لمحہ کمیل خان کے دل میں چور دریچہ کھلا تھا۔

دوسرے روز مال پلازہ پر وِنڈو شاپنگ کرتی مرجان پر کمیل خان کی نظر پڑی تو وہ بچی دودھ کا ڈبہ چھپانے لگا۔ وہ شیشوں کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔

''لگتا ہے آج بارش ہوگی۔''

''لگتا تو ہے......''

''لاہور میں کافی بارش ہوتی ہے۔''

''جی...... مگر گرمی ہے۔''

چھ فٹ کا کمیل خان اور 5 فٹ 5 انچ کی مرجان کو ساتھ چلتے دیکھ کر آئینے بول اٹھتے تھے۔ جوڑی فٹ ہے۔ یونہی چلتے چلتے ایک دوسرے پر نظر جانا، یونہی بے سبب مسکرا دینا یونہی کچھ کہنے کو لب کھولنا، یونہی کچھ بن کہے ہنس دینا...... شباب تتلیوں جیسا ہے۔ اٹھکیلیاں کرتا کبھی کسی پھول کبھی کسی گل پر جھولتا، خود مگن، خوشیوں کی جھاگ اڑاتے شفاف پانیوں میں ڈبکیاں لگاتا، ''بس میں تو میں ہوں'' کی دھن پر رقص کرتا، مجھے دیکھو مجھے پسند کرو، مگر مجھے مت چھوؤ...... بادلوں میں تیرتی یہ تتلی گھر لوٹتی تو رنگین بدلیاں اڑنچھو ہو جاتیں۔ سچ، حقیقت، عمر، رتبہ، مقام، فرائض، ذمہ داریاں ہاتھ میں تلوار لہراتی

کونوں کھدروں سے نکل آتیں اور دیواریں فاضل جج کی طرح سنجیدگی سے گھورنے لگتیں۔ رات کو جب اپنے پیارے بیٹے کو سلا کر اٹھتی تو مدثر کی پیار لٹاتی نظریں۔ آنکھیں چہرہ کامل اجنبی سا لگتا۔ کبھی کبھی لاشعور سوال کر دیتا۔

''آپ کو کہیں دیکھا ہے۔''

ہاں یہی تو کہا تھا مدثر نے جب یونیورسٹی میں تعارفی کلاس کے بعد وہ گیلری میں ٹھہری تھی...... ''آپ کو کہیں دیکھا ہے۔''

''یہیں دیکھا ہوگا......'' اس نے جان چھڑائی۔ سینئرز کی فولنگ سے خائف تھی ابھی اپنی کلاس کی پہچان بھی پوری کب ہوئی تھی۔ مدثر کچھ دیر سوچتا ہوا ہونٹوں پر بال پوائنٹ بجاتا رہا۔ پھر یکدم چلایا (اداکاری سے)۔

''You are my class fellow''

وہ ہنس پڑی۔ پھر اس نے کہا۔ ''تعارف کے دوران آپ کے نام نے چونکا دیا۔ کیا مطلب ہے مرجان کا؟......'' اس نے سوچا والدین کو چونکانے والے نام نہیں رکھنے چاہئے اس سے بندہ بھولتا نہیں۔ جب آگے چل کر اس نے مدثر کو یہ بات بتائی تو مدثر نے کہا تھا ''جسے نہ بھولنا ہو وہ رشیدہ، حمیدہ کو بھی نہیں بھولتا...... جسے بھولنا ہو وہ کامل آرائش، تزئین کو بھی بھول جاتا ہے......اور وہ دونوں دیر تک ہنستے رہے۔

یہی کوئی آٹھ دس سال پہلے کی بات ہے۔ آٹھ دس سال میں جیسے ایک زمانہ گزر گیا۔ 32 سالہ مرجان کا اب مدثر شوہر تھا۔ اور ان کا پانچ سالہ بیٹا تھا۔

صبح ہوئی۔ دفتر کے لیے تیار ہوتا مدثر بار بار مرجان کو آوازیں دیتا ہوا تیار ہوتا۔

''جان...... ٹائی کون سی ہو۔''

''جان...... پلیز! ناشتا جلدی لگا دو۔''

''جان...... چابی دینا...... ارے ہاں میرا بریف کیس۔''

بیڈروم میں ایک پھیلاوا چھوڑ کر وہ مرجان کو ہوائی بوسہ دیتا گاڑی میں بیٹھتا اور گاڑی نکال کر چلا جاتا۔ مرجان خوشگوار مسکراہٹ لیے پلٹتی۔ ابھی وہ کمر سیدھی کر رہی ہوتی کہ ''گڈ مارننگ باجی'' کہتی میڈ (ملازمہ) آ جاتی۔ کپڑوں پر گاؤن پہنتی اور کام میں لگ جاتی۔ مرجان فریش ہو کر بیٹے کو اسکول کے لیے تیار کرتی شرارتی بچے کے ساتھ بھی خاصی بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے۔ پھر وہ بیٹے کو جدید ترین اسکول چھوڑنے جاتی۔ اسکول اس اجلی سرسبز کالونی کے اندر پیدل فاصلے پر تھا۔ پھولوں پودوں، رنگ چڑیوں، طوطوں کے رنگ دار پنجروں اور پرندوں کی چہکار والے اسکول میں بچے خوش ہو جاتے۔ مرجان کا بیٹا بھی اس کی انگلی چھڑا کر اچھلتا کودتا، رنگین غباروں میں مدغم ہو جاتا۔ وہ گھر پہنچ کر آج کے لنچ کا مینیو بتا کر تیاری شروع کر دیتی۔ میڈ ہی سبزی لاتی تھی اور سالن بناتی تھی۔

پھر مرجان کوئی ہلکے رنگ کا سوٹ نکالتی۔ ہلکے سے رنگ کا سوٹ جو ہینگر میں بے جان لٹکا ہوتا تھا۔ اس پر آ کر جی اٹھتا، سیدھے بالوں میں برش کر کے کسی ہم رنگ کیچر میں باندھتی، لائٹ سا لپ گلوز اور کالی کاجل بھری آنکھیں۔ اب اسے تین گھنٹے کے لیے طالب علم بننا ہوتا تھا۔ پوسٹ گریجویٹ کالج ڈارک براؤن گیٹ کے ساتھ سفید گملوں کی سبز بہار کے آس پاس تعلیم بالغان سی کلاس بکھری ہوتی۔ کمپری ہینسو ہال کے خالی ہونے کی انتظار میں ٹکڑیوں میں بٹے، گپ شپ کرتے یہ انگریزی دان ماں بولیوں میں بولنے میں مصروف ہوتے۔ مرجان سب سے دعا سلام کرتی جاتی۔ کمیل خان اپنے قد سے نمایاں فوراً ہی دِکھ جاتا تھا یا نظریں تلاش کر لیتی تھیں......اور وہ جو پھیکی، کاسنی، پیازی رنگ میں ملبوس میں غیر نمایاں ہوتی پر کمیل خان کے لیے تاروں میں چاند کی طرح نمایاں ہو جاتی...... اس دھیمی خوشبودار بے قراری میں دانستگی

کا ہاتھ کم تھا۔ مگر بس ایک کشش تھی جو اندھے کیوپڈ نے بیچ میں لا رکھی تھی۔ آنکھ کا اندھا اور اتنا بڑا صاحب اختیار...... خدا کی مار ہو کیوپڈ پر۔

کمیل خان پشتو گیت گا رہا تھا۔ اس کے گرد میمونہ، جام عادل، راعبہ عظیم ٹھہری تھیں۔ مرجان بھی وہیں جا رکی۔ وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے گنگنا رہا تھا۔ کم بخت مردانہ وجاہت کی اس میں کوئی کمی نہ تھی۔ شاید سب ہی یہی سوچ رہے تھے۔ پھر سب نے ساتھ ساتھ تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ دائرہ اور بھی پُر ہجوم ہو گیا۔ گیت ختم ہوا...... تعریفی بول سنائی دینے لگے۔''

''مزے کا گیت ہے۔''

''شوخ سی دھن ہے۔''

''نہیں یہ Gloomy mood کا گیت ہے۔''

''ارے؟...... جی؟'' سب کو حیرت ہوئی۔

''جی اس کی Perecis یہ ہے کہ محبوب جھیل کنارے تنہا ہے۔ وہ چنار کے پار چاند کو دیکھتا ہے اسے اپنی چاند جیسی خوبصورت محبوبہ یاد آتی ہے۔ وہ اکیلا ہے اور چنار کے نیچے آنسو بہا رہا ہے۔''

''اووہو......'' ہمدردی بھرے ہنکارے ابھرے......

''پھر؟'' یہ احمقانہ سوال جانے کس نے کیا۔

''پھر...... کیا؟ یہ غم ہجر اس کا نصیب ہے......''

کمیل خان کی نظریں مرجان پر رکی وہ یونہی مسکرائی...... نظریں پلٹ کر پھر رکی ایسی الجھی نظر ان سے ہٹتی نہیں۔''

مرجان مسکرانا بھول گئی۔ اس کے حواس پر ناقابل برداشت دباؤ پڑا۔ دل دھڑک اٹھا۔ وہ انگلی سے رخسار کھجاتی، ہونٹ بھینچی، شانے پر لٹکتا پرس جھلاتی وہاں سے ایک دم ہٹ گئی۔ اوجھل ہو گئی...... وہ دن مرجان کا ذہنی اذیت میں گزرا، کسی سے کہنے کی بات تھی بھلا۔ پھر سوچا بس چند ہفتوں تک ختم ہو جائے گا یہ کورس...... مگر چند ہفتے 36 گھنٹے رکھتے تھے۔

کمیل خان اپنے گھر جاتا تو اس کی چار اور اڑھائی سالہ بچیاں ریشما، چشمہ ننھے دانتوں سے ہنستی گرتی پڑتی بابا کی جانب دوڑی آتیں۔ شادی کے چھ سال بعد ریشما ایک قیمتی تحفے کی طرح ملی اور اس کے بعد چشمہ...... اس کی نیلی آنکھوں والی بیوی روشنائے گل اس کی سیوا میں لگ جاتی۔ وہ پختون بولتے، روشنائے ماموں زاد ہی تو تھی۔ کبھی دیوار پار ماموں کا گھر ہوا کرتا تھا۔ جب کمیل خان کالج میں پڑھتا تھا وہ کالج جانے کے لیے گھر سے نکلتا تو موٹر بائیک کا دوبار ہارن بجاتا۔ یہ اشارہ روشنائے خوب سمجھتی تھی۔ وہ دوڑ کر اپنے گھر کی چھت پر آ جاتی اس کا قد لمبا نہیں تھا۔ اس نے چھت کے کونے مین اینٹوں کی چوکی بنا رکھی تھی۔ لمبے سنہرے بالوں کی دو چوٹیاں، گوری رنگت اور نیلی آنکھیں...... کمیل خان کہتا تھا تم پر شاعری کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پھر ان کا ملن ہو گیا۔ وہ خود کو دنیا کے خوش نصیب ترین بندے کہتے تھے...... مگر...... اب یہ یادیں زدوکوب کرتی تھیں خود کو سمجھانے کے حیلے ہارتے چلے جاتے۔ وہ خود کو باور کراتا کہ اس نے مرجان کو واضح طور پر کچھ کہا نہیں...... پر خود بخود اس کو دیکھتے ہی دل دھڑک جاتا۔ آنکھوں کے تارے چمک جاتے وہ ایک دوسرے کو نوٹ رکھتے آج کیا پہنا ہے...... وہاں بیٹھی تھی یہاں کیوں آئی...... دیر سے کیوں آئے...... جلدی کیوں گئے...... مرجان نے یونہی گروپ میں بیٹھے ایک بار کہہ دیا کہ بلیو شیڈ جینٹس کو جچتے ہیں۔ وہ تن من نیلو نیل ہو گیا...... نیلی شرٹس کبھی آسمان سی، کبھی سمندری سی اور کبھی مرجان کی کلائی میں پڑی کانچ کی دو چوڑیاں سی گہری نیلی...... مرجان نے جگمگاتی

لو دیتی آنکھوں سے پوچھا۔

''گلگت کیسا ہے؟''

''سچا...... کھرا...... اندر بسا لینے والا...... جان لٹا دینے والا۔''

''I mean gilgit'' وہ ہڑبڑا گئی۔

''Yes I mean it'' وہ مسکرایا پھر بات بدل دی۔

''آپ آیئے آپ دیکھیے آپ نے اتنا سبزہ کہیں نہیں دیکھا ہوگا۔''

''بس یونہی چھوٹی چھوٹی باتیں...... کبھی کسی نے کسی سے نہ پوچھا...... تمہارا گھر، خاندان، فیملی بیک گراؤنڈ دونوں کے دل کا چور کنی کترا جاتا۔ بچ نکلتا مگر کوئی ربط تھا کہ باہمی جڑا جاتا تھا۔

اب کلاس کا آخری دن تھا۔ کلاس نے ایک انوکھے ٹرپ کا فیصلہ کیا اوپن گاڑیوں میں لاہور کی سرسبز سڑکوں کی ڈرائیو...... کنال ویو تو سرفہرست تھا، وہ رات جگمگاتی جاگتی رو پہلی رات...... ہلہ گلہ...... ٹپے ماہیے...... وہ سب اپنا دور طالب علمی تازہ کر رہے تھے۔ سب ہی خوش تھے مگر...... کمیل خان نے مرجان کے قریب جگہ بناتے ہوئے سرگوشی کی۔

''میرا دل بہت اداس ہے۔''

مرجان تو خود اتنی مغموم تھی کہ سر ہلا کر رہ گئی۔

''کاش یہ رات بھی کبھی ختم نہ ہو......'' وہ تو کھلم کھلا بولنے لگا تھا۔ پھر اس نے موبائل پر کچھ لکھا۔ مرجان نے میسج ٹون پر اپنا موبائل دیکھا۔

''میں نے بہت دیر کر دی مرجان...... آئی لو یو مرجان۔''

''مرجان سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ اس کی حالت یوں ہو گئی جیسے چھپ سکنے کی جگہ نہ رہی ہو۔ وہ کسی اوٹ میں تھی جو نہ رہی اور اب بالکل سامنے ہے۔ حالانکہ اسے اچنبھا نہیں ہونا چاہیے۔

دبی چنگاری نے بھڑکنا تھا۔ جب پلکیں اٹھیں تو وہ اسے ہی تک رہا تھا۔ اتنے میں مرجان کے فون پر کال آنے لگی۔ اس نے فون سن کر بند کیا تو کمیل خان نے پوچھا۔

''کس کا فون تھا؟''

گویا اس نے یہ پوچھنے کا استحقاق بھی لے لیا تھا۔ رستہ تو مرجان نے دیا تھا جبکہ اب آگے کوئی رستہ نہیں تھا بند گلی میں پہنچ چکے تھے۔ مرجان نے رکتے رکتے کہا ''میرے...... شوہر...... کا۔''

کمیل خان کا چہرہ ایکدم زرد پڑ گیا۔ سانس لینا دوبھر ہونے لگا وہ سمجھنے نہ سمجھنے کے بیچ معلق رہا۔ آس پاس کے منظر کا جیسے وجود تک نہ رہا تھا۔ ہلہ گلہ سیاسی لطیفے سارا شور شرابہ کہیں دور چلا گیا تھا۔ وہ دونوں شیشے کے پنجرے میں بند آمنے سامنے تھے۔ بس دکھائی دیتے تھے۔ سنائی نہیں دیتے تھے۔ پھر وہ دونوں بھی منظر سے غائب ہو گئے...... نصف شب مرجان نے چپکے سے اپنا موبائل چیک کیا۔

''یہ سچ نہیں ہے ناں......''

درد بھری ساجت...... جیسے وہ ایکدم اس کے ہاتھوں کو تھام کر ہنسے گی اور کہے گی ہاں یہ سچ نہیں تھا...... مرجان نے سوچا، سوچا اور سوچا مگر کچھ بھی نہ کر پائی۔ پہلو میں بچہ سوتا تھا اور اس کا محبوب شوہر سوتا تھا...... مگر موبائل تکیے کے نیچے زندہ سانسیں لیتا محسوس ہوتا تھا۔ کمیل خان کے پاس حق تجاوز ہی سہی، مرجان پابند ضوابط ہی سہی، مگر سوال یہ تو ہے ہی نہیں...... سوال تو یہ ہے کہ محبت آتی کہاں سے ہے؟ پھر یہ جاتی کہاں ہے؟...... یہ سحر انگیز تو ہے...... مگر اس کا سحر ٹوٹنا بھی ایک سحر ہے......

آپ متفق ہیں؟

☆☆......☆☆......☆☆

افسانہ

تحسین عابدی

تمنا

"کتنی بار تم سے کہا ہے، عامر کے سامنے مت آیا کرو۔" انہوں نے اس کے رخسار پر مچلتے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلی سے پونچھا۔ "ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے آپا؟" وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔ "ہم کچھ دنوں کے لیے تم کو تمہارے میکے......

سرحد پار سے ایک تحفۂ خاص، افسانے کی صورت

چائے گرم اور سموسے گرم، کی صداؤں سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کوئی اسٹیشن آ گیا تھا۔ اور مسافروں کی بھیڑ ایک بار پھر بے ہنگم شور وغل کے ساتھ ٹرین پر سوار ہو رہی تھی۔

سامنے کی سیٹ پر بیٹھا نوجوان اپنا سامان سمیٹ کر اترنے کو تیار کھڑا تھا۔

''کیا سیٹ خالی ہے؟'' جل ترنگ سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ایک نقاب پوش نازنین اس نوجوان سے مخاطب تھی۔ آنکھوں کو چھوڑ کر تمام چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

''جی ہاں!'' وہ نوجوان اپنا بیگ لے کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ چوڑیوں کی کھنکھناہٹ کے درمیان وہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ مدھم مدھم خوشبوؤں کا جھونکا اُس کی روح کو مسرور کرنے لگا۔ اس نے ایک سرسری نگاہ اس نازک اندام نقاب پوش پر ڈالی تو ہٹانا ہی بھول گیا۔

'کیسی سحر آلود آنکھیں تھیں۔' آنکھوں سے منسوب چند اشعار اس کے لب تک آ کر لوٹ گئے۔ ایسی حسین آنکھوں کا ذکر تو اب تک شاعری میں ہی سنا تھا۔ یہ آنکھیں تھیں یا بادہ و مینا چھلکاتی کسی شاعر کی غزل یا پھر کسی مصور کا تصور۔

سامنے والے کی نظروں کا سامنا ہوتے ہی اس نے گھبرا کر نظریں ہٹا لیں۔ مگر دل کو کون سمجھائے۔ بظاہر وہ اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ مگر دل وہیں اٹک کر رہ گیا۔ شاید ان مقناطیس آنکھوں میں مقید ہو گیا تھا۔ بہت سمجھایا لیکن نہ مانا تو ایک بار پھر آنکھوں کی گہرائیوں میں غوطے لگانے لگا۔ گھنی گھنی سیاہ دراز پلکوں کے سائے میں بادہ و ساغر نوازتی آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی لکیریں براہِ راست دل پر وار کر رہی تھیں۔ ایک بار پھر اس نقاب پوش نے سیاہ دراز پلکوں کو اٹھا کر اس نیم بسمل عاشق کی طرف دیکھا لیکن وہ اسی طرح بے حس و حرکت بدستور ان مخمور آنکھوں میں کھویا رہا۔

''آپ کو کچھ کہنا ہے؟'' شہد سے لبریز آواز مگر لہجے میں ناگواری لیے، وہ اس سے گویا ہوئی۔

''سفر لمبا ہو تو تنہا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہم بات چیت کرتے ہوئے اس سفر کو آسان بنا دیں۔'' دل کی بات زبان پر اتر آئی۔

''مجھے اعتراض نہیں۔''

''پھر یہ حجاب کیسا؟'' چہرے پر پڑے نقاب کی طرف اس نے اشارہ کیا۔

''گفتگو کا حجاب سے کیا تعلق؟'' اس بار لہجے میں ناگواری نہ تھی۔ اس کا حوصلہ بڑھا۔

''برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔''

''کہیے۔''

''اس حسن بیکراں کے دیدار کا مشتاق ہوں۔''

لمحہ بھر کی ملاقات نے اس پر کیسا جادو کیا تھا کہ وہ بھول گیا اس طرح کے گستاخ جملے ادا کرنا مناسب ہے یا نہیں۔

''آپ کو یہ غلط فہمی کیسے ہوئی۔'' چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔

''میری رنگت سانولی ہے جسے لوگ پسند نہیں کرتے۔''

''ان آنکھوں میں وہ رنگ موجود ہے جس کے سامنے تمام رنگ بے معنی ہیں۔'' وہ بے خود ہو کر بولا۔ ''آپ کی آواز میں وہ سحر ہے جسے ایک بار سننے کے بعد بار بار سننے کو جی چاہے۔''

اس قدر بے تکلف وہ کیسے ہو گیا تھا کہ اجنبی کی ناراضگی کا احساس بھی بھلا بیٹھا تھا۔ کیا واقعی یہ انجان لڑکی مکمل طور پر اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو گئی تھی۔ یہ جنون، یہ بے قراری کیسی تھی کہ دل اس کی طرف کھینچا چلا جا رہا تھا۔

'کہیں یہ سفر ختم نہ ہو جائے۔' ایک خوفناک خیال۔ دل ہولے سے دھڑک اٹھا۔ ختم تو ہونا ہی ہے۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے لڑکی پر ایک

سہمی سہمی سی نگاہ ڈالی۔ سفر ختم ہو جائے گا۔ یہ چلی جائے گی دور۔ مجھ سے دور۔ میں بھی اپنی منزل پر پہنچ کر اسے کھو دوں گا۔ ایک کسک رہ جائے گی۔ اس کا تصور رہ جائے گا، جو راتوں کے سناٹوں میں چیخ چیخ کر مجھے جھنجھوڑے گا۔ اُف...... کیسا کرب ہوگا۔ کیا اس کو بھول پاؤں گا کبھی۔ نہیں...... تم میری ہو میرا دل کہتا ہے تم میری ہو۔ تمہاری آنکھوں نے مجھے اپنا اسیر بنا لیا ہے۔ تمہاری آواز کے جھنکار نے میرے قدم جکڑ لیے ہیں۔ چاہ کر بھی تم سے دور نہیں جا سکتا۔ ایک بار...... بس ایک بار مجھے اپنے متعلق سب کچھ بتا دو۔ میں تمہیں لینے آؤں گا۔ اپنی دلہن بنا کر سدا کے لیے دل میں چھپا لوں گا۔ اس کی سوچ کی رفتار ٹرین کی رفتار سے کم نہ تھی۔ ایک نگاہِ حسرت ان قاتل آنکھوں پر ڈالی جہاں نمی کے جگنو جگمگا رہے تھے۔

''آپ رو رہی ہیں؟'' معلوم نہیں کس حق نے اس کو یہ سوال پوچھنے کا حوصلہ دیا تھا۔

''نہیں تو...... آنکھوں میں کچھ چبھ رہا ہے۔'' بات ٹالنے کا انداز اچھا تھا۔

''وہ میں تو نہیں۔'' وہ اچانک ہی مذاق کے موڈ میں آ گیا تھا۔ یا پھر ماحول کی سنجیدگی دور کرنے کی غرض سے بولا تھا۔ مگر یہ اتنی دل برداشتہ کیوں ہو رہی ہے؟ اس نے سوچا۔

''آپ مجھے اپنا پتا اور موبائل نمبر دیں گی؟ تاکہ ملاقات کا یہ سلسلہ قائم رہ سکے۔''

''کسی اجنبی کو اپنا پتا اور موبائل نمبر نہیں دیتی۔''

''اسی پتے اور موبائل نمبر کی بدولت یہ اجنبی اپنا بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔ اس کی بے تکلفی اور بے باکی نے اسے حیران کر دیا۔

''میں نہ اپنانا چاہوں تو؟''

''تو گریباں چاک کر کے آپ کے شہر کی گلیوں کے چکر تو لگا سکتا ہوں۔'' وہ پھر ہنسا مگر دوسری طرف آنسوؤں کا مینہ برسنے کو تیار ہو چکا تھا۔

''آپ پھر رو رہی ہیں۔'' وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔

''خدارا کچھ تو بتائیے اپنے بارے میں۔ یہ بار بار آپ کی آنکھیں ان قیمتی موتیوں کو ضائع کرنے پر کیوں آمادہ ہو جاتی ہیں؟'' وہ پریشان تھا مگر دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔

''آپ نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔''

''آپ نے پوچھا ہی نہیں۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

''اب پوچھ رہا ہوں۔''

''تمنا!'' نہایت سپاٹ لہجہ تھا۔ ایک بجلی سی کوندی۔ ذہن میں گرج کڑک کے ساتھ ایک تصویر ابھر آئی۔ ظلم کی کہانیاں یاد آئیں تو ماضی کے دریچے کھلتے چلے گئے۔

☆......☆......☆

''ہزار بار کہا ہے اپنی کالی کلوٹی صورت لے کر میرے سامنے مت آیا کرو۔'' یہ اس کا جملہ تھا جو اکثر و بیشتر تمنا کے کانوں میں پگھلے سیسے کی مانند اترنے لگا تھا۔ اور جواب میں وہ آنکھوں میں آنسو کا سیلاب لیے کسی دوسرے کمرے میں روپوش ہو جاتی۔

یہ ذلت یہ نفرت شادی کے پہلے دن کی اس کی جھولی میں آنی شروع ہو گئی تھی، اور روز بروز اس میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

وہ عامر کی والدہ کی پسند تھی جو بڑے ارمان سے اس کو اس گھر کی بہو بنا کر لائی تھیں۔ لیکن روز اول سے ہی وہ اپنی سانولی رنگت کی وجہ سے عامر کو ناپسند تھی۔ کبھی نظر بھر کر وہ اسے دیکھتا تک نا تھا۔ اس سے باتیں کرنا تو دور اگر اس سے سامنا

ہو جاتا تو وہ اپنا راستہ بدل لیتا۔ رفتہ رفتہ یہ بے رخی اور ناپسندیدگی نفرت میں تبدیل ہوگئی۔ ایک نئی نویلی دلہن جو آنکھوں میں کتنے ہی سنہرے خواب سجائے شوہر کی چوکھٹ پر آئی تھی پل بھر میں وہ خواب ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے تھے۔ آنسوؤں کو اپنا مقدر سمجھ لیا تھا۔ شب و روز کے طعنے اس نے کرب کے سانچے میں ڈھال لیے تھے۔ لیکن قہر تو تب ٹوٹا تھا اس پر جب عامر نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

''اب یا تو میں رہوں گا اس گھر میں یا یہ لڑکی۔ اس کی موجودگی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ مجھے نفرت ہے اس کی صورت سے۔'' اس نے حقارت سے اس کی سمت اشارہ کیا جو ایک گوشے میں کھڑی سوکھے پتے کی مانند کانپ رہی تھی۔ نند صاحبہ نے اسے بازو سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئیں۔

''کتنی بار تم سے کہا ہے۔ عامر کے سامنے مت آیا کرو۔'' انہوں نے اس کے رخسار پر مچلتے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلی سے پونچھا۔

''ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے آپا؟'' وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔

''ہم کچھ دنوں کے لیے تم کو تمہارے میکے بھیج دیں گے۔ پھر عامر کو سمجھانے کی پوری کوشش کریں گے۔ آخر تم میری اور اماں کی پسند ہو۔ بس ذرا اس کے ذہن سے بھی گوری رنگت کا جنون اترنے دو۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

آپا کی تسلی کام نہیں آئی۔ تمام لوگوں کی مخالفت کے باوجود عامر نے تمنا کو طلاق دے دی۔

☆......☆......☆

ٹرین ایک جھٹکا دیتی اچانک کسی اسٹیشن پر رکی تو وہ جیسے سوتے سے جاگا۔ نیلی آنکھوں والی لڑکی سنبھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ جا رہی ہیں؟'' وہ گھبرایا۔

''میری منزل آگئی۔ لیکن جانے سے پہلے میرا چہرہ دیکھنے کی آپ کی خواہش بھی پوری کرتی جاؤں گی۔'' اس نے آہستہ سے نقاب سرکایا۔

''تمنا؟'' ایک ٹیس سی اٹھی۔ عامر سکتے کے عالم میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

میری آنکھوں سے آپ نے مجھے نہیں پہچانا کیوں کہ کبھی نظر بھر کر مجھے نہ دیکھا تھا۔'' وہ نہایت اطمینان سے مسکرائی۔ میری آواز سے بھی نہیں پہچانا کیوں کہ مجھ سے بات کرنے میں بھی آپ توہین سمجھتے تھے۔'' وہ طنزیہ ہنسی۔

''زندگی کی راہیں ناہموار ضرور تھیں مگر منزل نہایت خوشگوار اور پُرسکون۔ چلتی ہوں۔ نیچے پلیٹ فارم پر میرے شوہر میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اللہ حافظ۔'' ایک چھوٹی سی اٹیچی اٹھا کر وہ آگے بڑھ گئی اور وہ خالی خالی آنکھوں سے اس حسین خواب کے اختتام کو دیکھتا رہا۔ دل چاہتا تھا کہ اسے روک لے۔ بڑھ کر مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لے اور کہے اس طرح ٹھہرے ہوئے خاموش و ساکت پانی میں کنکر پھینک کر مت جاؤ۔

ٹرین ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ خوشبوؤں کا احساس اب بھی اس کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دو خمار آلود آنکھیں اس پر ہنس رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ سامنے کی سیٹ خالی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے ارد گرد دیکھا۔ ہر طرف سناٹا، ہواؤں کی سرسراہٹ کھڑکیوں سے داخل ہو کر ایک عجیب سا شور پیدا کر رہی تھی۔

☆☆......☆☆

''یار ہر روز کسی نا کسی لڑکی کی منگنی ہو جاتی ہے۔ ایک ہمارا ہی گروپ ماٹھا ہے۔ اچھا چلو یہ بتاؤ کسی کے ینگ یا کنوارے کزنز ہیں جن کے ساتھ رشتہ ہو سکتا ہے۔ ہم خود ہی جوڑ ملاتے ہیں۔'' نمرہ بڑے جوش سے بولی۔ پھر آہستہ آہستہ سب کو یہ کھیل......

اِک ذرا سے مذاق سے زندگی اپنا رخ بھی بدل لیتی ہے مگر......

''امی جی آپ نے مجھے بلایا تھا۔'' سحر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''آؤ بیٹھو!'' ماں کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی۔

''امی خیر تو ہے۔ سب ٹھیک ہے ناں؟''

''یہ کیا ہے؟'' امی نے اس کے سامنے ایک کتاب رکھی۔ کھلے صفحے پر نظر پڑتے ہی اس کا رنگ اڑ گیا۔ پاؤں تلے سے زمین نکلنا کیا ہوتا ہے اسے آج سمجھ آیا تھا۔

''امی جی......'' وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے گویا ہوئی۔ ''یہ تو مذاق......'' ماں کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلے۔

''پلیز امی!'' وہ ماں کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ ''مذاق تھا یہ...... میری سہیلیاں مذاق مذاق میں ایسے نام لکھ رہی تھیں۔ ورنہ کوئی بات نہیں ہے۔''

''انہیں یہ نام کس نے بتایا۔'' ماں کی آواز سرد تھی۔ سحر کے پورے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اب اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا تھا۔

میٹرک کرنے کے بعد جب سحر نے کالج میں داخلہ لیا تو اسے ساری دنیا بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔

اس کی تین اسکول کی سہیلیاں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ یوں اجنبیت کا احساس تو کچھ کم تھا مگر ہر چیز انوکھی سی لگتی تھی۔

اسکول کے محدود ماحول سے کالج کے کھلے ماحول میں آنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا چند ہی دنوں میں وہ باقی لڑکیوں سے بھی گھل مل گئی۔

سحر کے گھر کا ماحول روایتی سا تھا۔ جہاں مرد کو ہمیشہ فوقیت دی جاتی تھی۔ اس کے والد تو میٹرک کے بعد لڑکیوں کو آگے پڑھانے کے حق میں نہیں تھے۔ سحر نے بہت اچھے نمبرز لیے تھے۔ اس کے دادی کی سفارش پر اسے لڑکیوں کے کالج میں داخلے کی اجازت ملی تھی۔

☆......☆......☆

کالج کی لڑکیاں اسکول کی لڑکیوں سے مختلف تھیں۔ ایک فرق ضرور تھا جو بہت نمایاں نہیں تھا مگر محسوس ہوتا تھا۔ سفید یونیفارم کے ساتھ گلابی دوپٹہ۔ نہ محسوس ہونے والا قدرتی انداز کا میک اپ اور آنکھوں کا گہرا کاجل دیکھنے والوں کو گھما دیتا تھا۔

سحر اور اس کی سہیلیاں ایک ہی ماحول سے آئی تھیں۔ اس لیے ابھی ان پر نیا رنگ نہیں چڑھا تھا۔ کچھ گھر کا ماحول اور دادی کی نصیحتیں اسے ہر وقت یاد رہتی تھیں۔ اب پرانی سہیلیوں کے علاوہ دو لڑکیاں اور بھی اس کی دوست بن گئی تھیں۔ اور ان کا چھ لڑکیوں کا گروپ بن گیا تھا۔

کلاسز شروع ہو چکی تھیں۔ ایک دن ٹیچر چھٹی پر تھیں۔ ساری کلاس فارغ بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ وہ بھی ذرا الگ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ ایک لڑکی جس کا نام نمرہ تھا اور وہ کافی بولڈ سی تھی۔ اچانک ان سے مخاطب ہوئی۔

''اچھا یہ بتاؤ تم لوگوں میں سے کسی کی منگنی ہوئی ہے یا بات وغیرہ چل رہی ہے۔'' سب نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یار ہر روز کسی نا کسی لڑکی کی منگنی ہو جاتی ہے۔ ایک ہمارا ہی گروپ ماٹھا ہے۔ اچھا چلو یہ بتاؤ کسی کے ینگ یا کنوارے کزنز ہیں جن کے ساتھ رشتہ ہو سکتا ہے۔ ہم خود ہی جوڑ ملاتے ہیں۔'' نمرہ بڑے جوش سے بولی۔ پھر آہستہ آہستہ سب کو یہ کھیل دلچسپ لگنے لگا۔ نمرہ نے کاپی پر سب کے نام لکھے ہر لڑکی کے نام کے ساتھ اس سے پوچھ کر اس کے کزنز کا نام لکھا جو نام اسے سب سے زیادہ اچھا لگتا اس کے ساتھ مسز لگا کر الگ لکھا جاتا۔

سحر کے سارے کزنز شادی شدہ تھے۔ سوائے ایک پھوپو کے بیٹے کے جن کے ساتھ کم ہی میل جول تھا۔ وجہ نند بھابی کا روایتی جھگڑا تھا۔ سو سحر کے گھر والے کم ہی ان کے گھر جاتے تھے۔ سوائے دادی کے۔

''بھئی میرا کوئی کنوارہ کزن نہیں ہے۔'' سحر نے کہا لہٰذا میرا نام کاٹ دو۔''

''یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی دور پار کا کزن نکالو اور فوراً نام بتاؤ۔'' ان سب کے اصرار پر مجبوراً سحر نے پھوپو کے بیٹے افتخار کا نام بتا دیا۔

نمرہ نے جب اس کا نام 'مسز سحر افتخار' لکھا سب کو ایک دم پرفیکٹ لگا۔ ناموں کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ سب ایک دوسرے کو مسز کے نام سے پکارتیں مگر یہ احتیاط کی جاتی تھی کہ کسی کا نام کسی کے سامنے نہ لیا جائے۔ اور نہ ہی کسی کتاب یا کاپی پر لکھا جائے۔ آہستہ آہستہ ان کی یہ عادت پکی ہوتی چلی گئی۔ اب وہ سیکنڈ ایئر میں تھیں۔

☆......☆......☆

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

عید کی چھٹیاں تھیں۔ پھوپو کی فیملی ایک عرصے بعد ان کے گھر آئی ہوئی تھی۔ دادی کو اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی۔

پھوپو کی بڑی بیٹی رابعہ اس کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ ارد گرد سحر کی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ اتنے میں نمرہ کا فون آ گیا۔ سحر اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو رابعہ اس کی کتابیں دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کتاب رکھ دی۔

اور پھر اسی شام پھوپو کی فیملی کے چلے جانے کے بعد اسے کمرے میں بلایا اور اس کی کتاب اس کے سامنے رکھ دی جس پر لکھا ہوا تھا نام 'سحر افتخار' صاف نظر آ رہا تھا۔ پتا نہیں کس سہیلی نے بے دھیانی میں لکھ ڈالا تھا۔ ماں کے سامنے وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔

''امی جی! میرا یقین کریں یہ صرف مذاق ہے۔

''رابعہ نے یہ کتاب اپنی ماں کو دکھا دی۔'' ماں کے اس انکشاف پر اس کے ہوش اُڑ گئے۔

''اگر رابعہ کو پتا چل گیا تو......؟ خوف کے مارے اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

☆......☆......☆

اس کا خوف سچ ثابت ہوا۔

پھوپو نے ساری بات بھائی کو مرچ مسالا لگا کر سنا دی۔ اسے کالج چھوڑنے کا حکم مل گیا۔ اور پھر دو دن بعد ہی پھوپو اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر سحر کا ہاتھ مانگنے چلی آئیں۔ وہ بہت روئی پیٹی۔ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ ماں نے اس کا انکار اس کے باپ تک پہنچایا تو ابو نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔

''کیا خرابی ہے اس رشتے میں۔ پڑھا لکھا ہے۔ اپنا جنرل اسٹور چلا رہا ہے اور کیا چاہیے تمہیں۔''

''ابو جی!'' وہ باپ کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''پھوپو کے گھر نہیں...... اس کے علاوہ آپ جہاں چاہیں میرا رشتہ کر دیں۔''

''تو پھر......؟'' باپ کی زبان سے الفاظ نہیں نکل سکے حجاب آڑے آ گیا۔

''اگر آپ کو اپنی بیٹی پر ذرا سا بھی اعتماد ہے تو یقین کریں وہ محض مذاق تھا۔ میری دوستوں نے شرارت سے لکھ دیا تھا۔'' باپ چند لمحے بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھتے رہے۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔ وہاں تمہارا رشتہ نہیں ہوگا۔'' سحر کی آنکھیں خوشی سے چھلک گئیں۔

''اور ابو جی کالج......'' وہ جاتے جاتے پلٹی۔

''نہیں! جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ گھر پر ماں کا ہاتھ بٹایا کرو۔ لہجہ اتنا فیصلہ کن تھا کہ وہ آگے ایک لفظ نہ بول سکی۔

☆......☆......☆

''لڑکیوں کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ ذرا سی بھول ناقابل تلافی نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔'' امی اسے سمجھا رہی تھیں۔

''شکر کرو اس رشتے سے جان چھوٹ گئی۔ ورنہ اس عورت نے ساری زندگی میرا جینا دوبھر کیے رکھا ہے۔ ساس بن کر تمہارا نہ جانے کیا حشر کرتی اور میں باقی عمر بھی اذیت میں گزار دیتی۔ باقی رہی پڑھائی کی تو اپنی غلطی کا خمیازہ تو تمہیں بھگتنا ہی پڑے گا۔ ہاں اتنی اجازت دے دی تمہارے ابو نے کہ جب تک کسی اچھی جگہ رشتہ نہیں ہو جاتا پرائیویٹ طور پر انٹر کر لو۔''

ماں کی بات سن کر وہ سر جھکائے بیٹھی رہ گئی کہ اک ذرا سا مذاق اس کے سارے خواب توڑ گیا تھا۔

☆☆......☆☆

مکمل ناول

اُمِ مریم

رحمٰن، رحیم، سدا سائیں

''میں نے ابھی تک اس کا نام نہیں رکھا۔ بی کوز اس کے باپ کو اس سے غرض نہیں۔ مجھے بھی ضد ہوگئی ہے۔ جب تک وہ اسے ایکسیپٹ نہیں کرتا۔ تب تک میں اسے ہرگز کوئی نام نہیں دوں گی۔'' لیزا کا لہجہ، اس کا انداز شوریدہ سر لہر جیسا تھا۔ تند خیز...... غصیلا علیزے نے چونک کر ٹھٹھک کر اسے دیکھا اور......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا چودھواں حصہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بیک وقت حال و ماضی کے دریچوں سے جھانکنے والی یہ کہانی دیا سے شروع ہوتی ہے۔ جسے مرتد ہونے کا پچھتاوا، ملال، رنج، دکھ اور کرب کا احساس دل و دماغ کو شل کرتا محسوس ہوتا ہے۔ جو رب کو ناراض کر کے وحشتوں میں مبتلا ہے۔ گندگی اور پلیدگی کا احساس اتنا شدید ہے کہ وہ رب کے حضور سجدہ ریز ہونے میں مانع رکھتا ہے۔ مایوسی اس کی اتنی گہری ہے کہ رب جو رحمن و رحیم ہے، جس کا پہلا تعارف ہی یہی ہے۔ اسے یہی بنیادی بات بھلائے ہوئے ہے۔ دیا جو درحقیقت علیزے ہے اور اسلام آباد چاچا کے ہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مکین ہے۔ یوسف کرسچن نوجوان جو اپنی خوبروئی کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو استعمال کر چکا ہے۔ علیزے پر بھی جال پھینکتا ہے۔ علیزے جو دیا بن کر اس سے ملتی ہے اور پہلی ملاقات سے ہی یوسف سے متاثر ہو چکی ہے۔

یہ ملاقاتیں چونکہ غلط انداز میں ہو رہی ہیں۔ جبھی غلط نتائج مرتب کرتی ہیں۔ یوسف ہر ملاقات میں ہر حد پار کرتا ہے علیزے اسے روک نہیں پاتی مگر یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرتا ہے کہ یوسف مسلمان نہیں ہے۔ دنیا میں آنے والے اپنے ناجائز بچے کو باپ کا نام اور شناخت دینے کو علیزے یوسف کے مجبور کرنے پر اپنا مذہب نا چاہتے ہوئے بھی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرتی ہے مگر ضمیر کی بے چینی اسے زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ وہ عیسائیت اور یوسف دونوں کو چھوڑ کر رب کی ناراضگی کے احساس سمیت نیم دیوانی ہوتی سرگرداں ہے۔ سالہا سال گزرنے پر اس کا پھر سے بریرہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے جو خیالات کی چکی میں پس کر خود بھی سراپا تغیر کی زد میں ہے۔ علیزے کی واپسی کی خواہاں ہے اور علیزے کی مایوسی اور اس کی بے اعتباری کو اُمید میں بدلنا چاہتی ہے۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں۔

علیزے اور بریرہ جن کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ بریرہ علیزے کی بڑی بہن مذہب کے معاملے میں بہت شدت پسندانہ رویہ رکھتی تھی۔ اتنا شدت پسندانہ کہ اس کے اس رویے سے اکثر اس سے وابستہ رشتوں کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ خاص کر علیزے...... جس پر علیزے کی بڑی بہن ہونے کے ناتے پوری اجارہ داری ہے۔ عبدالغنی ان کا بڑا بھائی ہے۔ بریرہ سے بالکل متضاد صرف پرہیز گار نہیں عاجزی و انکساری جس کے ہر انداز سے جھلکتی ہے اور اسیر کرتی ہے۔ در پردہ بریرہ اپنے بھائی سے بھی خائف ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پرہیز گاری و نیکی میں خود سے آگے کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ہارون اسرار شوبز کی دنیا میں بے حد حسین اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گھر کی دینی محفل میں وہ بریرہ کی پہلے آواز اور پھر حسن کا اسیر ہو کر
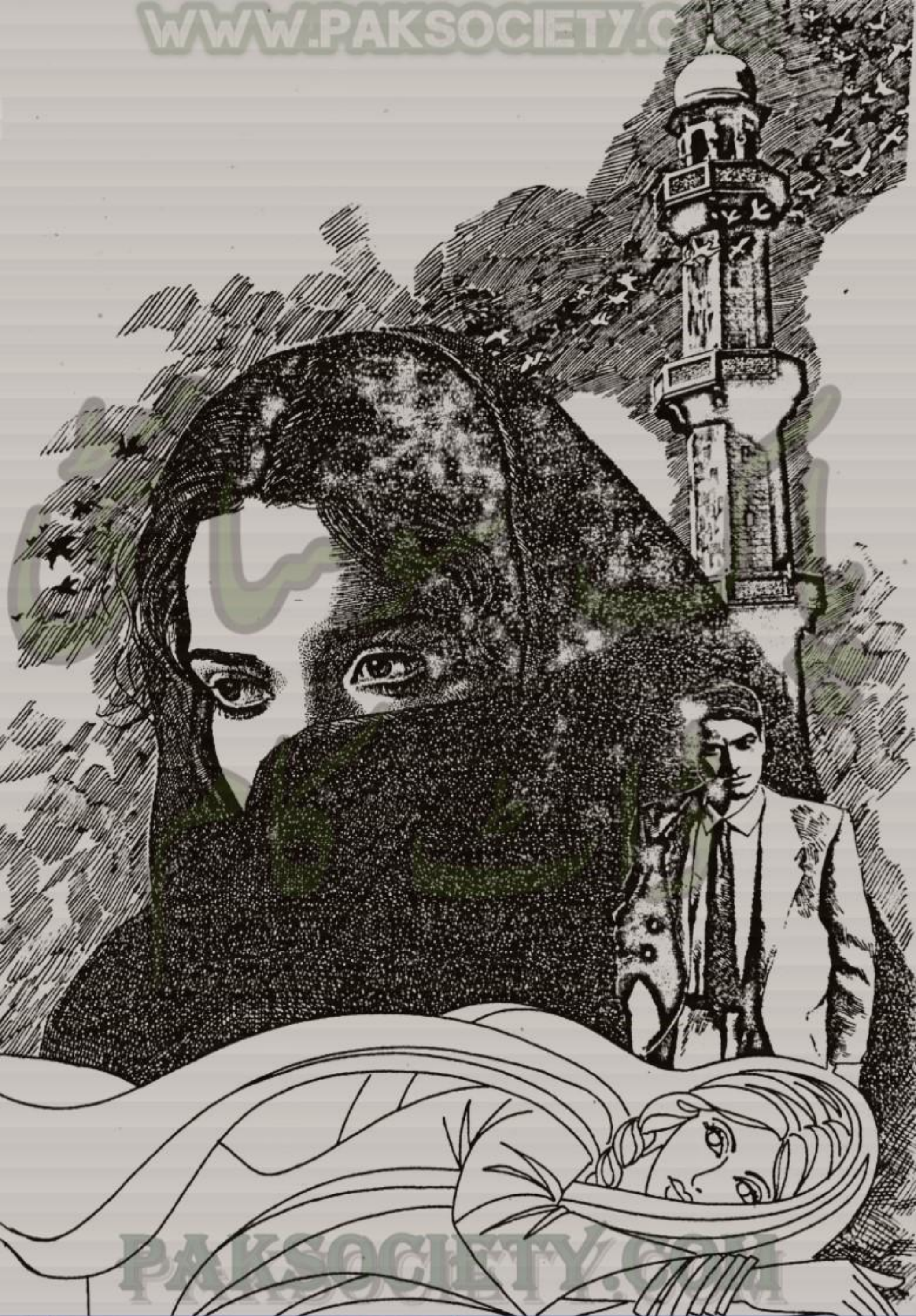
اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مگر بریرہ ایک گمراہ انسان سے شادی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہارون اس کے انکار پر اس سے بات کرنے خود ان کے ہاں آتا ہے اور شوبز تک چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضامند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہیں اس موقع پر اس کی پہلی ملاقات عبدالغنی سے ہوتی ہے۔ ہارون اسرار کسی بھی صورت عبدالغنی کو اس رشتہ پر رضامندی پر التجا کرتا ہے۔ عبدالغنی سے تعاون کا یقین پا کر وہ مطمئن ہے۔ اسے عبدالغنی کی باوقار اور شاندار شخصیت بہت بھاتی ہے۔ محلے کا اوباش لڑکا علیزے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جس کا علم بریرہ کو ہونے پر بریرہ علیزے کی کردار کشی کرتی ہے۔ علیزے اس الزام پر سوائے دل برداشتہ ہونے کے اور کوئی صفائی پیش کرنے سے لاچار ہے۔

اسامہ ہارون اسرار کا چھوٹا بھائی حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا چکا ہے۔ ہارون کی ممی اپنی یتیم بھتیجی سارہ سے زبردستی اس کا نکاح کراتی ہیں۔ جس کے لیے اسامہ ہرگز راضی نہیں اور نہ ہی سارہ کو اس کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سارہ کی اچھائی کی وجہ سے وہ اس کا اسیر ہونے لگتا ہے اور بالآخر اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ لاریب ہارون کی چھوٹی بہن جو بہت لاابالی نظر آتی ہے۔ ہارون کے ہمراہ کالج واپسی پر پہلی بار عبدالغنی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کرنے لگتی ہے۔ لاریب کی دلچسپی عبدالغنی کی ذات میں بڑھتی ہے۔ جسے بریرہ اپنی منگنی کی تقریب میں خصوصاً محسوس کر جاتی ہے۔ لاریب محبت کی راہوں کی تنہا مسافر ہے۔ عبدالغنی انجان بھی ہے اور لاتعلق بھی۔ لاریب کے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث ہے کہ وہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔ علیزے لاریب کی ہم عمر ہے۔ دونوں میں دوستی بھی بہت ہو چکی ہے۔ وہ لاریب کی اپنے بھائی میں دلچسپی کی بھی گواہ ہے مگر وہ لاریب کی طرح ہرگز مایوس نہیں ہے۔

شادی کے موقع پر بریرہ کا رویہ ہارون کے ساتھ بھی بہت لیا دیا اور سرد مہر ہی نہیں حاکمیت آمیز بھی ہے۔

اسے ہارون کے ہر اقدام پر اعتراض ہے۔ وہ اس پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہے اور اس کی ساتھی اداکارہ سوہا کی ہارون سے بے تکلفی اسے سخت گراں گزرتی ہے۔ ممی کو اپنی بیٹی کا عبدالغنی جیسے نوجوان میں دلچسپی لینا ایک آنکھ نہیں بھاتا جبھی ایک معمولی بات پر وہ لاریب کے سامنے عبدالغنی کی بے حد تحقیر کرتی ہیں۔ اس سے پہلے وہ لاریب کو بھی جتلا چکی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ لاریب کو عبدالغنی سے سے روا رکھا جانے والا ممی کا رویہ بغاوت پر ابھارتا ہے۔ وہ تمام لحاظ بھلائے جواب تک اس کے قدموں کو اس راہ پر آگے بڑھنے سے روکے تھے۔ اپنا گھر چھوڑ کر عبدالغنی کے پاس آ کر عبدالغنی سے خود کو اپنانے کی گزارش کرتی ہے۔ عبدالغنی اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے بہلا، سمجھا کر واپس بھیجتا ہے۔ مگر لاریب اس مصالحانہ عمل کو سمجھے بغیر اسے اپنی رجیکشن اور تذلیل سمجھتے ہوئے شدید ہیجان میں جتلا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھتی ہے۔ ممی اس کی حالت پر حراساں جبکہ لاریب اسی ہسٹریائی کیفیت میں جتلا عبدالغنی کے حوالے سے اپنی ہر شدت اور شدت پسندانہ بے بسی ان کے سامنے عیاں کر جاتی ہے۔ ممی جو بریرہ کے حاکمانہ رویے اور ناشکرانہ انداز کی بدولت سخت دل برداشتہ ہیں اور اپنی بیٹی کو اس کے بھائی کے حوالے کرنے میں شامل ہیں۔ لاریب کی خوشی کی خاطر اس شادی پر بالآخر آمادہ ہونے پر ایک بار پھر مجبور ہو جاتی ہیں۔ لاریب کی دائمی مسکراہٹ کی چاہ انہیں عبدالغنی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرتی ہے۔

بریرہ لاریب کو ناپسند کرتی ہے۔ جبھی اسے یہ اقدام ہرگز پسند نہیں آتا مگر وہ شادی کو روکنے سے قاصر ہے۔ لاریب عبدالغنی جیسے منکسر المزاج بندے کی قربتوں میں جتنا سنورتی ہے۔ ہارون بریرہ کے حوالے سے اسی قدر اذیتوں کا شکار ہے۔ لیکن اس وقت تنہا ہوتی ہے۔ جب وہ علیزے کے حوالے سے اس پر الزام عائد کرتی ہے۔ صرف ہارون نہیں...... اس سفلی حرکت کے بعد علیزے بھی بریرہ سے نفرت پہ مجبور ہو جاتی ہے۔ وقت کچھ اور آگے سرکتا ہے۔ بریرہ کے دل شکن رویے کے باوجود ہارون اس کی توجہ کا منتظر بار بار اس کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی لاریب کی طرح سدھار کا متمنی ہے۔ مگر بریرہ جو علیزے کی بے راہ روی کا باعث خود کو گردانتی ہے اور احساسِ جرم میں جتلا رب کو منانے ہر صورت علیزے کی واپسی کی ملتمس ہے۔ ہارون کے ہر احساس سے گویا بے نیاز ہو چکی ہے۔ ہارون اس بے نیازی کو لاتعلقی اور بے گانگی سے تعبیر کرتے ہوئے مایوسی کی انتہا۔ ہ گہرائیوں میں اترتا نا صرف شوبز کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوتا ہے بلکہ ضد میں آ کر بریرہ کو جھنجوڑنے کی خاطر سوہا سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ علیزے کے حوالے سے بالآخر بریرہ کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ لیکن تب تک ہارون کے حوالے سے گہرا نقصان اس کی جھولی میں آن گرا ہوتا ہے۔

علیزے کی واپسی کے بعد عبدالغنی سمیت اس کے والدین بھی علیزے کے رشتے کے لیے پریشان ہیں۔ علیزے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود بھی یہ علم بانٹ رہی ہے۔ عبدالہادی اپنے روحانی استاد کے زیر تربیت ایک کامل مومن کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔ وہ اسے نور کی روشنی پھیلانے کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں۔

عبیر ایک بدفطرت عورت کے بطن سے جنم لینے والی باکردار اور باحیا لڑکی ہے۔ جسے اپنی ماں بہن کا طرزِ زندگی بالکل پسند نہیں۔ وہ اپنی ناموس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ مگر حالات کے تارِعنکبوت نے اسے اپنے منحوس پنجوں میں جکڑ لیا ہے۔ کامیاب علاج کے بعد اسامہ پھر سے اپنے پیروں پر چلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اسامہ چونکہ فطرتاً کاملیت پسند ہے۔ کسی بھی چیز کا ادھورا پن اسے ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بیٹے میں بتدریج پیدا ہونے والی معذوری کا انکشاف اسے سارہ کے لیے ایک سخت گیر شوہر، متکبر انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ وہ ہرگز اس کمی کے ساتھ بچے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ عبیر کو حالات اس نہج پر پہنچا دیتے ہیں کہ وہ ایک مسجد میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اُس کی شرافت دیکھ کر مؤذن صاحب اُسے اپنی پُرشفقت پناہ میں لے کر اُس کی ذمے داری قبول کر لیتے ہیں۔ اُم جان اور بابا جان حج کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ عبدالغنی سے مؤذن صاحب بہت متاثر تھے، وہ اُس سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتے ہیں اور اُسے قابلِ بھروسہ جان کر عبیر کو عقد میں لینے پر زور دیتے ہیں۔ عبدالغنی انتہائی مجبوری کی حالت میں اُن کا یہ فیصلہ قبول کر کے عبیر سے نکاح کر لیتا ہے۔ یہ سب کچھ اتنی اچانک ہوتا ہے کہ وہ لاریب سے اِس بارے میں کوئی ذکر تو کُجا مشورہ بھی نہیں کر پاتا۔ عبیر کو لے کر عبدالغنی گھر آجاتا ہے۔ لاریب کے لیے یہ سب کچھ سہنا آسان نہیں ہوتا، وہ اُسی وقت گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ چونکہ گھر میں کوئی بڑا نہیں ہوتا، اِس لیے لاریب کو سمجھانا عبدالغنی کے بس سے باہر تھا۔ علیزے، عبدالہادی کے ساتھ اُس کی مام سے ملنے اُن کے آبائی گھر چلی جاتی ہے۔ جب عبدالہادی علیزے کو اپنی ماں سے ملوانے کے لیے کہتا ہے تو وہ ایک غیر مسلم عورت سے ملنے کے لیے فوری طور پر انکار کر دیتی ہے۔ عبدالہادی کے لیے یہ ایک بہت بڑا جھٹکا تھا۔ کیونکہ اُس کی ماں بیٹے کی محبت میں اسلام قبول کر چکی تھیں۔ علیزے بدگمان تھی مختلف مواقع پر عبدالہادی کو پرکھنے کے بعد بالآخر اپنا دل صاف کرنے میں کامیاب ہوئی گئی۔ ہارون اسرار کا رویہ بریرہ سے بہت برا ہو جاتا ہے اور وہ اُسے اپنے ساتھ اسلام آباد اپنی دوسری بیوی کے ساتھ چلنے کے لیے کہتا ہے۔ بریرہ اسے بھی اپنا امتحان مان کر راضی ہو جاتی ہے۔ ہارون اسرار کی دوسری بیوی، پہلی بیوی کو برداشت نہیں کر پاتی اور اُس سے اپنے نام لکھی گئی جائیداد اور روپے پیسے لے کر طلاق لے لیتی ہے۔ بریرہ اور ہارون پھر سے محبت کے بندھن کو جوڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ عبدالغنی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ لاریب اور عبیر میں اس حادثے کے بعد دوستی ہو جاتی ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

لاریب بے حد مضطرب سی ہو کر بستر سے اٹھ بیٹھی۔ عبیر کی بے چین نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”اور کچھ بھی نہیں بتایا کیا شاہ نے؟“ وہ حیرانی سے استفسار کرنے لگی۔

”نہیں...... صرف اتنا کہا ہے علیزے کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ ہاسپٹل جا رہا ہوں۔ عبدالعلی کے اسکول کا نمبر ان کے سیل میں محفوظ نہیں ہے شاید...... جبھی کہہ رہے تھے۔ پرنسپل کو فون کر دوں کچھ لیٹ ہو جائیں گے آنے میں۔“

”اللہ رحم کرے۔ علیزے کو اپنی پناہ اور عافیت میں رکھے آمین۔“ عبیر کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

”اُم جان کو نہ پتا لگے پلیز! بہت پریشان ہو جائیں گی۔ تم ذرا عبدالہادی بھائی کا نمبر تو ٹرائی کرو صورت حال جاننے کے لیے۔ عبدالغنی تو فون ہی ریسیو نہیں کر رہے ہیں اور میرا دل ڈوبتا جا رہا ہے۔“

”اچھا میں کرتی ہوں۔“ عبیر اندر دوڑ گئی۔ واپس آئی تو ہاتھ میں سیل فون تھا۔ مگر عبدالہادی کا نمبر ہی آف جا رہا تھا۔ دونوں کی پریشانی سوا تر ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی تھیں مگر کچھ کہنے سننے کی ہمت جیسے خود میں ناپید تھی۔

”میں عبدالعلی کو اسکول سے لے کر آتی ہوں۔ پرنسپل نے کہا ہے وہ مزید آدھے گھنٹے سے زیادہ بچے کو اکیلا اسکول میں نہیں بٹھا سکتیں۔ انہیں خود بھی کسی ضروری کام سے نکلنا ہے۔“ عبیر کی بات پرنسپل صاحبہ سے ہوئی تو لاریب کو آگاہ کیا تھا۔ اس کے چہرے پر موجود تفکر کچھ اور بڑھ گیا۔

”نہیں عبیر! تم باہر نہیں جاؤ گی۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے لاریب! میں عبایا میں جاؤں گی۔'' عبیر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہرگز نہیں...... عبدالغنی کو معلوم پڑے گا تو بہت خفا ہوں گے۔ صورت حال کا معلوم ہے تمہیں۔'' لاریب کے لہجے میں اب کے سختی تھی۔

''لیکن بچہ وہاں......''

''ڈونٹ وری! حل ہے اِس کا میرے پاس۔ میں ممی کو کال کرتی ہوں۔ وہ ڈرائیور کو بھیج کر عبدالعلی کو پک کروا دیں گی...... یا پھر ہارون بھائی پک کرلیں گے۔'' عبیر نے خاموشی سے ممی کا نمبر ملا کے اُسے فون تھما دیا۔ لاریب نے مختصراً بات کر کے صورتِ حال بتا کر کام سونپ دیا۔ ممی نے تسلی سے نوازا تھا۔ اس کے باوجود جیسے قرار کھو گیا تھا۔ لاریب بار بار عبدالغنی اور عبدالہادی کا نمبر ملاتی تھی مگر صورت حال ہنوز تھی۔ جب وہ مکمل طور پر روہانسی ہوگئی۔ تب اسکرین پر عبدالغنی کا نمبر جگمگا اٹھا تھا۔ لاریب چونک کر متوجہ ہوئی۔ اگلے لمحے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس نے بہت عجلت بھرے انداز میں کال ریسیو کی تھی۔

''عبدالغنی...... ! سب خیریت ہے ناں؟'' اس کی آواز خدشات کی یلغار سے لڑکھڑا رہی تھی۔ دوسری جانب جو اسے سننے کو ملا وہ ایسا کیا تھا جس نے پہلے اس کا چہرہ بالکل سفید کیا پھر سرخ کر ڈالا تھا۔

''آپ......؟ سچ کہہ رہے ہیں عبدالغنی۔'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔ عبیر بے چین ہو کر اس کے قریب آگئی اور اپنا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھا۔ لاریب نے فون پرے پھینکا اور اس کے گلے لگ کر بے اختیار سسک اُٹھی۔ عبیر کو لگا تھا اس کی روح کسی نے قبض کر ڈالی ہو۔

☆......☆......☆

''یہ تھوڑا سا تو پیو' بس ایک دو گھونٹ......'' عبدالغنی کے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھا۔ وہ باقاعدہ اصرار کر رہا تھا اور علیزے تھی کہ مسلسل سر کو نفی میں ہلاتی جارہی تھی۔ سب ارد گرد جمع تھے اور وہ تکیوں کے سہارے نیم دراز، چہرہ زرد ہوا پا تھا بالکل۔

''قسم سے تم نے جان نکال لی تھی جیسے ہماری' پیو ورنہ میں سچ مچ ایک لگا دوں گا تمہیں لیزے! تمہاری یہی کوتاہیاں سامنے آئی ہیں۔ خوشی کو بھی خوف میں لپیٹ کے رکھ دیا تم نے ہماری۔'' عبدالہادی جو دونوں بازو سینے پر لپیٹے کھڑا تھا۔ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ علیزے نے بے حد حیرانی میں مبتلا ہو کر اسے دیکھا۔ جیسے یقین نہ آرہا ہو یہ سب وہی کہہ رہا ہے۔ پھر اس حیرانی کی جگہ اس کی آنکھوں میں شکایت، دکھ اور نمی اک ساتھ اُتری تھی۔ اس نے شاکی نظروں سے عبدالغنی کو دیکھا۔ گویا اس سے شکایت کررہی ہو۔

''میں متفق ہوں اس کا۔ ہرگز ڈھیل نہیں دینا چاہتا تمہیں۔ حد ہوگئی۔ یعنی اتنی لاپروائی! لیزے گڑیا! خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا۔ جیسے تم گری تھیں چوٹ سر پر بھی لگ سکتی تھی۔'' عبدالغنی بھی اس اذیت انگیز احساس سے نکل نہیں پا رہا تھا۔ علیزے کا منہ لٹک گیا۔

''تم اگر ڈھنگ سے کچھ کھاتی پیتیں...... خود سے اتنی لاپروائی نہ برتی ہوتی تو یہ سب نہ ہوتا۔'' عبدالغنی متفکر تھا۔ لاریب مسکرادی۔

''ارے بھئی بس کریں پلیز! اتنا نہیں ڈانٹیں اسے۔ اللہ نے خوشی کی خبر دی ہے۔ بجائے مبارک باد دینے کے آپ سب ڈانٹ رہے ہیں۔'' علیزے کو رونے کو تیار پا کر لاریب نے اس کا سر بے حد شفقت بھرے انداز میں اپنے ساتھ لگا کر تھپکا تو عبیر نے مسکراہٹ دبائی تھی۔

''بالکل حمایت کریں گی یہ تو لیزے کی۔ ان کا کارنامہ بھی ملاحظہ ہونا چاہیے۔ اتنی بڑی خوش خبری سُن کر یہ بجائے ہنسنے مسکرانے کے رونے لگیں۔ ہارٹ فیل ہو جاتا میرا تو اگر اگلے لمحے یہ ہنستے ہوئے یہ نہ بتاتیں اس کی وجہ کیا ہے۔''

''بھئی اپنی بہو کے دنیا میں آنے کی خبر ملی ہی ایسے حالات میں تھی کہ کیفیات گڈمڈ ہو گئیں۔ سمجھ نہیں آتی تھی روؤں یا ہنسوں۔'' وہ کھسیانی سی ہو کر وضاحت پیش کر رہی تھی۔ سبھی مسکرا دیے۔

''جی ہاں! جبھی آپ نے دونوں کام کرنے شروع کر دیے۔ کسی ایک پر کیا موقوف ہے۔ یہاں سب ہی محترمائیں جذباتیت میں ایک دوسرے سے دو چار ہاتھ آگے ہیں۔'' عبدالغنی مسکراہٹ دبائے کہہ رہا تھا۔ پھر اٹھتے ہوئے علیزے کا گال تھپتھپایا۔

''میری گڑیا! مجھے اُمید ہے تم آئندہ یہ حماقت نہیں کرو گی۔ دکھ، سکھ اونچ نیچ سب زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ مگر زندہ رہنے کے کچھ اطوار، کچھ طریقے ہوتے ہیں۔ ان پر عمل نہ کیا جائے تو ہم خود سے وابستہ رشتوں کو گہرے دکھ سے ہمکنار کر رہے ہوتے ہیں۔ مجھے سچ پوچھو تو تم سے زیادہ عبدالہادی کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ جس طرح یہ ہاتھ پیر چھوڑے دے رہا تھا۔'' عبدالغنی نے عبدالہادی کو دیکھ کر بیچ محفل میں اس کا راز فاش کیا۔ انداز میں محبت بھری ہوئی تھی۔ جبکہ وہ جھینپ کر سرخ پڑنے لگا۔ اُمِ جان کچھ بول نہیں رہی تھیں۔ خوش تھیں اور مختلف آیات پڑھ پڑھ کر مسلسل علیزے پر پھونکتی جا رہی تھیں۔ تب ہی ہارون اسرار کے ہمراہ بریرہ بھی چلی آئی تھی۔ سب سے پہلے لپک کر علیزے کے پاس آئی اور گلے لگا کر ماتھا چومنے، مبارک باد سے نوازا تھا۔

''الحمد اللہ! احسان ہے مالک کا کہ یہ گھڑی دیکھنی نصیب فرمائی۔ دعا ہے اللہ پاک تمہاری خوشیوں کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ آمین۔ ہر خواہش پوری کرے۔ اپنی حفظ و امان میں رکھے تمہیں۔'' اس کی آواز خوشی و انبساط سے لرز رہی تھی۔ علیزے کی آنکھیں اتنی محبت و خلوص پہ نم ہوتی چلی گئیں۔

''بجو......!'' اس کی آواز لرزی۔ کچھ کہے بغیر اس نے بریرہ کا ہاتھ پکڑ کر بے حد عقیدت مندانہ بوسہ ثبت کیا۔

''مجھے معاف کر دیں بجو!'' اس کی آواز بھراہٹ کا شکار تھی۔ جسے صرف بریرہ ہی سن سکی۔ جبھی اس کا گال تھپکا اور سر پر بوسہ دیا۔

''ہمیشہ یاد رکھنا۔ میری محبت مجھے تمہاری کسی بھی بڑی سے بڑی غلطی پر بھی خفگی کی اجازت نہیں دے سکتی۔ ٹینشن فری رہو۔'' وہ اس کا ہر ملال دھو رہی تھی۔ علیزے کچھ نہیں کہہ پائی۔ اس کی نظروں میں محبت کے ساتھ ساتھ عقیدت کا رنگ بھی اُتر رہا تھا۔

''اتباع کدھر ہے ممانی جان!'' عبداللہ عبیر کے سر پر کھڑا خاصا جھنجلا کر سوال کر رہا تھا۔ صاف لگتا تھا وہ اسے ہر جگہ ڈھونڈ آیا ہے۔

''میری جان گڑیا سو رہی ہے۔ کچھ دیر میں اٹھے گی۔'' عبیر نے جھک کر اسے پیار کیا۔ مگر عبداللہ کا موڈ آف ہی رہا تھا۔ سب مسکرانے لگے۔

''وہ ہر وقت سوتی کیوں رہتی ہے؟'' اس نے پیر پٹخے۔

''اسے معلوم تو ہونا چاہیے اس کا فرینڈ آیا ہوا ہے۔'' اس کا غصہ مزید بڑھا۔ لاریب نے مسکراہٹ دبائی۔

''بھائی بڑا جلالی ہے آپ کا سپوت۔ دیکھیں ذرا، ابھی سے ہماری لڑکی پر اپنا رعب جمانا شروع کر دیا ہے اس نے۔''

''رعب...... نہیں، حق۔'' ہارون نے جواباً شوخی

سے تصیح کی۔ علیزے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ہاں آپ تو دفاع کریں گے ہی بھائی' ورنہ حقیقت یہ ہی ہے کہ یہ محترم رعب جمار ہے ہیں۔'' علیزے لاریب کی حامی ہوئی تھی۔ ہارون نے کاندھے جھٹک دیے۔

''کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ دونوں حق محفوظ رکھتا ہے۔''

اس برجستگی پر سبھی ہنسنے لگے تھے۔ جب لاریب نے اس پر گرفت کی تھی۔

''تم اپنی اور اپنی بیٹی کی خیر مناؤ۔ میرا بیٹا عبداللہ سے کہیں بڑھ کر جلالی طبیعت رکھتا ہے۔''

لاریب کا ایسا مذاق وہ بھی سب مردوں اور بڑوں کی موجودگی میں علیزے کو بے تحاشا سرخ کر گیا تھا۔ وہ لاریب کو گھورنا چاہتی تھی مگر عبدالہادی کی لو دیتی نظروں کا احساس اسے پلکیں اٹھانے کی اجازت نہیں دے سکا۔

☆......☆......☆

''کہاں جانا ہے مجھے بتاؤ۔'' ٹانگوں سے کمبل ہٹا کر جیسے ہی اس نے بستر سے اترنا چاہا عبدالہادی جو کچھ فاصلے پر موجود تھا اور کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھا۔ فوری متوجہ ہو کر ہمکلام ہوا۔ علیزے جھلا کر رہ گئی۔

''کیوں......؟ اب میں اپنی مرضی سے کہیں آ جا بھی نہیں سکتی۔ یا پھر آپ مجھے گود میں اٹھا کر لیے پھرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' اس کی پریگننسی کی وجہ سے فی الحال ان کا جانا موقوف ہو گیا تھا جبکہ علیزے کو تو لگنے لگا تھا ان سب نے مل کر اسے بس بستر تک محدود کر دیا ہے۔ اتنی سختی اور خیال تو اس کا تب بھی نہیں رکھا گیا تھا جب وہ وحشتوں کے صحراؤں کی ساری خاک چھان کر برس ہا برس کی جدائی کاٹ کر انہیں ملی تھی۔

''نہیں آ جا سکتی ہو تم اپنی مرضی سے......اور گود میں اٹھانے پر بھی ہرگز پابندی نہیں۔ حکم کرو تو ابھی بھی اٹھا کر لے جا سکتا ہوں۔'' اپنا پرکشش بے حد خوبرو چہرہ اس کے نزدیک لا کر وہ بے حد شوخی سے بولا۔ جو علیزے کو بالکل اچھی نہیں لگ سکی تھی۔ کچھ دیر خفگی سے اسے تکتی رہی۔ پھر چہرے کو پھیر لیا تھا۔ عبدالہادی حیران رہ گیا۔

''لیزے!'' وہ بے قرار ہونے لگا۔

''بات مت کریں مجھ سے آپ۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی تو عبدالہادی نے گھبرا کر تیزی سے اس کا رُخ اپنی جانب پھیرا۔

''کیا ہوا لیزے...... کہیں انجانے میں' میں تمہیں ہرٹ کر چکا ہوں کیا؟'' وہ کتنا پریشان نظر آنے لگا تھا ایکا ایکی ہی علیزے نے آنسوؤں سے جل تھل نظریں اٹھائیں۔

''اتنی غفلت معصومیت کی نہیں بے نیازی اور لاتعلقی کی جانب اشارہ کرتی ہے عبدالہادی! جبکہ میں تو کسی شدید غلط فہمی کا شکار ہو چکی تھی۔'' وہ یکدم ہی بے تحاشا رو پڑی۔ عبدالہادی کے اوسان خطا ہونے لگے تھے۔

''بخدا لیزے! ایسا مت کرو۔ اللہ شاید ہے میں نے تمہیں دانستہ دکھ نہیں دیا۔ لیکن ایسا ہو چکا ہے مجھے بتاؤ کیوں خفا ہو مجھ سے۔'' اس کا انداز اتنا ملتجی تھا۔ اس قدر اضطراب چھلکا رہا تھا کہ علیزے کو اپنی شکایت دم توڑتی محسوس ہونے لگی۔

''اس روز کتنا ڈانٹا آپ نے مجھے سب کے سامنے' اتنا ہی بے قرار ہو رہے تھے مجھے مارنے کو تو یہ خواہش پوری کر لیتے۔ اعلان کرنا ضروری نہیں تھا۔'' وہ پھپک کر بولی اور جیسے اپنا سارا غصہ نکالا۔ عبدالہادی جو حیران پریشان اسے دیکھ رہا تھا۔ گہرا سانس بھرتا ہوا اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں

لے کر مسکرانے لگا۔

''میری جان! یہ غصہ تھا تمہیں کس نے کہا؟ یہ لاڈ ہو سکتا ہے، مان ہو سکتا ہے، پیار ہو سکتا ہے اور کچھ نہیں۔ اب بتاؤ کیا یہ حق نہیں ہیں میرے......''

''سب کے سامنے؟ وہ سب تو یہی سوچیں گے نا کہ آپ مجھے ہمیشہ ہی ڈانٹتے ہیں۔'' علیزے جو اس کی بات کسی حد تک سمجھ گئی تھی مگر بظاہر روٹھے پن سے کہہ گئی۔ عبدالہادی نے جواباً مسکراہٹ دبالی۔

''پہلی اور حتمی بات یہ کہ وہ سب میری زوجہ محترمہ کی طرح عقل کے کچے نہیں کہ سمجھانا پڑے۔ دوسری خاص بات......'' علیزے کے گھورنے کو خاطر میں لائے بغیر وہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے مزید گویا ہوا تھا۔

''اس وقت مجھے اس اہم خوشی کے موقع پر جتنا تم پر پیار آرہا تھا ناں...... شکر کرو اس کا اظہار نہیں کر دیا۔ ورنہ تم نے تو مجھے کبھی معاف نہیں کرنا تھا۔ بے باکی کے اس مظاہرے پر......'' اس کا گلال ہوتا تپتا چہرہ دلچسپی سے دیکھتا ہوا وہ بے حد شریر ہو رہا تھا۔ علیزے نے کتراتے ہوئے جھلاہٹ زدہ انداز میں اس کے بازو اپنے شانوں سے ہٹائے جو وہ اس کے گلے میں حمائل کرنے کی تیاری میں تھا۔

''آپ واقعی بہت بدتمیز ہیں۔ میں بہت صحیح پہچانی ہوں آپ کو۔'' وہ اسے گھورنے میں کامیاب نہیں ہوئی تو غصے میں آنے لگی۔ عبدالہادی سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ پھر ٹھنڈی سرد آہ بھر لی تھی۔

''تم میری تعریف بھی کر سکتی تھیں، یعنی میں بہت کیئرنگ، بہت لونگ ہوں وغیرہ۔''

''یہ کام مجھ سے نہیں ہوتا۔ یعنی اور سر پر بٹھالوں آپ کو۔'' وہ مسکراہٹ ضبط کر رہی تھی۔ پھر اسے گھورنے لگی۔

''آج کل اور کوئی کام نہیں ہے آپ کو......؟ نماز بھی پتا نہیں کیسے پڑھتے ہیں۔ ورنہ تو میری نگرانی اور پہرے داری۔''

اس کام پر آپ کے محترم سسر صاحب نے لگایا ہے مجھے۔ ان کے خیال میں ابھی ان کی بہو صاحبہ اتنی میچور نہیں ہوئیں کہ اس قسم کا خیال رکھ سکیں اپنا۔'' اس نے بہت فخر سے چاچو کا ذکر کیا تھا۔ لاریب گہرا متاسفانہ سانس بھر کے رہ گئی۔

''بس یہی کمی تھی آپ اگر ان کے سامنے نااہل ثابت کریں گے مجھے، تو وہ یہی سمجھیں گے۔'' عبدالہادی نے بغور اسے تکتے اس کی کیفیت کا اندازہ لگانا چاہا۔ پھر اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

''میری جان! بدگمان نہ ہوا کرو۔ میں ہمیشہ تمہاری تعریف کرتا ہوں چاچو کے سامنے...... وہ تو بس۔''

''میں جانتی ہوں عبدالہادی! بس تنگ کر رہی تھی آپ کو۔'' وہ شوخی سے مسکرائی تو اب عبدالہادی نے اسے گھورنا شروع کیا تھا۔ اور وہ ہنسے جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

علیزے کی طبیعت جیسے ہی سنبھلی اور ڈاکٹر نے سفر کی اجازت دی۔ عبدالہادی چاچو کے اصرار کے سامنے سر جھکاتا ہوا علیزے کو لے کر وادی اپنے گھر میں آ گیا تھا۔ عالی شان مسجد اور جدید سہولیات سے آراستہ مدرسے کی عمارتیں تیار ہو چکی تھیں۔ رنگ و روغن سے لے کر خطاطی سے مزین سینریاں تک آویزاں ہو چکی تھیں۔ عبدالہادی کو یہیں مسجد کا چارج سنبھالنے کا چاچو نے حکم دیا تھا۔ ان کا خیال تھا صرف یہ عمارتیں بنا دینا اہم نہیں تھا۔ اس سے اہم انہیں آباد کرنا، اللہ کے ذکر سے آراستہ کرنا اور اس علاقے میں اللہ کے احکامات کی تبلیغ کا کام تھا، اہم بہت اہم...... اور اس کام کو ان کے خیال میں، عبدالہادی ہی بہتر طور انجام دے سکتا تھا۔ چاچو نے

اپنے کچھ مزید قابل شاگرد بھی ہمراہ کردیے تھے۔ جو مدرسہ میں درس و تدریس کا نظام سنبھالنے میں عبدالہادی کی مدد کرسکتے تھے۔

"لیڈیز کا حصہ الگ ہے ناں عبدالہادی! میں بھی پڑھانا چاہوں گی۔ یہ میری خواہش ہے۔" علیزے کی بات سُن کر عبدالہادی نے تائید میں سرہلایا۔

"بالکل...... مگر کچھ دن رُک جاؤ۔ ایک وجہ تو تمہاری طبیعت ہے۔ وومیٹنگ کی وجہ سے بہت نڈھال رہتی ہو۔ دوسرا اہم معاملہ اسٹوڈنٹس کا ہے۔ جب تک کوئی پڑھنے والی نہ ہوگی تم وہاں کروگی کیا؟" عبدالہادی کی بات پر علیزے کا چہرہ بجھ سا گیا۔

"یہاں پھر میں کروں کیا......؟ آپ کی شکل بھی دیکھنے کو ترستا ہے۔ مجھے معلوم ہے ایسی مصروفیات ہیں آپ کی۔"

"ارے میری جان! یہ کیا بات کی۔ کہو تو سب کچھ چھوڑ کر تمہارے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاتا ہوں۔" وہ یکدم انداز بدل کر شوخ ہوا تو علیزے گڑبڑا گئی۔

"خیر میرا یہ مطلب بھی نہیں تھا۔" اس نے نخوت سے ناک چڑھائی تو عبدالہادی ہنسنے لگا۔

"یہ گھر تمہارا ہے۔ اسے توجہ دو۔ وقت کٹنے کا پتا ہی نہیں لگے گا۔" وہ نیا مشورہ دے رہا تھا۔ علیزے سرہلانے لگی۔

"ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ وہ مطمئن نظر آئی تو عبدالہادی بھی ریلیکس ہوا۔

☆......☆......☆

پھر بہت سارے دن بیت گئے۔ وہ جو یہ سمجھتی تھی۔ یہاں نہیں رہ پائے گی، مگن ہونے لگی تھی۔ گھر اتنا بڑا تھا کہ ملازماؤں کی موجودگی کے باوجود اس کے لیے کاموں کی گنجائش نکل آتی تھی۔ پھر کھانا تو خاص کر وہ خود پکاتی نہیں تو اپنی نگرانی میں بنواتی۔ آئے دن بیڈروم اور ڈرائنگ روم کی سیٹنگ بدلنا بھی دلچسپ کام تھا اس کے لیے۔ اس ایک مہینے کے دوران وہ صرف ایک بار سب سے ملنے گئی تھی۔ وہ بھی دوسرے دن واپس آگئی۔ اس وقت بھی وہ کچن میں کھڑی ملازمہ کے ہمراہ دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی، جب انٹرکام بج اٹھا تھا۔ ملازمہ نے اس کے اشارے پر ریسیور اٹھایا۔

"جی میم! بہتر ابھی بتاتی ہوں میم کو۔" ملازمہ کا لہجہ و انداز مودبانہ تھا۔ علیزے نے مصروف رہتے ہوئے حیرانی سے پلٹ کر دیکھا۔ یہ اندازِ تخاطب مالکوں کے لیے مخصوص تھا۔ اسے سمجھ نہیں آسکی. ملازمہ کی بات کس سے ہوئی ہے۔

"میم! میم لیزا تشریف لائی ہیں۔ آپ سے ملنے کی خواہش مند ہیں اور ڈرائنگ روم میں منتظر ہیں۔ ملازمہ کی اطلاع نے علیزے کی صبیح پیشانی پر ناگواری کی شکنیں بکھیر دی تھیں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چمچ کڑاہی میں پٹخ دیا۔ موڈ یکدم غارت ہوا تھا۔

"وہ کیوں آئی ہے اب......؟" ملازمہ اس بات کا کیا جواب دے سکتی تھی۔ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ علیزے نے ہونٹ بھینچے اور خود کو کچھ دیر کمپوز کرتی رہی۔ لیزا سے اسے ہمیشہ چڑ محسوس ہوئی تھی تو اس کی وجہ اس کا عبدالہادی کی طرف واضح جھکاؤ تھا۔ یہی بات اس کی شدید ناپسندیدگی کا باعث ٹھہری تھی۔ قدرے توقف سے وہ کچن سے نکلی تو اپنے احساسات کی ناگواری پر قدرے قابو پاچکی تھی۔ ملازمہ کو اس نے چائے لانے کی بھی تاکید کردی تھی۔

"ہیلو...... کیسی ہو علیزے!" علیزے کے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی وہ خیر مقدمانہ انداز

انداز میں اُٹھ کر چیخی تھی۔ علیزے نے جینز شرٹ میں ملبوس چمکتی دمکتی لیزا کو دیکھا اور تکلفاً مسکرائی۔

''الحمد اللہ! آپ کیسی ہیں۔'' اس کا لہجہ محض رواداری سمیٹے ہوئے تھا۔ یہ سچ تھا! سے لیزا کو دیکھ کر ہرگز خوشی نہیں ہوئی تھی۔

''مجھے معلوم ہوا تھا۔ تم پریگنٹ ہو۔ تو مبارک دینے چلی آئی۔'' لیزا اسے بغور جھانک رہی تھی۔ گلابی بیش قیمت لباس میں بظاہر سادگی کا مظہر وہ لڑکی بلاشبہ کسی انوکھی کشش اور سحر کی حامل تھی۔ جس نے عبدالہادی کو ایسا اسیر کیا تھا کہ وہ کسی اور جانب دیکھنے کے قابل نہیں رہ سکا تھا۔ حالانکہ ہر طریقہ ہی تو آزما کر دیکھ لیا تھا لیزا نے اسے قابو کرنے، بہکانے کا، مگر بے سود۔ اس کے اندر ملال کا احساس ہی گہرا نہیں ہوا۔ جیسے کوئی ناگن بھی پھنکارنے لگی تھی۔

''آپ کا شکریہ، بہت نوازش۔'' اب کے علیزے کھل کر مسکرانے لگی۔

''یہ میرا بیٹا ہے۔'' اس نے سرخ و سفید بے حد پیارے بچے کو بازو کے حلقے میں لے کر ساتھ لگایا جو اس کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ علیزے قدرے چونکی، پھر سنبھل کر مسکرا دی۔

''بہت کیوٹ ہے۔ نام کیا ہے اس کا۔'' اس نے بچے کے گال نرمی سے سہلا کر رسماً پوچھا۔

''میں نے ابھی تک اس کا نام نہیں رکھا۔ بی کوز اس کے باپ کو اس سے غرض نہیں۔ مجھے بھی ضد ہوگئی ہے۔ جب تک وہ اسے ایکسیپٹ نہیں کرتا۔ تب تک میں اسے ہرگز کوئی نام نہیں دوں گی۔'' لیزا کا لہجہ، اس کا انداز شوریدہ سر لہر جیسا تھا۔ تند خیز...... غصیلا، علیزے نے چونک کر ٹھٹک کر اسے دیکھا اور کچھ ثانیوں کو کچھ کہہ نہیں سکی تھی۔

''کیا مطلب......؟ میں سمجھی نہیں؟'' وہ واقعی اُلجھی ہوئی لگنے لگی۔ اک لمحے کے لیے اسے لیزا پر ترس آیا۔ ہمدردی بھی محسوس ہوئی۔

''اس بچے کا باپ مسلم ہے اب بقول اس... کے، جبکہ میں ہنوز عیسائی ہوں۔ ہماری اولاد دو مختلف مذاہب کو ماننے والوں کی اولاد ہے۔ میں اسے کس مذہب میں شامل کروں سمجھ نہیں آتا۔'' وہ بے نیازی سے کہہ رہی تھی۔ علیزے کا دل پوری قوت سے یکلخت جیسے ڈوب سا گیا۔ کسی خوف ناک خیال کا حراساں کر دینے والا احساس اس کی دھڑکنوں میں ہلچل مچانے لگا۔ حشر برپا کرنے لگا۔

''ک...... کیا مطلب؟ کون ہے اس کا باپ......؟'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں سوال کیا تھا۔ ناگواری کا شدید احساس جیسے اس کے رگ و پے میں تیز برقی رو بن کر دوڑنے لگا تھا۔

''تمہارا نام نہاد شوہر...... عبدالہادی صاحب!'' لیزا کا لہجہ و انداز طنزیہ تھا، خار کھایا ہوا۔ علیزے کو لگا اسے یکدم کسی نے اونچے پہاڑ سے دھکا دے دیا ہو۔

''شٹ اپ۔'' مٹھیاں بھینچ کر وہ پوری قوت سے چلائی۔ لیزا نے ناگواریت میں مبتلا ہو کر اسے دیکھا۔

''کیوں چلا رہی ہو تم؟'' وہ چیخی۔

''چلانے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ سنا تم نے؟ میں بہت عرصے سے قائل کر رہی تھی اسے کہ وہ اپنی اولاد کو ایکسیپٹ کر لے۔ نہیں مانتا تو مجھے تم سے بات کرنی پڑی۔'' ناخوش گوار تاثرات سے مزین چہرہ، خشک و سپاٹ بے رحم انداز میں بولتی ہوئی لیزا علیزے کے لیے صورِ اسرافیل تھی۔ اسے لگا اک قیامت برپا ہوئی ہے اس کے اندر اور سب کچھ تباہی کے دہانے پر جا پہنچا ہے۔

''تم سے اولاد دل رہی ہے تو پھولے نہیں سما رہا۔ یہ بچہ بھی اسی کا ہے۔ جسے وہ سالوں سے ایکسیپٹ کرنے میں متامل ہے۔ میں یہ برداشت نہیں

کر سکی۔ جبھی تمہیں بتایا ہے۔'' لیزا اشتعال اور وحشت سے بھری ہوئی تھی۔ علیزے کی آنکھوں میں اندھیرے سے اُترنے لگے۔

''تم کیوں یہ سمجھتی ہو کہ تم ان پر الزام لگاؤ گی اور میں مان بھی جاؤں گی، ہر گز نہیں۔'' خوف سے مفلوج ہوتے احساس پر اس نے ڈھارس کا پردہ رکھنا چاہا۔ لیزا طنزیہ انداز میں بھرپور حقارت سمو کر مسکرائی۔

''مجھے معلوم تھا تم یہی سمجھو گی۔ ذرا پوچھنا اس سے...... جن دنوں وہ حواس مختل کیے ہوئے تھا اور ہر وقت شراب کے نشے میں دھت رہتا تھا۔ تب اس نے کتنی بار میرے ساتھ یہ تعلق استوار کیا تھا۔ محترمہ علیزے صاحبہ وہ تمہارے فراق میں بھی اپنا ٹائم برباد نہیں کرتا رہا ہے۔ کسی بھول میں ہو تو نکل آؤ۔ یہ بچہ اس تعلق کی پیداوار ہے۔ وہ اسے تسلیم کرے چاہے نا کرے۔''

وہ بے مروت انداز میں کہہ کر بچے کا ہاتھ پکڑے ایڑیاں بجاتی وہاں سے چلی گئی۔ ملازمہ چائے لے کر آئی تو علیزے زرد پڑتی رنگت کے ساتھ بے دم سی وہاں بیٹھی تھی۔ ملازمہ کو سب کچھ بھول گیا اس کے سوا۔ اسے کسی نہ کسی طرح کمرے میں لا کر بیڈ پر لٹانے کے بعد وہ عبدالہادی سے رابطے میں مشغول ہو گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں وہ اگلے پندرہ منٹ بعد علیزے کے روبرو تھا۔ مگر علیزے نے جتنی بیگانگی اور بے اعتنائی کے ساتھ منہ پھیرا تھا۔ وہ انداز عبدالہادی کا کلیجہ شق کرنے کو کافی ہو سکتا تھا۔

''اس کا مطلب تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں اور اس کی ہر بات کا یقین ہے؟'' عبدالہادی دکھ کے شدید احساس سے ٹوٹنے لگا۔ علیزے نے اسے ایک نظر دیکھا تھا۔ کیا تھا اس ایک نگاہ میں کہ عبدالہادی کے اندر تیر پیوست ہو گئے تھے۔ اس نے خود کو برہنا پا دہکتے انگاروں پر محسوس کیا۔

''وہ کہتی ہے جب آپ شراب کے نشے میں دھت ہوا کرتے تھے۔ تب کتنی مرتبہ اس کے ساتھ تعلق قائم کیا آپ کو بھی اندازہ نہیں ہے۔'' وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر اس کے مقابل آئی اور تضحیک آمیز انداز میں جتلایا۔ عبدالہادی نے بے ساختہ ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کا سانس دھونکنی کی مانند چلنے لگا تھا۔ جبکہ چہرے پر جیسے کسی نے آگ دہکا دی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

''چپ ہو گئے نا آپ بھی......؟'' وہ جیسے دکھ سے شل ہوتی رو پڑی۔

''مکر جائیں گے کیا اس بات سے بھی عبدالہادی کہ اس بات کا اعتراف آپ میرے سامنے بھی کر چکے ہیں کہ آپ ایک غلط انسان تھے۔ ٹوٹلی رانگ...... جس کے جانے کتنی لڑکیوں سے تعلق رہ چکے تھے۔ ایک لیزا ابھی سہی۔'' یونہی روتی ہوئی وہ وہیں گھٹنوں کے بل گر گئی۔ عبدالہادی پھر بھی خاموش رہا البتہ اسے بازوؤں میں بھر کے اٹھانا چاہا تو وہ مچل کر ، تڑپ کر اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی تھی۔

''مت ہاتھ لگائیں مجھے عبدالہادی! مت چھوئیں۔ بس اپنی غلطی کو تسلیم کریں۔ اپنے گناہ کا اعتراف کریں۔ ایکسپیٹ کریں اس بچے کو۔ اس کا نام رکھیں۔ اپنی ولدیت دیں۔'' چبا چبا کر ایک ایک لفظ کہتی وہ اسے تیکھی نظروں سے گھورے جا رہی تھی۔

''لیزے میں......''

''انکار مت کیجیے گا عبدالہادی! جھوٹ نہیں بولیے گا۔'' وہ پھر چلائی۔ عبدالہادی چپ کا چپ رہ گیا۔ اسے دکھ تھا تو بس یہ کہ لیزا اپنی چال میں کامیاب رہی تھی۔ وہ اسے ہر قسم کا لالچ دیتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی خاطر اسلام قبول کرنے کا بھی...... جواب میں بس ایک خواہش تھی اس کی۔ وہ شادی کر لے اس سے۔ عبدالہادی یہی بات نہیں

مان رہا تھا۔

"ایسا نہ پہلے ممکن تھا لیزا نہ اب ممکن ہے۔ اگر ایسا کرنا ہوتا تو میں تمہیں کبھی اتنا انتظار نہ کراتا۔ مجھے افسوس ہے میں تمہارا دل توڑ رہا ہوں۔ مگر میں بے بس ہوں، کچھ نہیں کر سکتا تمہارے لیے۔ علیزے بہت پوزیسو ہے۔ وہ تمہیں پسند نہیں کرتی۔ اور میں اسے دکھ دینا نہیں چاہتا۔" یہ اس کی آخری بات چیت تھی لیزا سے...... جواب میں وہ کتنا بپھرائی تھی۔ ذلت سے توہین سے، بےبسی سے۔

"تم غلط کر رہے ہو بہت یوسف! اگر تم نے اب بھی مجھے ایکسیپٹ نہیں کیا تو یاد رکھنا...... میں وہ کروں گی جو تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ بہت خوش ہونا اپنی بیوی کے ساتھ......؟ میں یہی خوشی تم سے چھین لوں گی۔" اس کی دھمکی عبدالہادی کو خائف نہیں کر سکتی تھی۔ اسے خود پر اعتماد تھا۔ اس نے بہرحال کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ مگر اب اسے لگ رہا تھا۔ لیزا اپنا کہا پورا کر چکی ہے۔ اس نے جلتی آنکھوں کے ساتھ علیزے کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر اتنی ناراضی تھی کہ اس کا دل بند ہونے لگا تھا۔ وہ اٹھا اور اس کے نزدیک آ گیا۔

"جب سے اسلام قبول کیا ہے۔ الحمدللہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرا۔ جب کوئی نیکی نہیں کرنی آتی تھی، کوئی بھی نہیں...... میں نے چاچو سے ایک سوال کیا تھا کہ کوئی ایسی نیکی بتا دیں مجھے جو بہت آسان ہو۔ جسے اپنانے میں مشقت میں نہ پڑوں۔ جسے فوری اختیار کر سکوں۔ یعنی قرآن اور نماز پڑھنا میرے لیے بہت مشکل تھا۔ اسے کرنے سے قبل سیکھنے کا مرحلہ درکار تھا۔ تب انہوں نے ایک نصیحت کی تھی کہ میں جھوٹ بولنا ترک کر کے سچ کو اپنا لوں۔ حالات جیسے بھی ہوں۔ میں سچ ترک نہ کروں اور ایسا میں صرف اللہ کے خوف سے کروں گا تو مجھے ہمت اور توفیق بھی وہی دے گا۔ علیزے یہ دونوں نیکیاں مجھے آج تک سب سے پیاری اور آسان لگتی ہیں۔ مجھے ان کی توفیق بھی اللہ نے دی ہے۔ میں تم سے یہ نہیں کہوں گا مجھ پر یقین کرو۔ میں تم سے یہ کہوں گا اگر اللہ پر یقین ہے تو اس بات کو مان لو کہ اور جس سے بھی سہی، میرا کبھی بھی لیزا سے کسی قسم کا تعلق نہیں رہا۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ اٹھا تھا اور پلٹ کر باہر چلا گیا۔ علیزے ساکن و سامت بیٹھی تھی۔

☆......☆......☆

اس نے ہاتھ بڑھایا اور ٹیبل لیمپ آن کر دیا۔ زرد روشنی میں اسے عبدالہادی اپنے پہلو میں لیٹا نظر آیا۔ دوسری جانب کروٹ لیے...... وہ اسے یونہی دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی یہاں تک کہ آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئیں۔ اسے یاد آیا۔ ایک بار جب ایسے ہی وہ لیزا کے حوالے سے بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھی۔ یہ ان کی شادی کے فوری بعد کا واقعہ تھا۔ تب بھی وہ کتنا چلائی تھی، اس پر کس درجہ برہم ہوئی تھی۔ الزامات کی بوچھاڑ...... بدگمانی کی انتہا۔ تب بھی وہ اسی تحمل، اسی سکون و اطمینان سے اسے سنتا رہا تھا۔ پھر اس کے بالکل روبرو گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا تھا اور زبردستی اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر گہرے متبسم لہجے میں گویا ہوا تھا۔

"ابھی تو ہم نہیں بولے
ابھی تو آپ ہیں اور آپ کا زورِ خطابت ہے
بہت الفاظ ہیں نادر
بہت بے ساختہ جملے
ابھی تو لب کشائی آپ کی اپنی گواہی ہے
ابھی تو علم و حکمت لفظ و گوہر آپ کے ہی ہیں
ابھی سب فیصلے سب محو و محور آپ ہی کے ہیں

کتنا خوب صورت تھا اس کا گھمبیر تر لہجہ اور انداز میں ہلکی سی شکایت، اسے لگا وہ اب بھی اسی

طرح اس سے شاکی ہے۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔
کھانا دونوں نے نہیں کھایا تھا۔ حالانکہ وہ منتیں کرتا رہا تھا اس کی۔ اس نے اپنا دل ٹٹولا۔ عبدالہادی کے حوالے سے اطمینان کی فراوانی تھی۔ یا شاید جو حوالہ اس نے دیا تھا وہ اتنا مضبوط، مستحکم اور دل نشین تھا کہ شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔ اس نے عبدالہادی کی جانب کروٹ بدلی تو منہ سے کراہ نکل گئی تھی۔ عبدالہادی جو جاگ رہا تھا۔ بے اختیار اس کی جانب پلٹ آیا۔

''کیا ہوا لیزے...... ! طبیعت ٹھیک ہے؟'' اس کے وجیہہ چہرے پر تفکر تھا۔ علیزے اسے دھندلی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر کچھ کہے بغیر سرک کر اس کے نزدیک ہوئی اور سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

''میں بہت بری ہوں نا عبدالہادی! ہمیشہ آپ کو تنگ کرتی ہوں۔ ہمیشہ آپ کو برا سمجھتی ہوں۔'' عبدالہادی اسے یوں روتے پا کر بے طرح پریشان ہوا تھا۔

''نہیں بالکل نہیں، بلکہ مجھے اندازہ ہوتا ہے۔ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو۔'' اس کے بال چہرے سے ہٹا کر وہ کتنی رسانیت سے کہہ رہا تھا۔ علیزے کے چہرے پر خفت کا رنگ چھانے لگا۔

''وہ اتنے جھوٹ کیوں بولتی ہے؟''

''اس بات کو چھوڑ دو۔ ہر کسی کی اپنی فطرت ہوتی ہے۔'' عبدالہادی نے نرمی سے اسے تھپکا۔

''مجھے آپ پر شک نہیں کرنا چاہیے تھا عبدالہادی!''

''اب اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے تو پچھلی باتوں کو فراموش کر دینا بہتر ہے۔ یہ بتاؤ کچھ کھاؤ گی؟'' وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ علیزے نے گہرا سانس بھرا۔

''میں لاتی ہوں کچھ۔'' وہ اٹھنے کو تھی جب عبدالہادی نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

''تم نہیں، میں لاتا ہوں۔'' وہ مسکرا دیا تھا۔

علیزے کو اس کی اعلیٰ ظرفی پر رشک آنے لگا۔

''آپ ملازمہ سے کہہ دیں نا پلیز!'' وہ شرمندہ ہوئی۔

''ٹائم دیکھو ذرا...... ایک بج رہا ہے رات کا۔ سب سو گئے ہوں گے، ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں۔'' بستر چھوڑ کر وہ اپنے سلیپر پہن رہا تھا۔ علیزے اُسے دیکھے گئی۔

''جب تک میں واپس آتا ہوں۔ تم بس ایک کام کرنا پلیز!'' وہ اس کی نظروں کو محسوس کر کے سنجیدگی سے بولا تھا۔ علیزے کی نگاہوں کا انداز سوالیہ ہوا تو وہ مسکراہٹ دبا کر آنکھ مارتے ہوئے بولا تھا۔

''ہمارے بچے کا نام سوچنے کا مشکل کام، یہ کام تمہیں ہی کرنا ہے۔'' علیزے بری طرح جھینپی تھی۔ عبدالہادی ہنستا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ لیزا نے پھر ان کے آشیانے کو آگ لگانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ علیزے نے اس کی باتوں میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی ڈلیوری میں چند دن تھے۔ عبدالہادی اسے اُمِ جان کے پاس بھیجنا چاہتا تھا۔ جبکہ وہ اس کے بغیر جانے پر آمادہ نہیں تھی۔

''میں اتنے دنوں کے لیے اب نہیں جا سکتا ہوں علیزے! یہاں مسجد کی امامت میری ذمہ داری ہے۔ پھر مدرسہ کا اصل چارج بھی میں سنبھال رہا ہوں۔'' وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ علیزے نے گہرا سانس بھرا۔

''میں آپ کے بغیر اتنے دن وہاں کیسے رہوں گی۔ بتائیں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو اتر رہے تھے۔

''یہ ایک بات سننے کو میں نے برسوں انتظار کی صلیب پر کاٹ دیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ خواہش پوری ہوگئی۔'' عبدالہادی بہک اٹھا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر چوما اور شوخی سے بولا۔

''اس کے باوجود آپ پر اثر نہیں ہوا۔ بہتر تھا میں نہ ہی کہتی۔'' وہ سخت چڑی تھی۔ عبدالہادی بوکھلا اٹھا۔

''میری جان! میری جان! میں آ جاؤں گا ناں وہاں۔ ہمارے بیٹے کو تو آنے دیں۔'' اس نے مسکراہٹ دبائی۔ نظروں کا انداز شوخ تھا۔

''بیٹا نہیں بیٹی! میں نے ہر ہر لمحہ اللہ سے بیٹی کی گزارش کی ہے۔'' وہ بے اختیار بولی۔ عبدالہادی کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''اوہ...... اوہ ہاں بالکل بیٹی! اللہ آپ کی خواہش پوری فرمائے آمین۔'' معاً کچھ یاد آنے پر چونکا۔

''ارے...... تم نے نام کیا سوچا۔ کبھی بتایا ہی نہیں مجھے۔''

''قدر' بتایئے کیسا نام ہے؟'' اس نے فخر سے گردن اکڑالی۔ عبدالہادی مبہوت سا ہو کر اسے تکنے لگا۔ اس روپ میں وہ مزید کھل اٹھی تھی۔ یوں جیسے بہار اپنے جوبن پر آ گئی ہو۔ اس کا شباب ایسے ہی عروج پر تھا۔

''ماشاء اللہ! بہت پیارا نام ہے۔ اللہ نصیب بھی اچھا کرے آمین۔'' وہ مسکرایا تھا۔ علیزے مسحور سی ہوتی آنکھیں بند کر گئی۔

''میں اسے دیکھ سکتی ہوں عبدالہادی! وہ حوروں کی طرح مقدس، پریوں جیسی حسین ہے۔ وہ یہی نام ڈیزرو کرتی ہے ناں؟''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ آمین۔'' عبدالہادی کی مسکان اس کے تاثرات کی طرح نرم تھی۔

''تم تیار ہو جاؤ۔ عبدالغنی بھائی بس پہنچتے ہوں گے تمہیں لینے کو۔ کھانے کا انتظام میں دیکھ لوں گا۔ بہت اصرار کیا تھا کہ اک رات رُک جائیں۔ مانے نہیں، کہتے ہیں ضروری میٹنگ ہے کل اُن کی۔'' اس کے لہجے میں عبدالغنی کے لیے ہمیشہ کی طرح احترام اور عقیدت تھی۔ علیزے نے سر اثبات میں ہلایا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عبدالہادی کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

''لیزے بو! کہاں چلی گئی تھیں آپ؟'' عبدالعلی بار بار ایک ہی سوال کر رہا تھا اور علیزے کا خون اسی حساب سے بڑھتا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں فخر اور محبت لیے وہ عبدالعلی کو خود سے چپکائے بیٹھی تھی۔

''ہادی انکل مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔ وہی چھین کر لے گئے تھے نا آپ کو ہم سے۔ حالانکہ آپ تو اتنا رو بھی رہی تھیں۔'' وہ منہ بسور کر کہتا اس کی شادی کا حوالہ دے رہا تھا۔ اسے ڈھائی پونے تین سال پرانی بات بھی ازبر تھی۔

''ماشاء اللہ! بہت ذہین ہے میرا بیٹا!'' علیزے کی آنکھوں میں تفاخر پھیل گیا۔ باقی سب مسکرائے جا رہے تھے۔

''اب اگر وہ آپ کو لینے آئے تو میں ہرگز نہیں جانے دوں گا آپ کو بو جانی۔'' عبدالعلی نے حتمی فیصلہ دے دیا۔ علیزے نے جھک کر والہانہ پیار کیا تھا اسے۔

''ایسا ظلم تو نہ کرنا میرے چاند...... اب تو تمہاری بو کو جا کے ان سے محبت ہوئی ہے۔'' لاریب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

''واقعی بو جانی آپ ان سے محبت کرتی ہیں؟ جیسی میں اتباع گڑیا سے کرتا ہوں؟'' وہ خاصی ناگواری سے پوچھ رہا تھا۔

''نہیں خیر یہ وہ والی محبت نہیں ہے۔ تھوڑی مختلف ہے۔ جیسی آپ کی اماں آپ کے بابا جانی سے کرتی ہیں۔'' اب کے عبیر نے ٹکڑا لگایا تھا۔ ایک بار پھر سب ہنس پڑے۔ علیزے بلش کر گئی تھی۔

''کچھ تو خیال کریں آپ خواتین...... بچے کا ذہن اُلجھانے والی باتیں کر رہی ہیں۔'' وہ خفا خفا سی

بولی۔ لاریب نے گردن اکڑالی تھی۔
''ہاں بھئی! میں تو کرتی ہوں اس کے بابا جانی سے محبت...... تم اپنی سناؤ۔ تم نے کبھی اظہار نہیں کیا...... تمہارے شاہ سے نہ پوچھ لیں کسی دن؟'' لاریب کی شرارت پر گویا چھت اڑنے والی ہوگئی تھی قہقہوں کی برسات سے۔ اندر آتا عبدالغنی ٹھٹک گیا۔
''افوہ...... کیا ہوگیا بھئی......'' وہ نرمی سے ٹوک رہا تھا۔
''آپ کا ہی ذکرِ خیر چل رہا ہے جناب! ہم عبیر سے پوچھ رہے ہیں آپ نے اپنے شاہ صاحب سے کتنی محبت کی......؟ کھلتی ہی نہیں۔ چلیں آپ بتادیں۔ محترمہ آپ کے سامنے بھی اظہار کرتی ہیں یا نہیں؟'' لاریب مجال ہے جو دبلی ہو۔ اسی طرح شرارت کو طول دیے گئی تھی۔ عبدالغنی کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔ اس نے اک نظر عبیر کو دیکھا۔ جس کی رنگت بے تحاشا سرخ پڑ رہی تھی۔
''بچوں کا کچھ خیال کریں بیگم صاحبہ! بڑے ہورہے ہیں۔'' عبدالغنی نے لاریب کو ٹوکا تھا۔
''یہ لحاظ ہر وقت آپ جو کرتے رہتے ہیں۔'' وہ چڑی۔ عبدالغنی گہرا سانس بھر کے اس کے مقابل بیٹھ گیا۔
''کیسی طبیعت ہے لیزے گڑیا!''
''یہ ابھی بھی گڑیا ہی ہے؟ حالانکہ خود گڑیا والی ہورہی ہے اب تو۔'' لاریب کا موڈ کچھ زیادہ ہی خوشگوار تھا۔ پھر نیا شگوفہ چھوڑا۔ عبدالغنی کو مسکراہٹ ضبط کرنا دشوار ہونے لگا۔
''ماشاء اللہ! بہت خوش ہیں آپ۔'' وہ اب براہِ راست لاریب کو تک رہا تھا۔
''بھئی میری بہو دنیا میں آنے والی ہے۔ خوش کیوں نہ ہوں گی۔ آپ بس ہیرے کی انگوٹھی تیار رکھیں۔'' وہ ہنس رہی تھی۔ جبکہ عبدالغنی اور علیزے دونوں ضرور شرمندہ ہوگئے تھے۔ علیزے نے تو باقاعدہ اسے آنکھیں بھی دکھائی تھیں۔ مگر اس پر مجال ہے اثر ہوا ہو۔
''عبدالعلی میرے چاند اِدھر تو آؤ ذرا۔'' اس نے عبدالعلی کو پکارا جو ہنوز علیزے کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہوا تھا۔ ماں کی پکار پر اُٹھ کر اس کے نزدیک آگیا۔
''بیٹے ذرا بتاؤ۔ قدر کیسا نام ہے؟'' اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔
''نام تو یونیک ہے اماں! آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟''
''تمہاری......''
''لاریب!'' عبدالغنی نے اسے مزید کچھ کہنے سے ٹوکا اور آنکھیں دکھائیں۔ لاریب نے ٹھنڈا سانس بھرلیا۔
''آپ بھی نا عبدالغنی! خوش ہی ڈھنگ سے نہیں ہونے دیتے۔'' وہ منہ بسورنے لگی پھر سر جھٹک کر عبدالعلی کو دیکھا۔ جو منتظر تھا اور کچھ حیران بھی۔
''اچھا بیٹے آپ بتاؤ۔ اک اور گڑیا ہمارے گھر آئے تو اس کا یہ نام رکھ دیں؟''
''اک اور گڑیا؟'' عبدالعلی نے ناک چڑھالی۔
''ہمیں نہیں چاہیے اماں کوئی مزید گڑیا! ایک اتباع اور ایک امن ہے نا۔ بس کافی ہیں۔'' اس کا انداز بے زار کن تھا۔ علیزے کے چہرے پر یکدم تغیر پھیل گیا۔ اس نے گھبرا کر لاریب کو دیکھا جو عبدالعلی کو گھور رہی تھی۔
''یہ والی گڑیا جو ہے نا وہ لیزے بو کی ہوگی۔ امن بریرہ بو کی ہے۔ اتباع اپنی تو آنی چاہیے ناں؟'' اس نے سمجھانا چاہا تھا۔ عبدالعلی نے بے دلی سے سراثبات میں ہلادیا۔
''چلیں ٹھیک ہے۔ پھر آجائے۔''
''نام تو اچھا لگا نا آپ کو؟'' لاریب نے مسکراہٹ دبائی۔ وہ پتا نہیں کیا سننا چاہتی تھی۔
''نام تو یونیک ہے مما! مگر مجھے گڑیا اچھی نہیں

لگے گی۔ کہا نا میں تو اتنی......'' وہ بسورا۔ اب کے علیزے کے ساتھ لاریب کا بھی رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے کھسیا کر عبدالعلی کو ایک لگا دی تھی۔

''بدتمیز جاؤ یہاں سے۔'' وہ تڑخی۔ عبدالغنی گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

''ابھی تک بچی ہو تم بھی لاریب!'' لاریب نے ناراضی سے اسے دیکھا تھا۔

''یہ بالکل برعکس ہے عبداللہ کے۔ اسے دیکھیں کیسے دیوانہ ہے۔ اتباع کا اور یہ......''

''یہ فضول اور بے جا باتیں ہیں لاریب! بچوں کی معصومیت سے نہ کھیلو پلیز!'' وہ اب خفا ہوا تھا۔ لاریب کو خاموش ہونا پڑا۔ عبدالغنی کی بات غلط نہیں تھی۔ وہ قائل ہوئی تھی، بھلے اظہار نہیں کیا۔

☆......☆......☆

وہ واقعی قدر کہلانے کی حقدار تھی۔ جس کا اتنا انتظار ہوا تھا۔ وہ اتنی معصوم تھی۔ اس قدر پیاری کہ ہر دیکھنے والی نگاہ نے بے ساختہ اسے سراہا تھا۔ علیزے کی دعاؤں کی بازیابی ہوئی تھی اور وہ کسی حور پری سے مشابہہ بچی دنیا میں آ گئی تھی۔ جس کے نصیب کے متعلق کسی کو بھی آگاہی نہیں تھی۔ خوش تو سب ہی تھے۔ مگر علیزے کا تشکر تو انوکھا ہی تھا۔ وہ بار بار روتی تھی اور روتے ہوئے مسکرانے لگتی۔

''مجھے اللہ سے اور کیا چاہیے ہے عبدالہادی! اُس نے مجھے کل کائنات عطا فرما دی ہے جیسے۔'' وہ بھیگی آنکھوں سے بچی کا گلابی چہرہ دیکھتی ہوئی بھیگتی آواز میں بولی تو عبدالہادی بھی مسکرا دیا تھا۔

''عبدالعلی بیٹے! اِدھر آؤ جان!'' علیزے نے عبدالغنی کے پیچھے چھپے دور دور سے جھانکتے عبدالعلی کو پکارا۔ جو آج اس کے قریب نہیں آ رہا تھا۔

''جی بوجانی۔'' وہ قدرے جھجکتا ہوا فاصلے پر رُک گیا۔

''یہ دیکھو...... یہ گڑیا پیاری ہے ناں؟'' اس کی آنکھوں میں خوشی روشنی کی صورت جگمگا رہی تھی۔

''جی بوجانی! اماں کہہ رہی تھیں یہ آپ کی بیٹی ہے۔ تو اس وجہ سے مجھے اچھی لگ رہی ہے۔ وہ خاصے تدبر سے بولا تھا۔

''اتنا ڈپلومیٹک جواب......'' عبدالہادی ہنسنے لگا۔

''ہمارا بیٹا بہت سمجھدار جو ہے۔ اور اپنی بوجانی سے محبت بھی بہت کرتا ہے۔'' عبدالغنی نے محبت سے کہتے عبدالہادی کا سر چوما۔

''اسے گود میں لو۔ دیکھو تو کتنی پیاری ہے۔'' لاریب نے بچی کو اٹھا لیا تھا۔

''نہیں اماں! گر جائے گی مجھ سے تو چوٹ لگ جائے گی۔'' وہ آگے نہیں بڑھا۔ انداز میں گریز تھا۔

''نہیں گرتی بھئی! آپ اتنے چھوٹے بھی نہیں ہو۔'' لاریب کا اصرار جاری تھا۔ ہمت نہیں ہاری۔

''لیکن یہ بہت چھوٹی ہے ناں اماں!'' وہ جھنجلایا۔

''لو بھئی میرا بیٹا اتنا کیئرنگ ہے کہ اس خوف سے نہیں پکڑ رہا تمہاری بیٹی!'' لاریب ہنسنے لگی تھی۔

''افوہ! بوجانی مجھے دیں۔ میں پکڑ لوں گا۔ بالکل نہیں ڈرتا عبدالعلی کی طرح، نہ ہی گراؤں گا اس والی ڈول کو بھی۔'' عبداللہ جوش میں آ کر تیزی سے آگے ہوا تھا۔ لاریب نے مسکرا کر اس کا گال سہلایا۔

''نہیں بیٹے! یہ والی گڑیا تو ہم صرف عبدالعلی کو دیں گے' یہ اس کی ہے۔ آپ کی نہیں۔'' لاریب کو مسلسل شرارت سوجھ رہی تھی۔ عبدالغنی کسی کام سے باہر گیا تھا۔ اب وہ کھل کر اس بات کو طول دے سکتی تھی۔

''تو پھر آپ اتباع کو ساتھ لے آتیں۔ میں اسے تو اٹھا سکتا تھا ناں۔'' عبداللہ نے منہ بسور لیا۔ جبکہ عبدالعلی کے کان اس بات پر کھڑے ہو گئے تھے۔

''میں نہیں لے رہا ہوں یہ والی گڑیا اماں' اور کل

تو آپ کہہ رہی تھیں یہ لیزے بو کی گڑیا ہے۔ ہماری نہیں، اب......''

''عبدالعلی...... چپ ہو جاؤ۔'' لاریب زور سے چلائی۔ عبدالعلی ماں کی دھاڑ پر دہل گیا تھا۔ سہم کر اسے تکنے لگا۔

''بھابی پلیز! کیا ہو گیا ہے؟'' عبدالہادی نے گھبرا کر کہا اور عبدالعلی کو انگلی سے پکڑ کر تیزی سے باہر لے گیا۔ علیزے کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ بریرہ ساکن بیٹھی تھی۔ لاریب نے ہی آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگایا تو وہ بے ساختہ سسکنے لگی تھی۔

''میں نے کہا تھا ناں لاریب! بچوں کے ذہن......''

''کیوں معصوم بچے کی بات کو دل پر لے رہی ہو۔ چندا کیا ہو گیا ہے؟ ابھی وہ بڑے نہیں ہوئے۔'' بریرہ نے عاجز ہو کر ٹوکا تھا۔

''بجو مجھے عبدالعلی کے رویے سے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ باقاعدہ آنسو بہانے لگی۔

''خوامخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ ہم بچوں کی پرورش اس انداز میں کریں گے کہ اُن کے ذہنوں میں اپنے یہ خیال اور خواہش پختہ کر دیں گے۔ دعا کریں گے کہ اللہ انہیں ایک دوسرے کی محبت نصیب کرے۔'' لاریب جس پل پورے جذب اور صدق سے کہہ رہی تھی۔ عبدالغنی نے اسی وقت اندر قدم رکھا تھا۔ اور گہرا متاسفانہ سانس بھر کے رہ گیا۔

''بیوقوفی کی کوئی حد بھی ہوتی ہے خواتین! میں ہرگز اجازت نہیں دے سکتا آپ کو اس حماقت کی...... براہِ کرم بچوں کے ذہن آلودہ کرنے کی کوشش مت کریں۔ اور آج کے بعد میں یہ تذکرہ بچوں کے سامنے نہ سنوں۔ آپ لوگوں کی یہ خواہش ہے تو دعا کریں اللہ سے وہ بہتر ہے دلوں میں گنجائش نکالنے والا۔ ورنہ آپ کا پہلا عمل ہرگز بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکالے گا۔''

عبدالغنی کا انداز اتنا دوٹوک، اس قدر قطعیت لیے تھا کہ لاریب اور علیزے تمام تر اختلاف رکھنے کے باوجود اک لفظ بولنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ بریرہ البتہ مطمئن نظر آ رہی تھی کہ وہ اس معاملے میں عبدالغنی کی ہی حامی تھی۔

☆......☆......☆

قدر دو ماہ کی تھی جب علیزے کو لینے آیا تھا عبدالہادی واپس گھر لے جانے کو۔ علیزے اس روز بے حد بے قرار نظر آتی تھی۔ عبدالغنی کی اس روز کی تنبیہ کے بعد واقعی کسی کی جرأت نہ ہو سکی تھی کہ اس موضوع پر کوئی بات کرتا۔ وہ بھی بچوں کی موجودگی میں، علیزے کی بے چین اور اضطراب کی اصل وجہ بھی یہی تھی۔

''ایسے کیوں بیٹھی ہو لیزے! بغیر کسی تیاری کے؟ جانے کو دل نہیں کر رہا؟'' عبدالہادی نے سوئی ہوئی قدر کو پیار کرتے ہوئے پلٹ کر قدرے حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ مضمحل لگتی تھی۔

''یار مانتا ہوں تمہارا دل یہاں لگ گیا ہے۔ مگر میرا بھی تو کچھ خیال کرو۔'' عبدالہادی نے اس کا ہاتھ باقاعدہ پکڑ کر توجہ حاصل کی۔ علیزے نے گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر یاسیت سے بولی تھی۔

''آپ بھائی سے بات کریں عبدالہادی! میں ایسے یہاں سے نہیں جاؤں گی۔'' وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی تھی۔ عبدالہادی پریشان ہونے لگا مگر مطالبہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

''کیا بات؟ میں سمجھا نہیں؟'' وہ کتنا حیران تھا۔

''اگر عبداللہ کی نسبت ایک دن کی اتباع سے طے ہو سکتی ہے تو پھر ہماری بیٹی کی کیوں نہیں؟'' اس کے آنسو پلکوں سے گالوں پر اتر آئے۔

''لیزے!'' عبدالہادی کو یہ بات بہرحال ناگوار محسوس ہوئی تھی۔ جبھی بے اختیار جھڑک ڈالا۔ علیزے کے آنسو تواتر سے بہنے لگے۔

''مجھے ہر قیمت پر عبدالعلی چاہیے عبدالہادی! ورنہ یہ فکر یہ دکھ میری جان لے لے گا۔ خدارا بھائی کو قائل کر لیجیے۔'' اس کی ہچکیاں بندھنے لگیں۔ عبدالہادی جتنا بے بس ہوا اس قدر غصے میں بھی آ رہا تھا۔

''تم نے خوامخواہ ایک بات کو اعصاب پر سوار کر لیا ہے لیزے! پاگل مت بنو اور یہ بھی نہ بھولو کہ تم ایک بیٹی کی ماں ہو۔ سمجھیں؟'' اسے جو غصہ آیا تھا۔ اس نے اسے دبانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''عبدالہادی پلیز!'' وہ اور شدتوں سے رونے لگی۔

''فضول ضد نہیں لیزے! اور اب اٹھو گھر چلنے کی تیاری کرو۔ میں تمہیں مزید حماقت کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' عبدالہادی کو اس پر واقعی غصہ آنے لگا تھا۔ حد تھی بچکانہ سوچ کی بھی۔ عبدالغنی جو کسی کام سے جا رہا تھا اور جانے سے قبل ان سے ملنے آیا تھا کہ واپسی میں تاخیر ہو جانی تھی۔ یہ ساری گفتگو بغیر کسی اہتمام کے سُن چکا تھا۔ اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں ایک لمحے کو بند کی تھیں، اسے لاریب کی وہ ساری بات یاد آئی جو اس نے علیزے کے اس کیفیات کے متعلق تب کہہ سنائی تھیں جب علیزے کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی اور مذاق میں عبدالعلی کی نسبت امن سے طے کرنے کی بات ہوئی تھی۔

''مت ڈانٹو عبدالہادی میری کانچ کی گڑیا کو...... بہت نازک ہے۔ مجھے ڈر ہے ٹوٹ نہ جائے۔'' وہ بوجھل آواز میں بولا تھا۔ دونوں نے بے ساختہ چونکتے پلٹ کر دیکھا۔ عبدالغنی متغیر چہرے کے ساتھ دروازے میں کھڑا تھا۔

''بھائی معذرت مگر میں......'' عبدالہادی بوکھلا اٹھا۔ علیزے اُٹھ کر بھاگتی ہوئی عبدالغنی سے لپٹ گئی تھی۔ اس کے رونے میں شدت آنے لگی۔

''عبدالعلی کو مجھے دے دیں بھائی! وہ بس میرا ہے۔ اس کو پانے کی خاطر میں نے اللہ سے قدر کو مانگا ہے۔'' وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ عبدالہادی لب بھینچے کھڑا تھا۔ عبدالغنی نے نرمی سے اس کا سر سہلایا خود سے الگ کر کے بھیگے گال پونچھے۔

''مجھے معاف کر دو لیزے! انجانے میں دل دکھا گیا تمہارا۔ عبدالعلی صرف تمہارا ہے۔ کہو تو اسے ساتھ بھیج دوں تمہارے۔'' وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کا دل بہت بڑا تھا وہ سب جانتے تھے۔ وہ ہر قربانی دے سکتا تھا علیزے کو معلوم تھا۔

''نہیں بھائی! وہ آپ کا بازو ہے۔ میں آپ سے الگ نہیں کرنا چاہتی۔ بس میری تسلی کے لیے اس کی نسبت قدر سے کافی ہے۔ یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گی آپ کا۔'' علیزے نے اس کا ہاتھ تھام کر عاجزی سے کہا تھا۔ عبدالغنی نے گہرا سانس بھرا پھر مسکرانے لگا۔

''مجھے آج بہت ضروری کام سے جانا ہے عبدالہادی! واپسی پر قوی امید ہے رات ہو جائے گی۔ آج ٹھہر جائیں آپ لوگ، کل انشاء اللہ العزیز ہم اپنے بچوں کا عقد کرنے کے بعد آپ کو رخصت کریں گے۔'' اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے علیزے پر شادیٔ مرگ طاری کر دی تھی۔ جبکہ عبدالہادی بھونچکا کھڑا رہ گیا تھا۔

''عقد......؟ یعنی نکاح......؟'' وہ ششدر تھا۔ عبدالغنی نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ انداز میں اطمینان بھرا ہوا تھا۔

''ہاں نکاح...... میں علیزے کو بھرپور اور مکمل خوشی سے ہمکنار کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اس کا ہر دھڑکا، ہر خوف ختم ہو جائے۔ اللہ کرے خیریت اور خوشیوں کا وسیلہ ہو۔ آمین۔'' وہ علیزے پر پیار بھری نگاہ ڈال کر مسکرایا۔ پھر عبدالہادی کا کاندھا تھپکا۔

''میں اُمِ جان اور بابا جان کی رضا مندی حاصل کر لوں۔ میرا خیال ہے آپ کو بھی اعتراض

نہیں ہوگا؟'' عبدالغنی کی بات پر عبدالہادی نے سٹپٹا کر سر کو نفی میں جنبش دی تو عبدالغنی مسکراتا ہوا پلٹ گیا۔ عبدالہادی ہنوز گم صم اور غیر یقین کھڑا تھا۔

''دیکھا آپ نے......؟ بھائی جان کتنی محبت کرتے ہیں مجھ سے؟'' علیزے نے گردن اکڑا کر تفاخر سے کہا تھا۔ عبدالہادی چونک کر اسے تکنے لگا۔ انداز میں بے خیالی آنکھوں میں تشویش تھی۔

''لیزے! میں اتنے چھوٹے بچوں کے ایسے رشتے کا قائل نہیں ہوں مگر تمہاری خوشی کی خاطر یہ قدم اٹھانا پڑا ہے۔ تم اتنی ہی عزیز ہو مجھے...... دعا کرنا اب یہ رشتہ، یہ تعلق ہماری، ہمارے بچوں کی ہمہ وقت خوشی اور تسلی کا باعث بنے آمین۔''

''ثم آمین۔'' علیزے نے پورے جذب سے کہا اور جا کر کاٹ میں بے خبر سوئی ہوئی قدر پہ جھک کر اسے والہانہ پیار کیا تھا۔

''مجھے ہرگز کوئی شک نہیں رہا ہے اب...... کہ میری بیٹی بہت خوش نصیب ہے۔'' وہ ہنس رہی تھی۔ عبدالہادی نے گہرا سانس کھینچا۔

''یہ یقین اللہ پر رکھو لیزے!'' وہ تصحیح کر رہا تھا۔

''ہاں ہاں! اللہ پر ہی ہے۔'' علیزے نے فی الفور تائید کر لی تھی۔

☆......☆......☆

''ایک تو ہمارے صاحب بھی ہمیشہ ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں۔ بتائیں اتنی عجلت میں فیصلہ صادر کیا کہ حد نہیں، ارے کم از کم بھی ایک ہفتہ تو ٹھہرتے۔ میں بچی کے لیے لہنگا، شرارہ، غرارہ اپنے ہاتھ سے تیار کرتی۔ سو ارمان ہوتے ہیں دل میں۔ جیولری میں رنگ اور پازیب تو بنوا ہی لیتی۔ مگر اب کیا ہو؟''

لاریب رات سے ہی بولائی بولائی پھر رہی تھی پورے گھر میں، خوشی اتنی تھی کہ پیر زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ جس کا اظہار کچھ یوں بھی ہو رہا تھا کہ جانے کتنی بار علیزے قدر اور عبدالعلی کو لپٹا لپٹا کر پیار کر چکی تھی۔ جہاں تک بات علیزے اور قدر کی تھی تو ٹھیک تھا کہ ایک سرے سے انجان، بے خبر دوسری اسی جیسی البیلی خوشی سے ہمکنار تھی۔ عبدالعلی البتہ اس خصوصی محبت کے مظاہروں پر ضرور عاجز نظر آ رہا تھا۔ کچھ بڑا بچہ ہونے کی بدولت مزاج میں نزاکت بھی تھی۔ پورے پانچ سال اس نے تن تنہا ماں باپ اور دادا دادی کا پیار وصول کیا تھا۔ علیزے سے ناز اٹھوائے تھے تو حکمرانی اور من مانی بھی مزاج کا حصہ تھی۔ کچھ تھا بھی ذرا بے لحاظ، ہر بات منہ پر بولنے کا عادی تھا۔ چونکہ بے تحاشا لاڈلا تھا، جبھی کسی نے برا ہی نہ مانا۔ الٹا اس کی باتوں پر حظ اٹھایا جاتا۔ خوش ہوا جاتا۔ ایک عبدالغنی تھا جسے اس کی تربیت کا خیال ہر دم رہا کرتا تھا۔ باقیوں کو تو پیار سے فرصت نہیں تھی۔ بابا جان جو اولاد کے معاملے میں اچھے خاصے اصولوں اور قواعد وضوابط کے پابند تھے۔ لاڈلے پوتے پر آ کر جیسے سب قوانین بھلا چکے تھے۔ امِ جان تو خیر اس کی کوئی بات ٹالنا گناہ سمجھتی تھیں۔

''افوہ اماں جان! آپ کو آخر آج مجھ پر کیوں اتنا پیار آ رہا ہے۔ اور یہ تیاریاں کیسی ہیں؟'' کیا عبدالاحد کی بسم اللہ ہوگی اب؟'' اسے پانچ سال پہلے ہونے والی اپنی بسم اللہ کی تقریب یاد تھی۔ جب وہ خود تین سال کا تھا۔

''نہیں میرے پسر! یہ ہم آپ کی چھوٹی سی شادی کریں گے۔ جس میں دولہا بنیں گے آپ۔'' لاریب نے اسے لپٹا لیا تھا۔

''میں دولہا بنوں گا۔'' جیسے اسفر چاچو بنے تھے؟'' اس نے عبدالغنی کے کزن کا حوالہ دیا، جس کی شادی دو سال پہلے ہوئی تھی۔

''ہاں بالکل......'' لاریب اس کی ذہانت پر نہال ہو کر مسکرائی۔

''پھر تو دلہن بھی ہوگی میری؟'' وہ یکدم اچھلا۔
''وہ مہندی بھی لگائے گی۔ پھول پہنے گی۔ فراک پہنے گی۔ جیسے اسفر چاچو کی دلہن نے سب پہنا تھا؟''
اس کا اشتیاق دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ معصومیت حد سے سوا لاریب نے ہنستے ہوئے اسے لپٹا لیا۔
''سب لوازمات پورے ہوں گے میری جان! کیوں فکر کرتے ہو'' اس کی شوخی نقطہ عروج پر جا پہنچی۔
''مگر دلہن بنے گی کون اماں! کیا اسفر چاچو کی ہی دلہن میری بھی دلہن ہوگی؟'' عبدالعلی کی اُلجھن اس کی آنکھوں سے چھلکنے لگی۔
''ارے...... ہم کیوں اپنے شہزادے کو پرانی دلہن دینے لگے۔ بالکل فریش اور نئی دلہن ملے گی آپ کو، فکر ناٹ جانی۔'' وہ اسے شیروانی پہنا رہی تھی۔ عبدالعلی نے خوش ہو کر خود کو قد آدم آئینے میں دیکھا۔
''نئی اور فریش دلہن کہاں سے ملتی ہے اماں؟''
اس کا معصومانہ سوال سُن کر لاریب نے قہقہہ لگایا تھا۔
''گھر پر ہی دستیاب ہے۔ لیزے بو کی بیٹی ہے نا قدر...... وہ بنے گی آپ کی دلہن۔''
''وہ......'' عبدالعلی کا سارا جوش و خروش اور اشتیاق ماند پڑ گیا۔
''وہ تو اتنی اچھی بھی نہیں لگی مجھے اور ہے بھی اتنی چھوٹی...... اماں وہ دلہن کیسے بنے گی؟''
''صوفے پر میرے ساتھ بیٹھے گی کیسے؟'' وہ بسورنے لگا تھا۔
''دلہن اسے اس کی ماما بنا دیں گی جانی! وہ صوفے پر نہ بیٹھ سکی تو آپ گود میں لے لینا اسے۔''
لاریب کی تجویز عبدالعلی کو ایک آنکھ نہ بھا سکی۔
''ہرگز نہیں۔ میں اتنی چھوٹی دلہن نہیں لوں گا۔ اسفر چاچو کی دلہن تو اتنی بڑی تھی۔ انہوں نے اسے گود میں بھی نہیں لیا تھا۔ پھر میں کیوں لوں؟'' وہ چیختا اور پیر پٹخنے لگا۔ موڈ بے تحاشا خراب ہو گیا تھا۔

''چلو ٹھیک ہے میری جان! آپ بڑی دلہن لے لینا مگر بڑے ہو کر۔ ابھی آپ بس یہ جوتے پہنو۔'' وہ اسے بہلانے لگی۔ جو کہ وہ مشکل سے بہل سکا۔
''کتنے بڑے ہو کر......؟ جتنے بڑے اسفر چاچو تھے؟''
''ہاں بالکل......'' لاریب نے اس کا گال سہلایا۔
''کیوں؟ آپ نے تو ابھی مجھے دلہن دینے کا کہا تھا۔ میں کیوں اتنا ویٹ کروں۔'' وہ پھر پاؤں پٹخنے لگا۔ اس کا موڈ خوشگوار نہ ہو سکا۔ ایسے ہی نکاح ہوا تھا۔ ایسے ہی عبداللہ نے تصویریں بنائیں۔ وہ اتنا چھوٹا بچہ تھا۔ مگر بلا کا ایکٹو تھا۔ اسے لیپ ٹاپ چلانا آتا تھا۔ وہ تصویریں بناتا تھا۔ یہاں بھی سب کے منع کرنے کے باوجود اس نے کتنے پوز لے لیے تھے۔ پھر خود اینٹھ کر بیٹھ گیا۔
''ماما! عبدالعلی اتنا پیارا لگ رہا ہے شیروانی میں۔ آپ نے مجھے کیوں دولہا نہیں بنایا؟ چھوٹی سہی مگر مجھے بھی دلہن چاہیے۔'' وہ گلا پھاڑ رہا تھا۔ ایک نیا شغل شروع ہو گیا۔ بچے خفا' بڑے عاجز تھے۔ ایک دلہن لے کر بسور رہا تھا۔ دوسرا نہ ملنے پر خفا' مگر اس کے باوجود اس شب شاہ ہاؤس میں خوشیاں برستی رہیں۔ بالآخر عبداللہ بھی بہل گیا اور عبدالعلی بھی، عبدالعلی اس لیے کہ سلامی کے نام پر اس کے پاس ڈھیروں گفٹ اور روپے جمع ہو گئے تھے اور عبداللہ اس لیے کہ اتباع کو اس کی دلہن بنانے کا وعدہ اس کے پپا نے اسے دے دیا تھا۔

☆......☆......☆

بہت صبر کے باوجود آنسو قطرہ قطرہ آنکھوں سے ٹپکتے تھے اور گریبان بھگو رہے تھے۔ گود میں دھرے ہاتھوں کو نمی بخش رہے تھے۔ ساتھ اتنا طویل تھا۔ محبت اس قدر گہری تھی کہ ضبط کے بند ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ ہر سو ان کی یادیں بکھری تھیں۔ جس طرف بھی نگاہ اٹھتی۔ کوئی نا کوئی یاد دامن پکڑ کر انہیں

روک رہی تھی۔

''جب تک انسان کو ٹھوکر نہ لگے۔ جب تک انسان گھٹنوں کے بل نہ گرے۔ اپنی اوقات کا پتا بھی نہیں لگتا ہے میرے بیٹے!'' ان کی آواز ان کی سماعتوں میں اتری تھی اور ہچکیاں بندھنے لگیں۔ عبدالہادی نے ہجرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ ایک لمحے کو یوں لگا چاچو سامنے ہی تو بیٹھے ہوں۔ وقت پچیس سال پیچھے چلا گیا تھا اس پل اور وہ اک وجد کی کیفیت میں پڑھ رہے تھے۔

جو خمار ہے تیرے عشق کا اسے موت کیسے فنا کرے
وہ تو پہلے موت سے مر گیا تیرے عشق میں جو جیا کرے
میں نے پی ہے تیرے عشق کی نہیں غرض اب جو ہوا کرے
مجھے وصل کی ہے تڑپ اعجاز کوئی زندگی سے جدا کرے

ان کے قدم جیسے لڑکھڑا گئے ان کی آواز ہنوز اطراف میں گونج رہی تھی۔

''ظلم اور برائی کے خلاف جتنی دیر سے اٹھو گے اتنی ہی بڑی قربانی دینا پڑے گی۔ یہ بات انہوں نے تب کہی تھی۔ جب عبدالہادی کو وادی میں جانے اور اپنا کام سنبھالنے کا حکم دیا تھا۔ انہیں وہ لمحہ یاد آیا جب اس کے اپنے پاس آنے اور مسلمان بنانے کی استدعا پر انہوں نے کہا تھا۔

''تم بالکل صحیح مرکز پر پہنچے ہو میرے بچے! دل میں کوئی شبہ بھی نہ لانا! ہماری زندگی میں ہمارے فیصلے کتنے بھرپور انداز میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ فیصلے کا اختیار بیشک ہمیں حاصل ہوتا ہے۔ لیکن...... ہم بہرحال فیصلے اپنی تقدیر کے مطابق ہی کرتے ہیں۔ فیصلہ بھلے ہمارا ہوتا ہے۔ مگر مرضی اوپر والے کی ہی ہوتی ہے۔''

انہوں نے ہونٹ بھیچ کر سسکیوں کا گلا گھونٹا اور ان کے جائے نماز پر ہاتھ پھیر کر گویا ان کا لمس محسوس کرنا چاہا۔ وہ اسی جائے نماز پر بیٹھے ہوئے تھے جب وہ وادی جانے سے قبل ان سے ملنے آیا تھا۔ کتنی خوشی سے انہوں نے رخصت کیا تھا اسے اور خصوصی طور پر تاکید کرنا نہیں بھولے تھے۔

''درویش اور شعبدہ باز میں ایک ہی فرق نمایاں ہوتا ہے میرے بچے کہ درویش کبھی معجزوں، کرامتوں، برکتوں اور مافوق الفطرت و عادات اور محیر العقول واقعات کا پرچار اور اظہار نہیں کرتا۔ خدا کو منائیں تو ایک وقت ایسا آتا ہے جب رب اپنے بندے کی مرضی کو اہمیت ضرور دیتا ہے۔ تم پر وہ وقت آئے تو کبھی راہ سے نہ بھٹک جانا۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ اللہ ہی تمہارا حامی و ناصر ہو۔''

ظہر کی اذان کی پکار ان کی سماعتوں میں اتری تو جیسے چونک کر ماضی سے باہر آئے تھے۔ خود کو سنبھالا اور وضو خانے کی جانب چل دیے مگر یادیں......

گزرے ماہ و سال میں تبدیلیاں ضرور آئی تھیں مگر معمولی...... یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ پہلی بار ان کے روبرو ہوئے تھے۔ کیسی بے قراری تھی۔ ان کے ہر انداز میں انہیں لگا وہی لمحے پھر ان کے روبرو ہیں۔

''کیوں بے قرار ہو بچے! جب تک انسان سے خطا نہ ہو۔ خدا کی طرف سے عطا نہیں ہوتی۔ یاد رکھو۔ خطا جتنی بڑی ہو گی عطا اتنی ہی بڑی ہونے والی ہو گی۔ بشرطیکہ انسان سچے دل سے توبہ کرے۔ بس مایوس ہونا چھوڑ دو۔ مایوسی کی بڑی گھٹائیں ہیں۔ بڑی بے چینیاں ہیں، بڑی پریشانیاں ہیں۔ آدمی روتا رہتا ہے مگر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تم کتنا روئے...... کس قدر تڑپ لیا...... ہے ناں......؟ مگر حاصل وصول کچھ نہیں۔ یہاں مایوسیوں کو جھٹک دو۔ اللہ کے گھر سے لو لگا لو۔ سکون مل جائے گا۔ سب میسر آ جائے گا۔ حالات کیسے بھی ہوں۔ صبر کا دامن چھوڑنا کبھی ناکام نہیں ہو گے۔ اللہ کی رحمت حاصل کرنے کو جدوجہد کرو۔ محنت کرو، جو تلاش کرے گا۔

وہ پالے گا۔ یعنی دروازہ کھٹکھٹالو۔ ضرور ملے گا۔ بس مایوس نہ ہونا۔ دل برداشتہ نہ ہونا۔ اللہ کریم نے اپنے چاہنے والوں کو اپنے ماننے والوں کو بڑی آسانیوں کا وعدہ فرمایا ہے۔ صرف ایک شرط پر کہ متلاشی تلاش نہ چھوڑے۔ منزل حاصل ہو کر رہے گی۔''

''استادِ مکرم! جماعت ہونے والی ہے۔ آپ وضو کر لیجیے۔'' انہوں نے چونک کر اپنی داہنی جانب دیکھا۔ ایک نوعمر طالب علم سفید لباس میں کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی چاچو کا کوئی شاگرد تھا۔ یقیناً انہیں پہچانتا تھا۔ انہوں نے سرد آہ بھری اور آگے بڑھ کر وضو کی مخصوص جگہ پر جا کر سنگِ مرمر کی چوکی پر بیٹھ گئے۔ سنہری ٹونٹی گھما کر نل کھولا اور وضو کرنے لگے۔

کیا ہے مجال میری جو میں کر سکوں عبادت
تو کرائے کوئی سجدہ تیری بندہ پروری ہے
تیرا نام لے کے رونا تیرے در پہ سجدہ کرنا
یہی ہے نماز میری یہی میری بندگی ہے

انہوں نے منہ پر پانی کی اوک بھر بھر کے ڈالی۔ ساتھ آنسوؤں کی نمی بھی بہنے لگی۔ سماعتوں میں ہنوز چاچو کی پُرسوز آواز گونجی تھی۔ وہ جب اسے وضو کرنا سکھاتے تھے۔ بے اختیار یہ اشعار ان کے لبوں پر مچل جایا کرتے تھے۔ اتنی پرانی یادیں آج اتنی تازہ تھیں کہ وہ خود حیران ہو رہے تھے۔ گویا انہی لمحوں میں سانس لے رہے تھے۔

''رحمتِ حق اس شخص کی تلاش میں رہتی ہے۔ جس کی آنکھ پُرنم ہوتی ہے۔'' انہوں نے بے اختیار دیوار کا سہارا لے لیا۔ انہیں لگا وہ یکدم بوڑھے ہو گئے ہوں۔ اس سوز اور اضطراب کی کیفیت میں انہوں نے نماز ادا کی تھی۔ اس کے بعد بھی بہت دیر تک مسجد کے صحن میں بیٹھے رہے۔ انہیں لگ رہا تھا۔ اٹھارہ سال نہیں بیتے، اٹھارہ صدیاں بیت گئی ہیں۔ گزرے ہوئے ماہ و سال میں ان سے سب بزرگ بچھڑ گئے تھے۔ اُمِ جان بابا جان ہارون اسرار کی والدہ بھی اور اب...... اب چاچو بھی یہ صدمہ تو ناقابلِ برداشت تھا۔ جبھی تو وہ بھربھری ریت کی دیوار کی طرح ڈھتے جا رہے تھے۔

''چلیے عبدالہادی! گھر میں سب منتظر ہیں آپ کے۔'' ان کے کاندھے پر مضبوط ہاتھ کا لمس آن ٹھہرا۔ انہوں نے سر اٹھانے سے قبل نم آنکھوں کو رگڑ دیا تھا۔ عبدالغنی اپنی باوقار شاندار شخصیت کے ہمراہ ان کے روبرو تھے۔ گزرتے وقت نے ان کی وجاہت و خوبروئی کو ہی نہیں بڑھایا تھا۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب سی دلکشی اور دل نشینی بھی پیدا کر دی تھی۔ وہ باوقار اور بے حد سحر انگیز تھے۔ صدمات ان پر بھی اترے تھے۔ مگر وہ صبر کی مضبوط دیوار تھے گویا۔

''ہمت سے کام لیجیے! یہ نظامِ قدرت ہے۔ ہم سب کو ایک دن واپس اپنے رب کی پاس جانا ہے۔'' انہوں نے گویا ان کو حوصلہ دینا چاہا تھا۔ عبدالہادی کچھ کہے بغیر اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور گہرا متاسفانہ سانس بھرا۔

''گھر پہنچنے سے قبل خود کو سنبھالیں پلیز ورنہ علیزے کو سنبھالنا ہمیں بہت مشکل ہوگا۔ آپ کو معلوم ہے نا...... اُم جان اور بابا جان کی جدائی کے صدمے کو وہ ابھی تک دل سے قبول نہیں کر سکی۔'' عبدالغنی کی انہیں تکتی نگاہوں میں تشویش تھی۔ عبدالہادی بوجھل دل سے مسکرائے۔

''آپ فکر نہ کریں عبدالغنی بھائی! میں بفضلِ خدا ٹھیک ہوں۔'' عبدالغنی نے جواباً ان کا شانہ تھپکا تھا۔ اور ان کے لیے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیو خود کر رہے تھے۔ گاڑی ہر لمحہ شاہ ولیج کے قریب ہو رہی تھی۔ جہاں اِن کے اہل خانہ اُن کے ہی منتظر تھے۔

(لفظ لفظ مہکتے اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہِ جون میں ملاحظہ فرمائیے)

افسانہ

نگہت اعظمی

آگ کی کہانی

"مجھے فکر یہ ہے کہ اُس میں ایک دم سے یہ تبدیلی کیسے آئی۔" ثمینہ کے لہجے سے بھی فکر مندی جھلک رہی تھی۔ "تبدیلی تو کسی وجہ سے بھی آسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے اِس کے دوست احباب میں کوئی ایسا لڑکا شامل ہوگیا ہو جو زیادہ ہی مذہبی ہو۔" ابرار حسن نے کھانا کھاتے......

حساس موضوع پر لکھا گیا، ایک بہت خاص افسانہ

ابرار حسن ایک بہت سینئر صحافی تھے۔ اُن کی زندگی کا ابتدائی حصہ اخباروں میں کالم لکھتے گزرا تھا۔ جب تک ٹی وی پر چینلز کی بھرمار نہیں ہوئی تھی لوگ اخبار بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ بلکہ بعض لوگوں کی صبح ہی نہیں ہوتی تھی جب تک اخبار اُن کے ہاتھ میں نہ آجاتا۔ اخبارات کی مقبولیت کے باوجود صحافیوں کا معاوضہ اتنا کم ہوتا کہ اُنہیں اچھی زندگی گزارنے کے لیے دن رات محنت کرنی پڑتی۔ لیکن یہ صحافت کا پیشہ ایسا ظالم ہے کہ جو ایک بار اِس کے چنگل میں پھنس جائے وہ کوشش کے باوجود بھی اِس میں سے نکل نہیں سکتا۔ ابرار حسن کو بھی بڑی اچھی اچھی نوکریوں کی آفرز ملیں۔ اُنہوں نے کئی دفعہ کوشش بھی کہ وہ اِس دشتِ پُر خار سے نکلنے میں کامیاب ہوجائیں۔ ایک آدھ دفعہ کامیاب بھی ہوئے لیکن ہر بار صحافت کی زلیخا نے ایسے دامن کو کھینچا کہ وہ مزاحمت ہی نہ کرسکے۔ اب وہ حضرت یوسف تو تھے نہیں کہ اپنے دامن کو بچالیتے، اُس کی اداؤں میں ایسے اُلجھے کہ پھر اِسی کے آستانے پر جبین جھکا دی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اتنا ضرور ہوا کہ جب اُن کے اخبار کے مالکان نے چینل خرید لیے اور اخباروں میں کالم لکھنے والے ابرار حسن چینلز پر پروگرام کرنے لگے تو ایک طرف ساری دنیا اُن کو پہچاننے لگی تو دوسری طرف اُن کا معیارِ زندگی بھی بہت بہتر ہوگیا۔ اُنہوں نے بہت مختصر سے عرصے میں شہر کے ایک اچھے علاقے میں گھر بھی بنالیا۔ نئے ماڈل کی گاڑی بھی خرید لی۔ بچوں کو شہر کے بہترین اسکولوں میں داخل کرادیا۔ اِس حوالے سے بھی قسمت اُن پر مہربان تھی اور بہت ہی مہربان تھی۔ بڑا بیٹا عمار Lums میں پڑھ رہا تھا، منجھلا بیٹا اے لیول کررہا تھا، سب سے چھوٹا بیٹا عمیر نویں کلاس میں تھا۔ اُسے فوج میں جانے کا شوق تھا اِس لیے اُس کے شوق کو دیکھتے ہوئے ابرار حسن نے اُسے مشنری اسکول میں داخل کرانے کے بجائے آرمی پبلک اسکول میں داخل کرادیا تھا تاکہ وہ شروع ہی سے اُسی ماحول میں رہے۔

اُن کا بڑا بیٹا عمار لاہور میں رہتا تھا اور اپنی کلاس کا ذہین ترین اسٹوڈنٹ تھا۔ اُنہیں اُس سے

بے شمار اُمیدیں وابستہ تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ Lums سے فارغ ہو کر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر چلا جائے، اُس کی بھی یہی خواہش تھی۔

وہ سیکنڈ سمسٹر کے امتحانات سے فارغ ہو کر گھر آیا تو سب سے پہلے ثمینہ اُسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ ظاہر ہے وہ ماں تھیں اور ماں اپنے بچوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو سب سے پہلے محسوس کر لیتی ہے اور یہ تبدیلیاں تو اتنی واضح تھیں کہ چند دن میں سب ہی نے محسوس کر لیں۔ ہر وقت جینز اور ٹی شرٹ پہننے والا نوجوان شلوار قمیض پہننے لگے،

ڈیک پر میوزک سننے والا قرآن پاک کی تلاوت سننے لگے اور عید بقرعید کی نماز پڑھنے والا پانچوں وقت مسجد میں جا کر نماز پڑھنے لگے تو کیسے ممکن ہے دنیا والے اُسے دیکھ کر حیران نہ ہوں۔ اور جب ثمینہ کو پتا چلا کہ وہ باقاعدگی سے قرآن پاک حفظ کر رہا ہے تو وہ خوش ہونے کے بجائے فکر مند ہو گئیں۔

☆......☆......☆

''آپ کو پتا ہے عمار بہت باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگا ہے اور وہ بھی پانچوں وقت مسجد میں......''

وہ اور ابرار حسن رات کا کھانا کھا رہے تھے تو ثمینہ نے اُنہیں یہ خوشخبری سنائی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' ابرار حسن نے سالن کا ڈونگا اُٹھاتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

''وہ صرف نماز ہی نہیں پڑھتا بلکہ قرآن پاک کی تلاوت بھی بہت باقاعدگی سے کرنے لگا ہے۔''

''واقعی!''...... اُنہیں جیسے جھٹکا سا لگا۔

''مجھے فکر یہ ہے کہ اُس میں ایک دم سے یہ تبدیلی کیسے آئی۔'' ثمینہ کے لہجے سے بھی فکر مندی جھلک رہی تھی۔

''تبدیلی تو کسی وجہ سے بھی آسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے اِس کے دوست احباب میں کوئی ایسا لڑکا شامل ہو گیا ہو جو زیادہ ہی مذہبی ہو۔'' ابرار حسن نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔ بظاہر وہ مطمئن نظر آرہے تھے۔ لیکن اندر سے وہ بھی کچھ پریشان ہو گئے تھے۔

''میں نے اِس بارے میں اُس سے پوچھا ہے۔ وہ بتا رہا تھا اُس کا ایسا کوئی دوست نہیں ہے۔''

''یہ سب وقتی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ انسان پر ایسے Phases آتے ہیں۔ تم زیادہ پریشان نہ ہو۔'' ابرار حسن نے ثمینہ کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی تسلی دی۔

''وہ کہتا ہے اب وہ قرآن پاک حفظ کرے گا......'' ثمینہ نے بات کو اور آگے بڑھایا۔

''اس سے کہو پہلے اپنی تعلیم مکمل کرے پھر قرآن پاک بھی حفظ کرلے۔'' ابرار حسن نے قدرے لاپروائی سے کہا۔

''وہ کہتا ہے...... وہ...... اب B.B.A نہیں کرے گا۔'' ثمینہ نے اٹک اٹک کر بڑی مشکل سے یہ جملہ ادا کیا۔

''واٹ!'' ابرار حسن کو پانی پیتے پیتے اچھو لگ گیا۔ انہوں نے گلاس میز پر رکھا۔ اب اُنہیں معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا......'' چند سیکنڈ سکتے کی حالت میں گزارنے کے بعد اُن کی زبان پر یہی سوال آیا۔

''مجھے تو خود نہیں پتا تھا۔ میں تو اُس کا حلیہ دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔''

''کمال ہے...... اُس نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا اور مجھ سے ذکر بھی نہیں کیا۔'' ابرار حسن نے شدید صدمے کی کیفیت سے خود کو آزاد کرتے ہوئے یہ جملہ کہا۔

''اس نے تو مجھ سے بھی ذکر نہیں کیا، میں تو یہی سوچ کر خوش ہو رہی تھی کہ وہ دین کی طرف راغب ہو رہا ہے۔'' ثمینہ نے اپنی صفائی پیش کی۔

''دین...... دین...... دین...... اسلام...... مذہب...... ہر طرف دین اور مذہب کا پہاڑا پڑھا جا رہا ہے۔ لیکن کسی کو نہیں معلوم کہ دین ہے کیا؟'' ابرار حسن نے جھنجلا کر بولے۔

''آپ اُسے سمجھائیں۔ وہ آپ کی بات سنتا ہے۔'' ثمینہ دھیرے سے اُنہیں سمجھایا۔

''اِس وقت وہ کہاں ہے؟''

''مجھ سے کہہ کر گیا تھا کہ وہ عشاء کی نماز پڑھنے جا رہا ہے۔''

"رات کے دس بج رہے ہیں، اتنی دیر تک تو عشاء کی نماز نہیں ہوتی۔" ابرار حسن کے چہرے پر شدید تناؤ کی کیفیت پیدا ہوگئی۔

"یہی تو پریشانی ہے کہ وہ عشاء کی نماز کے لیے جاتا ہے اور پھر آدھی رات کو گھر آتا ہے۔" ثمینہ نے ڈرتے ڈرتے اصل بات بتائی۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ وہ اتنی رات تک کیا کرتا ہے۔"

"بہت دفعہ پوچھا ہے۔ وہ یہی کہتا ہے کہ وہ عشاء کے بعد مسجد میں بیٹھ کر قرآن پاک حفظ کرتا ہے۔"

"اُف میرے خدایا! اُسے کس نے اِس راہ پر لگا دیا؟" ابرار حسن نے بے اختیار سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ "وہ آئے تو اُس سے کہنا کہ مجھ سے بات کرے۔" ابرار حسن کچھ دیر سر تھامے بیٹھے رہے پھر اپنے بیڈروم میں جاتے ہوئے اُسے حکم دیا۔

ابرار حسن کے جانے کے بعد ثمینہ نے میز سے برتن اُٹھائے۔ اُنہیں کچن میں رکھا اور وہیں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر چینل سرچ کرنے لگیں۔ اُنہیں خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُنہیں کیا کرنا چاہیے۔

☆ ☆

ابرار حسن اور ثمینہ کی لَو میرج تھی۔ وہ دونوں جرنلزم میں ماسٹرز کر رہے تھے۔ ثمینہ کی تین بہنیں اور تھیں۔ اُس کا تیسرا نمبر تھا۔ صورت شکل میں وہ سب بہنوں میں سب سے اچھی تھی اور اِسی خوبی کی وجہ سے لوگ اُنہیں بے حد پسند کرتے تھے کہ آج کل Presentation کا زمانہ ہے، جو چیز جتنی زیادہ Presentables ہوتی ہے، مارکیٹ میں اِس کی مانگ اُتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔ اِسی لیے آج کل لڑکیاں اپنی پرسنل گرومنگ پر ہر چیز کو ترجیح دینے لگی ہیں۔ وہ صورت شکل کی بھی بہت اچھی تھی اور اپنے آپ کو خوبصورتی سے Present کرنے کا ڈھنگ بھی جانتی تھی۔ اِسی لیے جب بھی اُس کی بڑی بہنوں کے رشتے کے لیے لوگ آتے، اِس کو پسند کر لیتے جبکہ عام لڑکیوں کی طرح اُسے شادی بیاہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بہت Ambitious تھی اور بہت آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ ویسے تو اُن کے گھر کا ماحول بہت لبرل تھا، اُس کے باپ بہت مذہبی تھے لیکن مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ روشن خیال بھی تھے۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے بہت حامی تھے۔ اُن کی بڑی دونوں بیٹیوں نے ماسٹرز کیا تھا۔ وہ بھی جرنلزم میں ایم اے کر رہی تھی، گھر میں سب پڑھے لکھے تھے، دیندار تھے، ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن جب بھی گھر میں بڑی بہنوں کو دیکھنے لوگ آتے اور اُسے پسند کر کے چلے جاتے تو سارے گھر میں کشیدگی پیدا ہو جاتی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو مجرم تصور کرنے لگتی۔

اُس دن بھی ایسا ہی ہوا، جب بڑی خالہ اپنی جاننے والی خاتون کو لے کر آئیں۔ خاتون بہت پڑھی لکھی اور شائستہ تھیں۔ اُنہوں نے اسما کو سرسری نظر سے دیکھا اور کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ لوگ چائے پی رہے تھے تو ثمینہ یونیورسٹی سے گھر میں داخل ہوئی اور سیدھی ڈرائنگ روم میں آگئی۔

"یہ بھی آپ کی بیٹی ہے۔" مسز انور نے امّی سے سوال کیا۔

"جی...... جی...... یہ اسما سے چھوٹی ہے......" امّی نہ جانے کیوں بوکھلا گئیں۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری ہے۔" خاتون کی تعریف پر امّی خوش ہونے کے بجائے بجھ سی گئیں۔

"اِس کا کہیں رشتہ تو طے نہیں ہوا؟" اُنہوں نے بڑی خالہ سے پوچھا۔

''ابھی تو یہ پڑھ رہی ہے۔ اِسے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔'' امی نے اُسے آنکھ سے باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''پڑھنے لکھنے کے سارے شوق شادی سے پہلے ہوتے ہیں۔ اِدھر شادی ہوتی ہے اُدھر سارے شوق چولہا ہانڈی کی نذر ہوجاتے ہیں۔'' مسز انور نے ہنس کر کہا۔

''پھر بچوں میں گھر کر کس کو اتنی فرصت ہوتی ہے کہ اپنے شوق پورے کرے۔'' بڑی خالہ نے اپنی دوست کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ثمینہ کا مزاج تھوڑا مختلف ہے۔ وہ اسکول کے زمانے سے اخباروں رسالوں میں مضامین اور کہانیاں لکھتی ہے۔'' امی کو مسز انور کی باتیں کچھ زیادہ اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اصل میں میرے بیٹے کو بھی لٹریچر سے بڑی دلچسپی ہے۔ وہ انجینئر ہونے کے باوجود بہت زیادہ ادبی ذوق رکھتا ہے۔''

امی مسز انور کو پینترا بدلتے دیکھ کر کچھ چپ سی ہوگئیں اور اب تو شک کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی کہ اِس دفعہ بھی ثمینہ کی خوبصورتی اسماء کی دینداری اور سلیقہ مندی پر بازی لے گئی تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد رسمی گفتگو ہوتی رہی۔ مسز انور بہت خوشی خوشی رخصت ہوئیں۔ اسماء اور آسیہ کو گلے لگا کر دعائیں دیں اور دوسرے دن ہی بڑی خالہ کا فون آگیا کہ اُن کو اپنے بیٹے کے لیے ثمینہ پسند آئی ہے جبکہ بڑی خالہ نے اسماء کی بے حد تعریف کی۔ اُس کے سلیقے، اُس کے رکھ رکھاؤ اور دینداری کے بارے میں بتایا مگر اِس کے باوجود اُن کی سُوئی ثمینہ پر ہی اٹکی رہی۔ بڑی خالہ نے اُنہیں بہت سمجھایا کہ آپ کے بیٹے کے لیے اسماء زیادہ مناسب ہے کیونکہ اُن کا بیٹا اٹھائیس سال کا تھا جبکہ اسماء کی عمر پچیس سال تھی۔ آپ کا بیٹا بہت مذہبی اور دین دار ہے جبکہ ثمینہ بہت آزاد خیال ہے۔ وہ نماز بھی کبھی کبھار ہی پڑھتی ہے اور پردے کی تو بالکل قائل ہی نہیں لیکن اُن کی کوئی کوشش بھی بار آور نہ ہوسکی، کیونکہ صرف مسز انور کو ہی ثمینہ پسند نہیں آئی تھی۔ اُن کے صاحبزادے کا ووٹ بھی اُسی کے حق میں تھا۔

''میرا خیال ہے تم لوگوں کو ثمینہ کی بات طے کردینی چاہیے، ورنہ یہ مسئلہ کبھی بھی حل نہیں ہوگا۔'' بڑی خالہ جب سے آئی تھیں مسلسل امی کو سمجھانے کی کوشش کررہی تھیں۔

''ایسا کیسے ممکن ہے۔ دونوں بڑی بیٹھی رہیں اور میں اِس کا رشتہ طے کردوں۔'' امی اداسی سے بولیں۔

''لڑکا بہت اچھا ہے۔ این ای ڈی کا پڑھا ہوا۔ پھر آئی بی اے سے ایم بی اے کیا ہے۔ گھر والے بھی بہت اچھے ہیں، اچھی طرح سوچ لو۔'' بڑی خالہ کی خواہش تھی کسی طرح یہ رشتہ ہاتھ سے نہ جائے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... لیکن......'' امی پھر کچھ سوچ کر رُک گئیں۔

''اور کون سا تم نے ابھی شادی کرنی ہے۔ فی الحال بات طے کردو۔ پھر انشاء اللہ اِن دونوں کے لیے رشتہ تلاش کرلینا۔ ابھی تو جو بھی رشتہ آتا ہے وہ ثمینہ کو دیکھ کر یہیں رک جاتا ہے۔ ثمینہ کے ہوتے ہوئے اِن تینوں کی دال گلنی مشکل ہے۔''

''یہ تو میں بھی جانتی ہوں لیکن اگر میں ثمینہ کی بات طے کردوں تو میں مجبور ہوجاؤں گی، لڑکے والوں نے شادی کے لیے اصرار کرنا شروع کردیا تو میں کیا کروں گی۔'' امی بیٹیوں کی ماں تھیں۔ اُنہیں بے شمار اندیشے ستاتے تھے۔

''اِس کی تم فکر نہ کرو۔ میں اُن لوگوں کو سمجھالوں گی۔ پھر انشاء اللہ سال کے اندر اسماء اور آسیہ کی کہیں

نہ کہیں بات طے ہو ہی جائے گی۔'' بڑی خالہ امی کو نیم رضامند دیکھ کر اور پُر جوش ہو گئیں۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو لیکن آج کل لڑکے والوں کی جو ڈیمانڈز ہیں اُس پر تو ہماری بیٹیاں مشکل ہی سے پوری اترتی ہیں۔'' امی کے لہجے میں بے حد مایوسی در آئی تھی۔

''اب ایسے بھی نہ کہو اور کون سی تمہاری بیٹیوں کی عمریں گزر گئی ہیں۔ خدا سے دُعا کرو۔ وہی جوڑے بنانے والا ہے۔'' بڑی خالہ کو امی کے لہجے سے بڑی تکلیف ہوئی۔

''دعا تو ہر وقت ہی کرتی ہوں۔ جس کے گھر میں چار جوان بیٹیاں ہوں، اُن کی ماں کو سوائے دعائیں کرنے کے اور کیا کام ہوگا۔''

''بہر حال تم زاہد سے بات کرنا، وہ راضی ہو جائیں تو مجھے بتانا۔ میں اُن لوگوں کو بتا دوں گی۔ لڑکا بہت اچھا ہے اور ثمینہ بھی ماشاء اللہ بائیس سال کی ہو گئی ہے۔ آسیہ اور اسماء کی وجہ سے اِس کی عمر کیوں بڑھا رہی ہو۔ آج کل بڑا چھوٹا کوئی نہیں دیکھتا۔ جس کا رشتہ آ جائے ماں باپ اِس کی کر دیتے ہیں۔'' بڑی خالہ نے گھر سے نکلتے نکلتے امی کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ امی بھی کسی حد تک راضی ہو گئیں لیکن جب اُنہوں نے اپنے شوہر سے بات کی تو وہ چند لمحوں کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

''یہ ممکن نہیں ہے...... اور ابھی تو...... ثمینہ پڑھ رہی ہے۔ میں تعلیم کے دوران شادی کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔'' زاہد صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد ٹھہر ٹھہر کر یہ جملے ادا کیے۔

''تو میں کون سا شادی کرنے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ آپ لڑکے سے تو مل لیں، اگر آپ کو لڑکا پسند آ جائے تو پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ اگر ہم اِسی طرح اتنے اچھے رشتوں سے انکار کرتے رہے تو لوگ ہمارے گھر رشتے لانا چھوڑ دیں گے۔''

بیگم کے سمجھانے پر زاہد صاحب بھی خاموش ہو گئے۔ وہ بہت خاموش طبع اور نیک انسان تھے۔ اپنے دل کی بات دوسروں سے بہت کم کہتے تھے۔ لیکن بیٹیوں کی شادی کے لیے وہ بھی بہت فکر مند رہتے تھے۔

......☆......☆......

زاہد صاحب دو دن بعد اُس لڑکے سے ملنے اِس کے آفس گئے اور اُس لڑکے سے مل کر اُس کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ اُنہوں نے فوراً ہی ہاں کر دی۔

''لڑکا بہت نیک ہے۔ اِس زمانے میں بھی اتنے دیندار، شرح کے پابند لڑکے بہت کم ہوتے ہیں۔ ماشاء اللہ سے بارلیش بھی ہے اور پنج وقتہ نمازی بھی۔'' زاہد صاحب کو اِس کی قابلیت اور دینداری نے بہت متاثر کیا تھا۔

امی نے اُسی وقت بڑی خالہ کو فون کر کے رشتے کے لیے ہاں کر دی اور بڑی خالہ یہ سن کر اتنا خوش ہوئیں کہ اُسی وقت مسز انور کے گھر پہنچ گئیں۔ اور اُن کے ساتھ مٹھائی لے کر آ گئیں اور منگنی کی تاریخ بھی طے کر دی۔

ثمینہ یونیورسٹی گئی ہوئی تھی اُسے پتا ہی نہیں چلا کہ اِس کی غیر موجودگی میں اِس کی زندگی کا فیصلہ کر دیا گیا۔ وہ شام کو گھر آئی تو گھر میں سب کے مسکراتے چہرے اور گھر میں کچھ غیر محسوس سی گہما گہمی نے اُسے خوفزدہ سا کر دیا۔

''کیا بات ہے سب بہت خوش نظر آ رہے ہیں......'' اُس نے کمرے میں آتے ہی سب سے چھوٹی بہن فریحہ سے پوچھا۔

''خوشی کی تو بات ہے۔ اب جلد ہی اِس گھر میں

ڈھولک بجے گی۔'' فریحہ نے خوشی سے بھرپور لہجے میں اُسے اطلاع دی۔

''واقعی کیا آپی اپیا کی بات طے ہوگئی ہے؟''
اُس کے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اسماء اور آسیہ سے پہلے اِس کی شادی کے لیے سوچا جائے گا۔ اُس کی حیرانی بجا تھی۔

''تو آپ کو نہیں معلوم؟'' فریحہ نے حیرانی سے کہا۔

''کیا بات ہے؟ جلدی بتاؤ۔ مجھے بے چینی ہو رہی ہے۔''

''آپ کا رشتہ طے ہوا ہے۔ اگلے جمعہ آپ کی منگنی ہے......'' فریحہ نے جلدی سے اُسے یہ روح فرسا خبر سنائی۔

''ایسا نہیں ہوسکتا۔ تم جھوٹ بول رہی ہو؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ میری منگنی طے کر دی گئی اور مجھے معلوم ہی نہیں۔'' اُسے لگا جیسے کسی نے اِس کی زندگی کے رنگین خاکوں میں سیاہی پھیر دی۔

''واقعی آپ کو کچھ نہیں معلوم؟'' فریحہ اِس کا ردِعمل دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''مجھے کیسے معلوم ہوتا۔ مجھ سے کسی نے پوچھنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی۔ اور بابا...... وہ تو بڑے روشن خیال بنتے ہیں۔ اُنہوں نے مجھے گائے بکری سمجھ لیا...... حد ہوگئی، میں تو ایسا نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ ایک دم بھڑ گئی۔

''اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ امّی بابا بہت خوش ہیں۔ امّی بتا رہی تھیں جن سے آپ کا رشتہ طے ہوا ہے وہ بہت پڑھے لکھے اور بہت نیک اور مذہبی بھی۔''

''تو پھر یقیناً اُن کی داڑھی بھی ہوگی۔ وہ شرعی لباس بھی پہنتے ہوں گے۔ اُن کی شلوار بھی ٹخنوں سے اونچی ہوتی ہوگی۔'' یہ کہتے کہتے اُس کی آواز بھرانے لگی۔

''پتا نہیں...... مجھے کچھ نہیں پتا۔ شاید داڑھی تو ہے۔ فریحہ نے ڈرتے ڈرتے بڑی مشکل سے اپنی بات مکمل کی۔

''اونہہ! داڑھی۔ امّی کو بتا دو۔ میں مر بھی جاؤں گی تو بھی داڑھی والے شخص سے شادی نہیں کروں گی۔ اگر کسی نے زبردستی کی تو میں زہر کھا لوں گی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اُس کی چیخ پکار سن کر امّی اور دونوں بہنیں بھی اس کے پاس آ گئیں، اس کی باتیں سن کر تو امّی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ یہ تو جانتی تھیں کہ وہ آزاد خیال ہے لیکن یہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ باریش لوگوں سے اتنا چڑتی ہے۔

''بیٹا اللہ سے ڈرو! توبہ کرو۔ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟'' امّی کا دل اس کی باتیں سن کر لرز اٹھا۔

مجھے داڑھی والے مولوی ٹائپ لوگوں سے سخت نفرت ہے۔ مجھے اِس طرح کے لوگ بہت بُرے لگتے ہیں۔''

توبہ...... توبہ...... امّی گھبرا کر استغفار پڑھنے لگیں۔ ''کیسی کافرانہ باتیں کر رہی ہو۔ تمہیں اُن لوگوں سے نفرت ہے جو اللہ کے راستے پر چلتے ہیں۔'' اسماء بہت مذہبی تھی۔ اُسے اس کی باتیں کبھی اچھی نہیں لگتی تھیں لیکن اِس وقت تو وہ غصّے میں تمام حدیں پار کر رہی تھی۔

''تمہیں تو ایسے لوگ بہت پسند ہیں۔ تو تم کر لو اُس مولوی سے شادی۔ مجھے ہی کیوں قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے۔'' اُس نے تڑخ کر بغیر سوچے سمجھے جواب دیا جو تیر کی طرح اسماء کے دل پر لگا۔ اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن اُس نے بہت زیادہ صبر و ضبط سے کام لیا۔

''اُن لوگوں نے مجھے پسند نہیں کیا۔ اگر وہ لوگ مجھے پسند کرتے تو میں اِسے اپنی خوش نصیبی خیال

کرتی۔‘‘

’’تمہیں کیوں پسند کرتے؟ اُنہیں تو گوری لڑکی چاہیے۔ بڑے مذہبی بنتے ہیں۔ بڑے سچے مسلمان ہیں جو یہ بھی نہیں جانتے کہ اسلام میں ظاہری شکل و صورت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تم مجھ سے کہیں زیادہ نیک اور دین دار ہو۔ لیکن تمہارا رنگ تھوڑا سانولا ہے اِس لیے اُنہیں تم پسند نہیں آئیں۔ یہی تو اِن لوگوں کا دوغلا پن ہے۔ اوپر سے کچھ کہتے ہیں۔ اندر سے کچھ ہوتے ہیں۔‘‘ اُس نے انتہائی سفا کی سے سچ بولا۔

’’خاموش ہو جاؤ۔ اب ایک لفظ نہیں کہنا۔ شرم نہیں آتی خدا کے نیک بندوں کے بارے میں اِس طرح باتیں کرتے ہوئے۔‘‘ امّی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اُنہوں نے بُری طرح اُسے جھاڑا۔

’’ٹھیک ہے میں کچھ نہیں کہہ رہی۔ لیکن میں ایسے آدمی سے شادی نہیں کر سکتی۔ آپ بابا کو بھی بتا دیجیے گا۔‘‘ وہ یہ کہہ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی اور تکیے میں منہ چھپا کر آنسو بہانے لگی۔

’’ابھی تم غصّے میں ہو۔ تھوڑی دیر بعد جب غصّہ کم ہو جائے تو آرام سے سوچنا۔ ایسے رشتے بار بار نہیں ملتے۔‘‘ امّی نے اُسے دھیرے سے سمجھایا۔ وہ کچھ نہیں بولی بس بے آواز آنسوؤں سے روتی رہی۔

☆.............☆.............☆

رات کو زاہد صاحب آئے۔ امّی نے اُنہیں ساری بات بتائی۔ خلافِ توقع نہ اُنہوں نے غصّہ کیا۔ نہ اُسے باتیں سنائیں۔ بس آہستگی سے کہا۔

’’اگر اُس کی مرضی نہیں تو ہم زبردستی تو نہیں کر سکتے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اِس رشتے کا اُسے علم نہیں ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا۔ تم نے اُسے بتا دیا ہوگا۔‘‘

’’غلطی میری ہی ہے۔ ہمیں رشتہ پکّا کرنے سے پہلے اُس سے پوچھنا چاہیے تھا۔‘‘ امّی بھی اپنی غلطی پر شرمندہ نظر آ رہی تھیں۔

’’خیر جو ہوا سو ہوا۔ تم لڑکے والوں سے کوئی بہانہ بنا کر انکار کر دینا۔ لیکن آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔ یہ غلطی نہیں ہے یہ زیادتی ہے۔ یہ ہماری بیٹیاں ہیں۔ جیتی جاگتی، زندگی سے بھرپور بچیاں ہیں۔ بے جان گڑیاں نہیں ہیں۔ ضروری نہیں جو چیز ہمیں پسند ہو، وہ اُنہیں بھی پسند ہو۔ اگر اللہ نے ہم پر اِن کی ذمہ داری ڈالی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس ذمہ داری کو احسن طریقے سے ادا کریں اور بیٹیوں کی شادی کا احسن طریقہ یہ ہے کہ شادی سے پہلے اُن کی مرضی معلوم کی جائے۔ یہی میرے رسول کی بھی سنت ہے۔‘‘

زاہد صاحب یہ کہہ کر نماز پڑھنے مسجد چلے گئے اور امّی بیٹھی یہ سوچتی رہ گئیں کہ اگر سارے باپ ان ہی کی طرح سوچنے لگیں تو بیٹیاں اپنے باپ کے گھر میں کتنی مطمئن اور خوش رہیں۔

وہ ہمیشہ سے باپ سے بہت محبت کرتی تھی لیکن جب زاہد صاحب نے اِس کی مرضی کا خیال رکھتے ہوئے اِس رشتے سے انکار کیا تو اُسے جیسے باپ سے عشق ہو گیا۔ وہ مطمئن ہو کر اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئی۔

ابرار حسن اِس کا کلاس فیلو تھا۔ وہ بہت ذہین اسٹوڈنٹ اور بہت اچھا مقرر تھا۔ ابرار یونیورسٹی کے زمانے سے ہی اخباروں میں مضامین لکھا کرتا تھا۔ اُس کے مضامین کو پسند بھی کیا جاتا تھا۔ اُس نے اور ثمینہ نے یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد ایک روزنامے میں نوکری کر لی تھی۔ ابرار کو اسلام سے بہت لگاؤ تھا لیکن وہ اُس اسلام کا سخت مخالف تھا جس کا نام لے کر انسانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنایا جا رہا تھا۔ وہ اپنے کالموں میں صاف اور واضح الفاظ میں اِن لوگوں کی مخالفت کرتا تھا جو اسلام کا لباس پہن کر اسلام کو بدنام کرنے کی سازشیں کر رہے

تھے۔ چند ہی سالوں میں اِس کے کالموں کی دھوم مچ گئی تھی۔ اُس کی سوچ، اُس کے نظریات، اُس کے خیالات ہر پاکستانی کے دل کی آواز بن گئے۔ ثمینہ یونیورسٹی کے زمانے سے ہی اُس سے متاثر تھی اور اب جب وہ شہرت کی بلندیوں کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا تو وہ اور زیادہ اِس کی گرویدہ ہوتی جارہی تھی۔ وہ دونوں سالوں سے ایک ساتھ تھے لیکن اُن کے درمیان کبھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جس سے اُسے یہ اندازہ ہوتا کہ ابرار کے دل میں اُس کے لیے محبت کا جذبہ کروٹیں لے رہا ہو۔ جبکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ابرار کی محبت اُس کے دل میں درخت کی جڑوں کی طرح پیوست ہوتی جارہی تھی۔ پھر ایک دن ایسی انہونی ہوگئی جس نے اُسے زمین سے اُٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔

گھر میں اِس کی شادی کا مسئلہ زور وشور سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ زاہد صاحب کے دوست کا رشتہ آیا تھا۔ جو بقول سب گھر والوں کے اُس کی پسند کے عین مطابق تھا۔ لوگ بہت آزاد خیال تھے۔ لڑکا باہر سے پڑھ کر آیا تھا۔ شکل وصورت کا بھی بہت اچھا تھا۔ اُس کی عمر بھی ستائیس سال ہوچکی تھی۔ تینوں بہنوں کی شادیاں ہوچکی تھیں، اب اُس کے پاس اِس رشتے سے انکار کا کوئی معقول جواز نہیں تھا، لیکن نہ جانے کیا تھا کہ دل مسلسل بغاوت پر آمادہ تھا۔ وہ پریشان سی آفس میں بیٹھی تھی کہ خلافِ معمول وہ اُس کے آفس میں داخل ہوا۔

''ہیلو...... کیا حال ہیں؟'' وہ اِس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کا دل عجب انداز سے دھڑکنے لگا۔

''میں نے صبح اُٹھ کر دیکھا تھا لیکن سورج تو مغرب سے نہیں نکلا تھا۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''ماشاء اللہ بڑی ذہین ہوتی جارہی ہو۔'' وہ گہری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

''ذہین تو میں ہمیشہ سے ہوں۔ تم نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔'' بلا ارادہ اُس کی زبان سے یہ جملہ نکلا اور فوراً ہی اُس نے گھبرا کر ابرار کو دیکھا۔

''تمہیں کیا پتا؟ میں تو شاید اِس دنیا میں آنے سے پہلے ہی تمہارے بارے میں غور کرتا رہا ہوں۔'' وہ شوخی سے بولا۔

''مجھے یقین نہیں آتا۔'' وہ اپنا اعتماد بحال کرچکی تھی۔

''کیسے یقین آئے گا؟'' وہ حیرت انگیز طور پر بدلا ہوا ابرار لگ رہا تھا۔

''کیسے...... یقین...... آئے...... گا۔'' وہ ایسی بات سوچنے لگی جو ناممکن لیکن دل تھا کہ بار بار خوشیوں کے رنگ دکھلا رہا تھا۔

''ایک ہی صورت ہے۔'' وہ کہتے کہتے رُک گیا اور جیسے اِس کی سانسیں رک گئیں۔

''کون سی صورت؟ وہ بے تابی سے بولی۔ آج دل اُس کی کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''وہی ایک صورت کہ سر پر کلا سجا کر تمہارے گھر آجاؤ۔ تب تو یقین کروگی۔'' ابرار نے جیسے زندگی کو ہر رنگ سے سجا کر اُس کے سامنے پیش کردیا۔

''یقین تو تب بھی نہیں آئے گا لیکن......'' وہ جیسے آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہوگئی۔

''یقین کرلو...... فائدے میں رہوگی۔ ویسے اپنے گھر والوں کو بتا دینا کہ کل میرے Parents تمہارے گھر میرا رشتہ لے کر آرہے ہیں اور مجھے تو یقین ہے کہ تمہارا جواب Positive ہوگا۔'' وہ یہ کہہ کر اُس کی طرف دیکھے بغیر آفس سے باہر نکل گیا اور وہ وہیں بیٹھے بیٹھے جیسے خوشیوں اور خوشبوؤں کے دیس کی شہزادی بن گئی۔

☆......☆......

ایک مہینے میں وہ دونوں زندگی کے ساتھی بن گئے، زندگی نے اپنی ساری بہاریں اُن کے لیے

وقف کردیں۔ وہ دونوں بے حد خوش تھے۔ ہنی مون ہنستے مسکراتے گزر گیا۔ لیکن جب زندگی کے حقائق سامنے آئے تب بھی محبت کے رنگوں نے اُن حقیقتوں کو اور زیادہ رنگین کردیا۔ اُن دونوں نے اپنا گھر بنانے کے لیے مل جل کر جدوجہد کی جو کچھ انہوں نے حاصل کیا اُس کے لیے اُنہیں دن رات محنت کرنی پڑی۔ ابرار تو ملک کا نامور جرنلسٹ تھا لیکن وہ بھی اُس سے کم نہیں تھی۔ وہ بھی جانی پہچانی جرنلسٹ تھی۔ دونوں کے بچے بہت ذہین اور لائق تھے۔ زندگی میں بے شمار مرتبہ بہت سے مسئلے مسائل پیدا ہوئے۔ ابرار کو کئی دفعہ نوکری چھوڑنی پڑی۔ کئی دفعہ دھمکیاں ملیں۔ اُسے بھی اکثر اخبار اور چینل کے مالکان کے کہنے پر وہ کچھ کرنا پڑا جو وہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اُنہوں نے ہر مسئلے کو مل جل کر حل کرلیا لیکن اب جو عمار نے ایسا انوکھا فیصلہ کیا تھا اُس نے دونوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

☆.........☆.........☆

''مجھے تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے۔'' ابرار نے عمار کی پوری بات سن کر سر تھام لیا۔

''اور مجھے یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ میرے اِس فیصلے پر اتنے پریشان کیوں ہیں؟'' عمار کے اِس جملے نے ابرار کو بُری طرح تپا دیا۔

''پریشان نہ ہوں تو کیا خوشیاں مناؤں کہ میرے بیٹے نے اپنی تعلیم کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' ابرار کے لہجے میں انتہا کی کاٹ تھی۔

''میں تعلیم کو ادھورا نہیں چھوڑ رہا بلکہ تعلیم کا رخ موڑ رہا ہوں۔''

''پہلے تم گریجویشن تو کرلو۔''

''میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ میں دینی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم نے سوچا ہے۔ تم آخر کیا بننا چاہتے ہو۔'' ابرار حسن کو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا نظر آرہا تھا۔

''بالکل سوچا ہے۔ میں عالمِ دین بننا چاہتا ہوں۔'' اُس نے ٹھوس لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''کیوں......؟'' اُنہوں نے بڑے تحمل سے سوال کیا۔

''تاکہ بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو سیدھا راستہ دکھا سکوں۔''

''یہ تو تم ایم بی اے کرنے کے بعد بھی کرسکتے ہو۔''

''پاپا آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کسی پروفیشن میں کامیاب ہونے کے لیے سالوں کی محنت اور ریاضت درکار ہوتی ہے۔ جس طرح ایک شخص بیک وقت ڈاکٹر اور انجینئر نہیں بن سکتا اِس طرح ایک شخص بیک وقت Finance فنانس کا ماہر اور عالمِ دین نہیں بن سکتا۔ دو ڈگریاں بیک وقت حاصل کرنا ممکن نہیں۔ جس طرح فنانس یا مارکیٹنگ میں مہارت حاصل کرنے کے لیے سالوں کی محنت اور ریاضت درکار ہوتی ہے اسی طرح دین کا علم حاصل کرنے کے لیے برسوں کی محنت درکار ہے۔ قرآن پاک کا علم حاصل کرنا آسان نہیں ہے اور قرآن کا علم حاصل کرنے کے لیے علم حدیث، علم فقہ، علم تفسیر، علم کلام، علم نحو کا علم حاصل کرنا لازمی ہے۔ کیا یہ سارے علوم بغیر محنت اور ریاضت کے حاصل ہوسکتے ہیں......'' عمار نے کھل کر اپنے مؤقف کی وضاحت کی۔

''تم مجھے سمجھا رہے ہو، جسے دنیا کو یہ سب سمجھاتے ہوئے عمر گزر گئی کہ اسلام جاہلوں کے ہاتھوں میں آکر اپنی اصل شکل کھو بیٹھا ہے۔ آج اصل اسلام کہاں ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔ ہر شخص اسلام کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کررہا ہے۔'' ابرار حسن ایک دم طیش میں آگئے۔

''اور یہ سب اِس وجہ سے ہے کہ پڑھے لکھے لوگ نہ خود دین کا علم حاصل کرتے ہیں اور نہ اپنی اولاد کو اِس کی ترغیب دیتے ہیں اور ترغیب دینا تو بڑی

بات۔ میری طرح اگر کوئی اِس راستے کی طرف بڑھنا چاہے تو اِس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کردیتے ہیں۔'' عمار نے جرأت کے ساتھ باپ کو آئینہ دکھایا۔

''میں تمہاری باتوں کو مانتا ہوں، تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن اِس کے باوجود میں نہیں چاہتا کہ تم اِس راستے کو اختیار کرو۔'' ابرار نے باپ ہونے کا حق استعمال کرنے کی کوشش کی۔

''پاپا سوری! میں بیس سال کا ہو چکا ہوں اور اپنے فیصلے خود کرنے کا اختیار رکھتا ہوں۔'' وہ ضدی لہجے میں بولا۔

''میں تمہیں اِس کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' اُنہوں نے اپنا حکم سنا دیا۔

''لیکن...... پاپا......'' اُس نے احتجاج کیا۔

''لیکن...... ویکن کچھ نہیں۔ میں نے ساری زندگی اِس لیے محنت نہیں کی کہ میرا بیٹا مولوی بن کر دنیا کی لعن طعن برداشت کرے۔''

''پاپا آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ میں مولوی نہیں دین کا عالم بننا چاہتا ہوں۔'' اُس نے وضاحت کی۔

''اِس لیے عالمِ دین بننا چاہتے ہو تاکہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرو۔''

''پاپا یہ غلط ہے، عالمِ دین تفرقہ پیدا نہیں کرتے۔''

''اگر عالمِ دین تفرقہ پیدا نہیں کرتے تو آج مسلمانوں میں اتنے فرقے نہ ہوتے۔''

''پاپا آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ کبھی بھی کسی بڑے عالمِ نے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اُنہوں نے مسلمانوں کو ہمیشہ متحد رکھنے کی کوشش کی۔''

''تم سمجھتے ہو۔ چار کتابیں پڑھ کر تم مجھ سے زیادہ عالم ہو گئے ہو۔ میں نے ساری اسلامی تاریخ کو گھول کر پیا ہے اور اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کو فرقوں میں تقسیم کرنے والے سب سے زیادہ مذہبی رہنما ہیں۔''

''اور اگر آپ غور سے دیکھیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ وہ مذہبی رہنما جو مسلمانوں میں تفرقہ ڈالتے ہیں، کن کے آلہ کار ہیں۔'' عمار آج کے دور کا ذہین جوجوان تھا۔ وہ اتنے جلدی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔

''میں تمہارے خیالات اور نظریات پر پابندی تو نہیں لگا سکتا لیکن میں تمہیں اِس بات کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں دوں گا کہ تم لوگوں کے بہکانے پر اپنے شاندار مستقبل کو داؤ پر لگا دو۔ یہ میرا حکم ہے اور تمہیں میرا حکم ماننا ہوگا۔'' ابرار حسن نے شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اُس سے اتنے سخت لہجے میں بات کی تھی۔ عمار نے کوئی جواب نہیں دیا اور باپ کو عجیب نظروں سے دیکھتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

☆......☆......☆

''کیا بات ہے آج کل تم پابندی سے مسجد میں نہیں آرہے۔ کیا کسی نے تمہیں منع کیا ہے۔'' مولانا عبدالرحمٰن نے اُسے کئی دن بعد مسجد میں دیکھا۔ عشاء کی نماز کے بعد جب لوگ چلے گئے تو اُسے سر جھکائے بیٹھا دیکھ کر اُس سے پوچھا۔

''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں حق پر ہوں یا نہیں؟''

''تمہیں کون راہِ راست سے بہکا رہا ہے۔'' مولانا عبدالرحمٰن کی پیشانی پر بے شمار بل پڑ گئے۔

''مجھے کسی نے نہیں بہکایا۔ لیکن میں خود بہت کنفیوژ ہوں، مجھے حق اور باطل میں تمیز کرنا مشکل ہو رہا ہے۔'' اُس نے بالآخر دل کی بات کہہ دی۔

''کیا اللہ کا راستہ حق کا راستہ نہیں ہے؟'' اُنہوں نے اُس سے سوال کیا۔

''مسلمانوں کے کو ہر فرقے کا دعویٰ ہے کہ اُس کا راستہ حق کا راستہ ہے اور ہر ایک کے پاس اِس کے واضح اور ٹھوس دلائل ہیں۔ پھر یہ کیسے پتا چلے کہ حقیقت میں اللہ کا راستہ کون سا ہے۔''

''اِسی لیے تو میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم دین کا علم حاصل کرو تا کہ تمہیں حق کی پہچان ہو سکے۔''

''کیا دین کا علم حاصل کیے بغیر حق کی پہچان نہیں ہو سکتی۔'' اُس نے عجیب سا سوال کیا۔

''استغفر اللہ؟ ایسا کیسے ممکن ہے۔ جس کو دین کا علم نہیں وہ اللہ کے راستے سے کیسے واقف ہو گا؟''

''کیا میں بی اے کے ساتھ یہ علم حاصل نہیں کر سکتا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے۔ جب تم سارا دن دنیاوی علم حاصل کر کے تھک جاؤ گے تو پھر اس علم کو کیسے حاصل کرو گے۔''

''اِسی لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں بی اے نہیں کروں گا۔ اور اپنی زندگی کو علم حاصل کرنے کے لیے وقف کر دوں گا۔''

''ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔ اِس سے اچھی اور کیا بات ہو گی۔ قرآن میں ہے اِس دنیا کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جو لوگ اِس دنیا کو حاصل کرنے کی تگ و دو کرتے ہیں وہی خسارہ اُٹھاتے ہیں۔ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جہاں کی نعمتوں کا انسان تصور نہیں کر سکتا۔'' مولانا عبدالرحمٰن نے قرآن کی آیتوں سے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

اُسے اُن کی باتیں سمجھ میں آ رہی تھیں لیکن پھر بھی کچھ ایسی گرہیں تھیں جو کھل نہیں پا رہی تھیں۔ وہ عجیب کشمکش و پیچ میں گرفتار تھا۔

☆..........☆..........

''والدین کی نافرمانی سخت گناہ ہے۔ رسول پاک کی حدیث ہے کہ جو شخص اِس طرح دنیا سے جائے کہ اُس کا باپ اُس سے ناراض ہو تو جنت میں جانا تو دور کی بات وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا۔''

وہ نمازِ عشاء کے بعد مولانا صاحب کا وعظ سن رہا تھا اور مولانا صاحب والدین کی اطاعت پر تقریر کر رہے تھے وہ جیسے جیسے تقریر سن رہا تھا ویسے ویسے اُس کا دل لرز رہا تھا۔ پاپا اُس سے سخت ناراض تھے۔ اُس سے بات بھی نہیں کر رہے تھے۔ ثمینہ کا رویہ بھی اُکھڑا اُکھڑا تھا۔ اُس نے یونیورسٹی چھوڑ دی تھی۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت مولانا صاحب کے پاس گزارا کرتا۔ اُس نے دس سپارے حفظ کر لیے تھے اور اب احادیث کی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں بے شمار سوالات پیدا ہوتے۔ مولانا صاحب کچھ کا جواب دے دیتے اور کچھ سوالوں کو شیطانی وسوسہ کہہ کر نظرانداز کر دیتے۔

مولانا صاحب کا وعظ ختم ہوا۔ مسجد نمازیوں سے خالی ہو گئی لیکن وہ سوچ میں ڈوبا وہیں بیٹھا رہا۔

''میرے والدین مجھ سے سخت ناراض ہیں تو کیا...... میں...... بھی......'' یہ سوچ کر ہی اُس کا دل بند ہونے لگا۔

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟ والدین کی اطاعت کرتا ہوں تو اللہ کے راستے سے ہٹ جاتا ہوں۔ اللہ کا راستہ اختیار کرتا ہوں تو والدین کی نافرمانی ہوتی ہے۔'' اُس نے مولانا صاحب سے اپنی اُلجھن بیان کی۔

''والدین اگر اللہ کی راہ سے روکیں تو اُن کی اطاعت فرض نہیں ہے۔'' مولانا صاحب نے فوراً فتویٰ دے دیا۔

وہ بظاہر مطمئن ہو گیا لیکن دل مطمئن نہیں ہوا۔ وہ بوجھل دل لیے ہوئے وہاں سے اُٹھا اور گھر آ گیا۔

زندگی کے شب و روز اُسی طرح جاری تھے۔ وہ اب شہر کی بڑی مسجد کے مولانا احسان الحق کے پاس جانے لگا۔ وہ مولانا عبدالرحمٰن سے واقف تھے اور اُنہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک وہ پرلے درجے کے جاہل تھے۔

''مولانا عبدالرحمٰن نے کسی مدرسے سے تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ چند کتابیں پڑھ کر مولانا بن گیا ہے، ایسے ہی نام نہاد مولوی ہمارے بچوں کو گمراہ کرتے ہیں۔'' مولانا احسن الحق کی اِس قسم کی باتیں سن کر اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ دوسری طرف مولانا عبدالرحمٰن کو جب یہ پتا چلا کہ وہ مولانا احسان الحق

کے پاس جانے لگا ہے تو وہ سخت ناراض ہوئے۔
"اسے دین کا علم نہیں ہے۔ وہ خود بھی گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔"
"لیکن لوگ تو اُنہیں بہت بڑا عالم کہتے ہیں......"
"لوگوں کا کیا ہے۔ جس نے دو چار لفظ عربی کے بول لیے، دنیا اُسی کو عالم سمجھنے لگتی ہے۔ بیٹا صرف عربی زبان جاننے سے کوئی عالم نہیں بن جاتا۔"
"پھر بڑا عالم کون ہے؟" وہ حیرانی سے پوچھتا۔
"ابھی تمہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں۔ پہلے دین کا بنیادی علم تو حاصل کرلو۔ پھر میں تمہیں خود بتاؤں گا کہ اب تم کو کہاں داخلہ لینا ہے۔" وہ اُسے سمجھاتے تو وہ کچھ سمجھتا اور کچھ نہ سمجھتا۔

☆......☆......☆

وہ مغرب کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہا تھا کہ اُس کے سیل کی بیل بجی۔ "عمار تم کہاں ہو؟" دوسری طرف ثمینہ تھی۔
"کیا ہوا......؟ خیریت تو ہے۔" اُسے ثمینہ کی آواز بہت گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔
"تمہارے پاپا کی طبیعت بہت خراب ہوگئی ہے۔ اُنہیں اسپتال لے جا رہے ہیں۔ فوراً پہنچو۔" ثمینہ نے یہ کہہ کر فون بند کردیا اور پھر اُسے کچھ نہیں پتا کہ وہ کیسے اسپتال پہنچا۔ ابرار حسن C.C.U میں تھے۔ اُن کی حالت سخت تشویشناک تھی۔ اُن کی انجیو پلاسٹی ہونی تھی۔ اُنہیں فوراً آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ وہ سب باہر بیٹھے اُن کی زندگی کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ سخت شرمندہ تھا، وہ کسی سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ سب اُس کی وجہ سے ہوا۔ اُس کے فیصلے کی وجہ سے پاپا کی یہ حالت ہوگئی۔ وہ بلک بلک کر دعائیں مانگ رہا تھا۔
"اے اللہ تو پاپا کو زندگی دے دے۔ میں اُن سے معافی مانگ لوں گا۔ اب میں اُنہیں کبھی ناراض نہیں کروں گا، کبھی اُن کی نافرمانی نہیں کروں گا۔" وہ رو رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا۔ اپنے باپ کی زندگی کے لیے منتیں کر رہا تھا۔ "میں اب وہی کروں گا جو پاپا چاہتے ہیں۔" اُس کی نظروں کے سامنے بے شمار منظر بکھر رہے تھے۔ پاپا کا اُس کی انگلی تھام کر اُسے پارک میں لے جانا، اُس کے ساتھ کھیلنا، اُس کو اسکول لے جانا، اُس کی پروگریس چیک کرنا، ٹیچرز سے اُس کے بارے میں میٹنگز کرنا۔ پاپا اُس سے کتنی محبت کرتے تھے وہ تھکے ہارے گھر میں داخل ہوتے اور وہ کسی چیز کی فرمائش کردیتا تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی فرمائش پوری کرتے۔
"میں بھی کتنا نافرمان ہوں۔ میں نے اپنے باپ کو کتنا دکھ دیا۔ میں نے اُن کی اُمیدوں کو مٹی میں ملا دیا۔" اُس کو اس وقت باپ کے سوا اور کچھ بھی یاد نہ رہا تھا۔
ابرار حسن کا آپریشن کامیاب ہوگیا۔ وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے۔ وہ ان چار دنوں میں ایک دن بھی گھر نہیں گیا۔ وہ ڈرتا تھا کہ اگر وہ چلا گیا تو کہیں پاپا اُسے چھوڑ کر نہ چلے جائیں۔
چار دن بعد جب ابرار حسن کو وارڈ میں شفٹ کیا گیا اور رات کے وقت جب اُن کے پاس کوئی نہیں تھا تو بہت شرمندہ اُن کے بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔
"پاپا آپ مجھ سے ناراض ہیں......" اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
"نہیں بیٹے! باپ اپنی اولاد سے ناراض نہیں ہوتا۔ بس ناراضگی کا اظہار کرتا ہے......" وہ شفقت سے مسکرائے۔
"پاپا میں نے یونیورسٹی جوائن کرلی ہے۔ جیسے ہی آپ گھر آئیں گے۔ میں چلا جاؤں گا۔"
"بیٹا میرے گھر آنے کا انتظار نہ کرو۔ تمہارا جتنا نقصان ہو چکا ہے، وہی بہت ہے۔ تم کل ہی لاہور کے لیے روانہ ہو جاؤ۔"
"پاپا میں نے Application بھجوا دی ہے۔"
"نہیں بیٹا......تم فوراً جاؤ...... میں تو یہ خوشخبری

سن کر ہی صحت یاب ہوگیا ہوں۔'' ابرار حسن کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

☆☆☆

صبح کے دس بجے تھے۔ بچے اسکول اور کالج گئے ہوئے تھے۔ ثمینہ اور ابرار حسن گھر پر ہی تھے۔ گھر پر ایک سکون بخش خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بہت دنوں کی گہما گہمی کے بعد یہ سکون اور خاموشی دونوں کو اچھی لگ رہی تھی۔ ثمینہ ماسی سے صفائی کروا رہی تھی اور ابرار حسین لاؤنج میں لیپ ٹاپ کھولے بیٹھے تھے۔ ابھی انہوں نے آفس جانا شروع نہیں کیا تھا۔

''رات کو عمار کا فون آیا تھا۔ آپ سو چکے تھے۔'' ثمینہ کام سے فارغ ہو کر چائے کے دو کپ لیے ہوئے لاؤنج میں آگئیں اور ابرار حسن کو مخاطب کیا۔

''سب خیریت ہے نا......'' انہوں نے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا۔

''ہاں اللہ کا شکر ہے۔ کہہ رہا تھا۔ اُسے بہت مزہ آرہا ہے۔''

''ظاہر ہے مزہ تو آئے گا ہی۔ پتا نہیں دماغ میں کیا خناس سما گیا تھا۔ خود بھی پریشان ہوا اور ہم سب کو بھی پریشان کیا۔'' ابرار حسن کام کے دوران گفتگو کرتے جارہے تھے۔ ثمینہ نے ریموٹ اُٹھا کرٹی وی آن کر دیا۔

''وارسک روڈ پر آرمی پبلک اسکول میں بم دھماکا۔ 10 سے زائد بچے شہید ہوگئے۔'' ٹی وی پڑھ Breaking News چل رہی تھی۔ ابرار نے گھبرا کرٹی وی کی طرف دیکھا۔ ثمینہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ گئی۔ چائے قالین پر گر کر جذب ہوگئی۔

''آج عمیر کا میچ تھا۔ عمیر بھی صبح ہی اسکول گیا تھا۔ آج اگر وہ اسکول نہ جاتا تو......'' ثمینہ ماؤف ذھن سے عجیب بے ربط جملے بول رہی تھی۔

ابرار حسن نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسکول فون کیا۔ لیکن اسکول کا نمبر نہیں مل رہا تھا۔ عمیر کو فون کیا۔

اُس کا فون بھی ڈیڈ تھا۔ اُنہوں نے ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کے لیے کہا اور شاید چند لمحوں میں وہ دونوں اسکول پہنچ گئے۔

☆☆

مرنے والے بچوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہورہا تھا۔

اسکول کے چاروں طرف قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ چلّا رہے تھے۔ رو رہے تھے۔ اپنے بچوں کو پکار رہے تھے۔ ہر فرد کو اپنے بچے کی فکر تھی۔ وہ دونوں بھی اُسی ہجوم کا حصّہ بن گئے اور پھر شام ہوتے ہوتے اُن کے گھر کی خاموشی قبرستان کی خاموشی میں بدل گئی۔ اُن کا سب سے چھوٹا لاڈلا اور چہیتا بیٹا عمیر دہشت گردی کا شکار ہوگیا تھا۔ جسے صبح اسکول جانے کی اتنی جلدی تھی کہ اُس نے ناشتہ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا تھا۔ ثمینہ اِس کی جلد بازی پر سرزنش کرتی رہ گئی۔ اُس کے جانے کے بعد اُسے یہ دکھ تھا کہ عمیر نے دودھ کا گلاس پورا نہیں پیا۔ انڈے کی زردی بھی چھوڑ دی۔ لنچ میں بھی فرنچ فرائز لے کر نہیں گیا۔ لیکن اُسے یہ اطمینان تھا کہ اُس نے جاتے ہوئے اُسے پیسے دے دیے تھے تاکہ وہ اسکول کی کینٹین سے کچھ کھالے۔ وہ آج میچ کی خوشی میں خود ہی اُٹھ گیا تھا۔ آج ثمینہ کو اُسے بار بار جگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ ناشتا میز پر رکھتے ہوئے اُس سے یہی کہہ رہی تھی۔

''اگر اِس دفعہ ٹیسٹ میں تمہارے نمبر اچھے نہیں آئے تو میں تمہاری ٹیچر سے کہہ کر تمہارا نام ٹیم سے نکلوا دوں گی۔'' اور ماں کی اس دھمکی کو سن کر اُس نے مسکراتے وئے کہا تھا۔

''آپ ٹیم (Team) سے میرا نام نکلوا ہی نہیں سکتیں کیونکہ میرے بغیر میری ٹیم میچ جیت ہی نہیں سکتی۔''

اور اب جب سے اُس نے عمیر کی شہادت کی

خبر سنی تھی سب سے یہی کہہ رہی تھی۔
"تم لوگوں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ عمیر Auditorium میں نہیں تھا وہ تو گراؤنڈ میں کرکٹ کھیل رہا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ گراؤنڈ سے باہر چلا گیا ہو۔" وہاں تو جتنے بچے شہید ہوئے تھے۔ ہر بچے سے وابستہ ایسی ہی ایک کہانی تھی۔

☆......☆......

ایسی قیامت، ایسی درندگی کہ شاید ہلاکو اور چنگیز خان کی روحیں بھی شرمندہ ہوگئی ہوں گی۔ بچے تو جانور کے بھی ہوں تو اُن پر پیار آتا ہے اور یہ تو ایسے حسین، خوبصورت بچے تھے کہ جن کی مسکراہٹوں پر پھولوں کو رشک آئے۔ جن کے چہروں کی معصومیت پر فرشتے نثار ہوجائیں۔ جن کی آنکھوں کی چمک کے سامنے ستاروں کی چمک ماند پڑ جائے۔

شام ہوتے ہوتے ابرار حسن اور اُن کے جیسے سیکڑوں گھرانوں میں شامِ غریباں کی تاریکی پھیل گئی۔ ہر شے اُداسی میں ڈوب گئی۔ ہر آنکھ سے اشکوں کا سیلِ رواں جاری ہوگیا۔ پوری قوم نوحہ کناں تھی۔ ہر دل غم سے پھٹا جا رہا تھا۔

☆......☆......

وہ سب صبح کے ناشتے کے لیے ڈائننگ روم میں جمع تھے۔ عمیر کو گئے ہوئے ایک ہفتہ ہوگیا تھا۔ اس ہفتے میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب اُنہوں نے ایک دوسرے سے بات کی ہو۔

وہ سب سر جھکائے ناشتہ کر رہے تھے یا ناشتہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"تم لاہور کب جاؤ گے۔" ابرار حسن نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے بھرائے ہوئے لہجے میں عمار سے پوچھا۔

"پتا نہیں...... میرا اب کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔" عمار کی آواز کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"میرا تو اب زندہ رہنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ لیکن کیا کیا جائے۔ زندہ رہنا تو ہے۔" ابرار حسن کی آنکھوں سے کئی آنسو ٹپک پڑے۔

"ایسا کیوں ہوا......؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔" منجھلے بیٹے یاسر نے جذباتی ہوکر سوال کیا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا کیوں ہوا......؟ آخر ہم نے کیا کیا تھا......؟ ہمارا قصور کیا تھا۔ عمیر کا قصور کیا تھا؟" ثمینہ اپنے آپ سے سوال کر رہی تھی۔ وہ مسلسل یہی جملہ دھرا رہی تھی۔

"ہمارا قصور کیا تھا......؟"

"ہاں ہمارا قصور کیا تھا؟ ہم نے کیا کیا تھا......؟" ابرار حسن نے گہری سانس لی۔ ......لیکن شاید سارا قصور ہمارا ہی تھا، شاید نہیں...... یقیناً

"ہم سب قصور وار ہیں۔ ہوم نے اسلام کو ٹکڑوں میں بٹتے دیکھا لیکن اُسے جوڑنے کی کوشش نہیں کی۔ وہم نے دین کو جاہلوں کے ہاتھوں میں تھما کر مسخ ہوتے دیکھا اور کبھی کچھ نہیں کیا۔ ہم دین کو مولویوں کے سپرد کرکے آرام سے گھروں میں بیٹھ گئے۔ میں نے کیوں دین کی تعلیم حاصل کرکے لوگوں کو اصل دین سے آگاہ نہیں کیا۔ میں نے کیوں اپنے بیٹے کو اس راستے پر جانے سے روکا۔ ہم اپنے بچوں کو ڈاکٹر، انجینئر بنا کر فخر سے اپنے سر اونچے کرلیتے ہیں۔ دین کا عالم بنانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ تو جب تک پڑھے لکھے ذہین لوگ یہ علم حاصل نہیں کریں گے۔ اسلام کے نام پر اسی طرح قتل و غارت گری ہوتی رہے گی۔ اسلام کا لباس پہن کر درندے اسی طرح انسانوں کا خون بہاتے رہیں گے۔ اب رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔" ابرار حسن نے یہ کہہ کر اپنا سر میز پر ٹکا دیا او پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

☆☆......☆☆

افسانہ عصمت پروین عظیمی

ٹھنڈی چھاؤں

اپنی ماں سے تو سب ہی پیار کرتے ہیں، لیکن میرا پیار کچھ الگ ہی رنگ کا تھا۔ بڑی بیٹی ہونے کی وجہ سے میں ان کی بہت لاڈلی بھی تھی۔ اعجاز ہمارے دور کے رشتے داروں میں سے تھے اور کراچی میں مقیم تھے۔ جب گھر میں میری شادی کی بات چلی تو......

ماں کی محبت لیے، ایک مختصر افسانہ

''اُٹھیں ماں جی کھانا کھالیں، پھر آپ کی دوا کا بھی ٹائم ہوجائے گا۔'' میں نے کھانے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ کر ماں جی کو سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''ارے میری بچی تُو کیوں میرے لیے پریشان ہوتی ہے اتنا۔ تو اپنے گھر، شوہر اور بچوں کا خیال رکھا کر بس۔'' وہ اپنی نحیف آواز میں

بولیں۔ ''ماں جی مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی محسوس ہوتی ہے۔ کیا آپ مجھے اس خوشی سے محروم رکھنا چاہتی ہیں۔'' میں نے شکوہ بھرے انداز میں ان سے سوال کیا۔

''اللہ تمہیں زمانے بھر کی خوشیاں دے بیٹی۔'' میری بات کے جواب میں انہوں نے مجھے جی بھر کے دعائیں دینا شروع کر دی۔

''چلیے اب جلدی سے کھانا کھالیں اور اس کے بعد دوا بھی۔'' میں نے سوپ کا چمچہ ان کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ اور ہاں! ''آج شام کو ہم پارک جائیں گے اور آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گی۔''

''مجھ بوڑھی میں اب اتنی سکت کہاں بیٹا، تم لوگ خوامخواہ پریشان ہوگے۔''

''ارے! پریشانی کیسی؟ اور پارک کون سا دور ہے۔ واکنگ ڈسٹینس پر تو ہے۔ بس آپ کو وہیل چیئر پر بٹھاہیں گے اور لے چلیں گے، آپ کو بھی تو کتنے دن ہوگئے گھر سے باہر نکلے ہوئے۔ آپ بھی بور ہوگئی ہوں گی نا۔'' میں نے انہیں بستر پر آرام سے لٹاتے ہوئے کہا۔

''ناحق ہلکان ہوتی ہے میرے لیے، چلو جیسے تیری مرضی۔''

☆......☆......☆

شام کی چائے پی کر اعجاز نے کہا کہ وہ تو آرام کریں گے۔ میں نے اذان، ملائکہ اور ماں جی کو ساتھ لیا اور ہم پارک پہنچ گئے۔ بڑے عرصے بعد ماں جی کے چہرے پر رونق نظر آئی تھی۔ اذان اور ملائکہ کو اچھلتا کھیلتا دیکھ کر وہ بھی خوش ہو رہی تھیں۔

☆......☆......☆

آج صبح سے ہی آسمان پر کالے بادلوں نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ بادلوں کی گرج میرے دل کو ہولائے دے رہی تھی، مجھے بچپن ہی سے ایسے موسم سے خوف محسوس ہوتا تھا۔

سارے بہن بھائی بارش کا مزہ لینے چھت پر پہنچ جاتے تھے اور میں امی سے لپٹی رہتی تھی۔

شادی کے بعد جب اعجاز نے میری اس کیفیت کو محسوس کیا تو ابتدا میں تو وہ بہت ہنسے اور خوب خوب مذاق اڑایا، لیکن مجھے علم تھا کہ وہ یہ سب میرا خوف ختم کرنے کے لیے کرتے ہیں، تبھی تو ایسے موسم میں وہ ہمیشہ آفس سے چھٹی لے لیا کرتے تھے اور میرا دھیان بٹانے کے لیے مجھے مختلف کاموں میں مصروف رکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

آج بھی اعجاز گھر پر ہی تھے اور کچن میں مجھے پکوڑے تلنے کے دوران بادلوں کی گھن گرج پر گھبراتا دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''مما پاپا جلدی آئیں۔'' اذان اور ملائکہ کی آوازوں نے میری گھبراہٹ کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ اعجاز کچن سے باہر کی طرف دوڑے اور پیچھے پیچھے میں بھی۔

''کیا ہوا؟'' ہم دونوں نے بیک وقت سوال کیا۔

''پتا نہیں مما، نانو کو دیکھیں کیا ہوا ہے؟'' میں جلدی سے ماں جی کی طرف بڑھی۔ ''کیا ہوا؟ ماں جی!'' میں نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے سوال کیا۔ ماں جی نظریں یک ٹک چھت کی طرف تھیں۔

''اعجاز دیکھیں کیا ہوا انہیں۔'' میں نے مڑ کر لرزتی ہوئی آواز میں اعجاز کو مخاطب کیا جو خود بھی ماں جی کی اس حالت پر پریشان نظر آ رہے تھے۔

''میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔''

ایسے موسم میں کون ڈاکٹر آئے گا، جبکہ ہر طرف پانی جمع ہے۔'' میں روتے ہوئے کہا۔

''تم تسلی رکھو میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔''

کچھ دیر بعد اعجاز ڈاکٹر کے ہمراہ موجود تھے۔ ڈاکٹر نے ماں جی کی نبض اور دھڑکن چیک کرنے کے بعد یہ روح فرسا خبر سنائی کہ ماں جی اب اس دنیا میں نہیں رہی تھیں اور یہ سن کر میں بلک بلک کر رو دی تھی۔ میری ماں ایک بار کیوں پھر مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی۔

☆......☆......☆

ہم دو بہنیں اور دو بھائی تھے۔ میری والدہ جمیلہ بیگم ایک ہمدرد اور سب سے محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ رات ہو یا دن، وہ سب کی خدمت کے لیے ہمیشہ تیار رہتیں۔ میرے والد ایک نجی کمپنی میں اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ میں شادی کے بعد رخصت ہو کے کراچی آ گئی تھی۔ چھوٹی بہن فرحت کا سسرال اسلام آباد میں تھا، جبکہ دونوں بھائی سکھر ہی میں رہائش پذیر ہیں۔

اپنی ماں سے تو سب ہی پیار کرتے ہیں، لیکن میرا پیار کچھ الگ ہی رنگ کا تھا۔ بڑی بیٹی ہونے کی وجہ سے میں ان کی بہت لاڈلی بھی تھی۔ اعجاز ہمارے دور کے رشتے داروں میں سے تھے اور کراچی میں مقیم تھے جب گھر میں میری شادی کی بات چلی تو میں امی سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ مجھے یہ خیال مارے ڈال رہا تھا کہ میں اپنی ماں سے اتنی دور ہو جاؤں گی، لیکن بہر حال بیٹی کو تو ایک دن جدا ہونا ہی ہوتا ہے۔ کئی خوب صورت رشتے چھوڑ کر ایک اجنبی کے ساتھ میں نئے رشتے میں بندھ کر پرائے دیس چلی آئی۔

اعجاز کے چوں کہ والدین حیات نہیں تھے اس لیے وہ ان رشتوں کی محبت اور جدائی کے غم سے آگاہ تھے۔ ان کے پیار اور دل جوئی نے میرے امی سے دوری کے غم کو قدرے کم کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

جب تک ابو زندہ رہے گھر میں امی کی حکمرانی رہی، لیکن ابو کے انتقال کے بعد جب بھائیوں نے گھر سنبھالا تو یہ چھوٹی سی ریاست بھابیوں کے حصے میں آ گئی۔

میرے دونوں بچوں کی پیدائش امی کے گھر ہوئی تھی۔ اس موقع پر ماں ہی ایسی ہستی ہے جو دوست بھی ہوتی ہے اور رفیق بھی۔ میری امی نے اس مرحلے پر میرا خیال رکھنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ میرے آنے پر خوش تو بھائی بھی تھے، لیکن بھابیوں کو میرا آنا کچھ خاص اچھا نہیں لگا تھا۔ تب ہی تو بڑی بھابی اپنی ماں کی طبیعت کا بہانہ کر کے میکے رخصت ہو گئیں تھیں۔ اور مجھے زیادہ تکلیف اس وقت پہنچی جب مجھے پتا چلا کہ بھابی کی والدہ ٹھیک ہیں اور بھابی کے ساتھ تقریبات وغیرہ اٹینڈ کر رہی ہیں۔

میں نے بھابی سے شکوہ کیا تو وہ اس کا برا مان گئیں کہ ہمیں تو سوائے شکایتوں کے اور کوئی کام نہیں ہے۔ میرا دل ٹوٹ گیا امی پر اکیلے ہی بہت کاموں کا بوجھ پڑا ہوا تھا اس لیے میں نے ان کے روکنے کے باوجود واپس آ گئی اور خفگی کے طور پر بہت عرصے میکے نہیں گئی۔

امی مجھے بہت یاد کرتی تھیں لیکن بس میں فون پر ہی ان سے بات کر کے اپنے دل کو تسلی پہنچا لیتی تھی۔ البتہ اُن کے گلے لگنے کی تشنگی ہمیشہ مجھے ایک عجیب سی بے قراری ہمکنار رکھتی۔ میں بھی جانتی تھی کہ امی کہ دل میں بھی مجھ سے ملنے کی کتنی تڑپ ہے لیکن پھر بھی میری انا مجھے وہاں جانے سے روک دیتی۔

☆......☆......☆

ایک دن اچانک امی کی طبیعت کی خرابی کا فون آیا تو میں سب گلے شکوے بھلا کر ماں سے ملنے کے لیے دوڑ پڑی، لیکن میرے پہنچنے تک امی ہم سب کو چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ وہ دن میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔ جب میرا دُکھ درد بانٹنے والی وہ عظیم ہستی منوں مٹی تلے جا سوئی۔

مجھے امی کے انتقال کے دُکھ کے علاوہ اس بات کا قلق بھی تھا کہ آخری وقت میں اپنی امی کی خدمت نہ کر سکی اور نہ ہی ان سے معافی مانگ سکی۔ اس احساس ندامت نے میرے غم میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

امی کے انتقال کے چند دن بعد میں واپس کراچی آ گئی۔ ایک دن میں بچوں کو اسکول سے گھر لا رہی تھی تو دیکھا کہ پڑوس والے گھر کی دہلیز پر ایک بوڑھی خاتون بیٹھی رو رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر ان سے سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا، بیوی بچوں کے ہمراہ بیرون ملک چلا گیا ہے، جبکہ ان خاتون کا ویزا نہیں لگ سکا تھا۔ اسی لیے انہیں چھوڑ کر جانا پڑا۔ انہیں روتا دیکھ کر میرا دل بھی بھر آیا تھا، کیوں کہ ان کے چہرے میں مجھے اپنی ماں نظر آ رہی تھی۔

کچھ عرصے تک تو میں نے دیکھا کہ ان خاتون کے رشتے دار آ کر ان کے کھانے پینا کا انتظام کر دیتے تھے، لیکن آہستہ آہستہ یہ سب کچھ معدوم ہوتا گیا۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ تنہا بوڑھی عورت اپنا خیال کس طرح رکھے گی، جبکہ بیٹا بھی دیارِ غیر جا کے غیر ہو گیا تھا۔

میں نے بھی دو چار دفعہ اس سے بات کی تو محسوس ہوا کہ وہ خود اپنی ماں کو اپنے پاس بلانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میں نے اعجاز سے اجازت لی اور ان خاتون کو اپنے گھر لے آئی تھی۔

☆......☆......☆

ماں جی کی خدمت کر کے میرے ضمیر کا کچھ بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا۔ میں ان کے لیے وہ سب کچھ کرنا چاہتی تھی جو میں اپنی امی کے لیے کر سکتی تھی اور آج وہ شفیق سایا بھی مجھ سے دُور ہو گیا تھا۔

اعجاز نے ان کے بیٹے کو فون کر کے ماں جی کے انتقال کی خبر سنائی تو اس نے گویا احسان کرتے ہوئے کہا کہ وہ تدفین کا خرچہ بھیج دیتا ہے۔ اس کی کمپنی اسے یوں اچانک جانے کی اجازت نہیں دے گی۔ یہ سن کر اعجاز نے شکریہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

محبت، شفقت، رحمت کا نام ماں ہے۔ ماں لفظ اَدا ہوتے ہی منہ میں چاشنی سی گھل جاتی ہے۔ تُف ہے ایسی اولاد پر جو اس رحمت کو بوجھ سمجھتی ہے۔

ماں جی کے انتقال کے بعد میں ہر وقت افسردہ اور غمگین رہنے لگی تھی۔ میری اس کیفیت سے اعجاز اور بچے پریشان تھے۔ اس سانحے کے تقریباً دس دن بعد میں خواب دیکھتی ہوں کہ میری والدہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ جب وہ سلام پھیرتی ہیں تو میں ان کے نزدیک جاتی ہوں اور ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں اور رونے لگتی ہوں۔ امی مجھے گلے سے لگاتی ہیں اور بے تحاشا پیار کرتی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ میری بیٹی بہت پیاری ہے، میں اس سے کس طرح ناراض ہو سکتی ہوں۔ اسی طرح روتے ہوئے میری آنکھ کھل گئی۔

مجھے کمرے میں امی کی مخصوص مہک محسوس ہو رہی تھی، شاید میری ماں نے مجھے واقعی معاف کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

افسانہ

"میں چاہوں تو زبردستی کر سکتا ہوں۔ تیرا نکاح ہوا ہے مجھ سے۔ تیری ماں کچھ نہیں کر سکے گی لیکن میں اس کو دکھ نہیں دینا چاہتا۔ اس کو کہہ کہ خود ہی مان جائے اور تجھے رخصت کردے میرے ساتھ، میں تجھے کراچی لے جاؤں گا، بلکہ وہ بھی......

محبت اور فرض کے درمیان پل صراط، ایک افسانہ

وہ اپنے وجود کو بہ مشکل کھینچتی ہوئی آہستہ آہستہ برگد کے پیڑ کی جانب بڑھی تھی، گاؤں کے کچے مکانوں کے نسبتاً ایک جانب برگد کا ایک بڑا سا قدیم پیڑ تھا جس کی شاخیں شامیانے کی طرح دور

تک پھیلی ہوئی تھیں اور اس پیڑ کے نیچے گہری سیاہ آنکھوں اور گھونگریالے بالوں والا مرتضٰی بیٹھا اس کا انتظار کررہا تھا۔ یہ وہی پیڑ تھا جہاں ان دونوں کا بچپن بھاگتے دوڑتے گزرا تھا اور جس کے سائے میں یہ لوگ جون جولائی کی سخت گرمیوں میں سکون کا سانس لیتے تھے۔

دو بجے کا وقت تھا۔ گاؤں کے لوگ ستا رہے تھے، اسکول سے آتے ہوئے کچھ دیر اس کے سائے میں بیٹھنا ان کا مشغلہ تھا اور کچھ کھیتوں میں مگن تھے، تو کچھ اپنے روزمرہ کے کام سرانجام دے رہے تھے۔ اس نے غور سے برگد کے پیڑ کو دیکھا جس کی جڑیں پاتال کی گہرائیوں میں پھیلی ہوئی تھیں، اس کے موٹے سے تنے پر مرتضٰی نے چاقو سے اپنا اور اس کا نام کھودا تھا اور پھر بڑے پیار سے بولا تھا۔

''سوہنی یہ نام اس برگد کے تنے پر ہی نہیں بلکہ میں اپنے دل میں بھی کھود رہا ہوں۔ اب کوئی انسان بھی اس نام کو مٹا نہیں سکے گا۔'' شرم کی لپٹوں سے سوہنی کا چہرہ قندھاری انار جیسا ہوگیا تھا۔

''کیا تُو مجھ سے اتنا پیار کرتا ہے۔'' سوہنی نے چہک کر پوچھا۔

''ہاں سب سے زیادہ۔ اتنا جتنا کراچی کے ساحلوں پر پانی ہوگا، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔'' وہ جذب کے عالم میں بولا تھا، جبکہ وہ اس کی مثال پر جھنجلا گئی تھی اور اسے قہر آلود نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''تُو ہر وقت اس شہر کا ذکر کیوں کرتا ہے۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں ہے، آئندہ تُو میرے سامنے اس کا ذکر نہ کریو۔''

''کیوں ذکر نہ کروں۔ مجھے تو وہ شہر بہت پسند ہے۔ میری جان ہے وہ۔ میں نے دو چیزوں سے ٹوٹ کر محبت کی ہے ایک تجھ سے اور ایک اس شہر سے۔''

''یہ جان کر بھی کہ اس شہر نے ہمیں اجاڑ دیا ہے۔ اس نے میری ماں سے اس کا شوہر چھینا ہے اور مجھ سے میرا باپ چھینا ہے۔ اس شہر نے میرے باپ کی لاش تک نگل لی ہے۔ میری ماں جہاں میرے باپ کا انتظار کرتی رہ گئی تھی، لیکن میرا باپ نہیں آیا، میری ماں کا انتظار آج تک ختم نہیں ہوا۔'' وہ روہانسی ہوکر بولی تھی۔

''پاگل نہ ہو تو...... او جھلی! بھلا شہر بھی کسی انسان کو کھاتے ہیں۔ خالو کی باری آئی ہوئی تھی، چل بسا، جیسے میرا باپ چل بسا تھا۔ ان کا ایکسیڈنٹ سکھر میں ہوا تھا۔ اب کیا میں سکھر سے نفرت کرنے لگوں گا۔ تُو ایسی باتیں نہ سوچا کر، ویسے بھی بڑے بزرگ بولتے ہیں محبوب کے وطن سے اتنی ہی محبت کرو، جتنی کہ تم محبوب سے کرتے ہو۔ اب تو مجھے دیکھ! مجھے یہ گاؤں صرف تیری وجہ سے پسند ہے۔ میں جو ہر تین ماہ بعد دوڑا ہوا آتا ہوں صرف تیری وجہ سے، کیوں کہ میری سوہنی یہاں رہتی ہے۔''

☆......☆......☆

اس کا پیر گیلی مٹی میں رپٹا تھا، وہ پھسلی تھی، لیکن اس نے اپنا توازن برقرار کرلیا تھا۔ اس نے یادوں کے بھنور سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں اپنے قدم رکھ لیے تھے۔

وہ عین اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ ماتھے پر اَن گنت بلوں کے جال تھے۔ آنکھوں میں بے رُخی و بے اعتنائیوں کی پرچھائیاں جگمگانے لگی تھیں۔ اس کی نگاہوں سے التفات و محبت کے تمام جذبات کسی نے نوچ ڈالے تھے۔ سوہنی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ محبوب سامنے تھا لیکن محبوبیت کہیں کھوگئی تھی، محبت کے سب رنگ بدگمانی کی دھوپ نے سکھا دیے

تھے۔

"پھر کیا فیصلہ کیا ہے تُو نے سوہنی؟" اس کی آواز میں سے چاشنی و شیرینی کسی نے کھینچ لی تھی اور رعونت نے اس کا لہجہ بدہیئت کر دیا تھا۔

"تُو اماں کی بات کیوں نہیں مان لیتا۔ وہ اس شہر سے ڈرتی ہے۔ وہ مجھے کھونے سے ڈرتی ہے۔"

"تیری اماں میری بات کیوں نہیں مان لیتی۔ تجھے رخصت کیوں نہیں کر دیتی میرے ساتھ۔" اس کے قہر بار لہجے نے سوہنی کا دل کپکپا دیا تھا۔

"میں اس کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ اس کو کیسے یہاں اکیلا چھوڑ کر پردیس اتنی دور چلی جاؤں۔" اس کی آواز پست تھی، بے بسی و لاچاری اس کی آواز سے عیاں تھی۔

"تو پھر مجھے چھوڑ دے۔ وہ تجھے مجھ سے چھین لینا چاہتی ہے سوہنی، لیکن میں ایسا نہ ہونے دوں گا۔ تُو میری ہے صرف میری! اپنی ماں کو بتا دینا۔" وہ رعونت سے بولا تھا۔

"وہ اکیلی ہے، بوڑھی ہے مرتضیٰ۔ میں اس کو کیسے چھوڑ دوں۔ تُو اپنی ضد چھوڑ کے یہیں آ جا۔ پہلے بھی تو تُو یہاں رہتا تھا۔ وہاں گھر بنا کر تُو یہاں کے گھر، لوگوں کو بھلا بیٹھا ہے۔"

سوہنی نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ آنسوؤں کے گولے حلق میں پھنس گئے تھے۔

وہ اس کو کیسے سمجھاتی کہ ماں کا زرد متغیر اور مایوس چہرہ ہمہ وقت اس کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔ وہ تنہائی کے آنے والے لمحوں کے بارے میں سوچتی تو دانتوں سے لب کچل ڈالتی تھی۔ پسینے کی دھاریں اس کی پیشانی تر کر دیا کرتی تھیں۔ سوہنی اس کے بڑھاپے کا واحد سہارا تھی۔ اس نے اس سے ہزاروں امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ اس کی اماں کی امیدوں کے تمام روشن راستے سوہنی پر آ کر ختم ہو جاتے تھے اور سوہنی...... وہ تو مرتضیٰ کی محبت کے سمندر میں ڈوب گئی تھی، اب اُبھرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ کبھی کبھی سوہنی کو ایسا لگتا جیسے وہ ایسی منجدھار میں ڈوب گئی ہے جس سے کسی صورت باہر نہیں آ سکتی۔

"میں چاہوں تو زبردستی کر سکتا ہوں۔ تیرا نکاح ہوا ہے مجھ سے تیری ماں کچھ نہیں کر سکے گی لیکن میں اس کو دُکھ نہیں دینا چاہتا۔ اس کو کہہ کہ خود کی مان جائے اور تجھے رخصت کر دے میرے ساتھ، میں تجھے کراچی لے جاؤں گا، بلکہ وہ بھی ہمارے ساتھ چلے۔" مرتضیٰ نے ہزار بار کہے گئے الفاظ دوبارہ دہرائے تھے، جبکہ سوہنی کا اب وہاں کھڑے رہنا محال ہو گیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کبھی نہیں مانے گا۔ اس کو دلیلوں سے، مثالوں سے، بحث سے نہیں سمجھایا جا سکتا تھا اور میٹرک پاس سوہنی یہ کام کسی صورت بھی سرانجام نہیں دے سکتی تھی۔ وہ آگے بڑھ گئی لیکن اس نے اس کا بازو کھینچ کر اس کو اپنے مقابل کھڑا کر دیا، پھر اس کو قریب کرتے ہوئے بولا۔

"سوہنی تُو نے وعدہ کیا تھا کہ تُو میرا ساتھ دے گی۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ میرا سب کچھ وہاں ہے، یہاں تو صرف تُو ہے، جس کی وجہ سے میں ہر بار آ جاتا ہوں۔ اپنی ماں کو بتا دے کہ تجھے میرے ساتھ جانا ہے۔ اگر تُو انکار کرے گی تو میں کبھی واپس نہ آؤں گا۔ میں قسم کھا رہا ہوں اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی۔ سوہنی میں تجھے خود پر حرام کر لوں گا اگر تُو نے میری بات نہ مانی تو۔"

سوہنی نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے مرتضیٰ کو دیکھا۔ اس کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا دل بند ہو جائے گا۔ وہ اس کو غور سے دیکھنے لگی تھی۔ کیا واقعی وہ اتنا اچھا، اتنا خوب صورت تھا یا اس کا واہمہ تھا۔

اس کی نظروں کا دھوکا تھا۔ اصلیت کی پرتیں کتنی تیزی سے اُتر کر سامنے کا منظر واضح کر رہی تھیں، لیکن پھر بھی دل تھا کہ ہمہ وقت اس کے نام کی مالا جپتا تھا۔ آنکھیں ہمہ وقت اس کو دیکھنے کے لیے بیتاب رہتی تھیں۔

''سوہنی اپنی ماں کو سمجھا۔'' وہ مصر ہوا۔ اس نے اپنے مضمحل قدموں کو بہ مشکل گھسیٹا تھا۔

☆......☆

''پھر تُو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' اماں اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔

''میں نے کیا فیصلہ کرنا ہے اماں، جو قسمت میں ہوا ہو جائے گا۔ وہ اکیلا چلا جائے گا کراچی۔ اس کو جانا ہوگا۔ اکیلے مسافر کبھی رکتے ہیں بھلا۔''

اس نے مایوسی سے کہا اور لکڑیاں جلانے لگی تھی اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ لکڑیاں جلنے کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھی جلنے لگی تھیں۔ اس نے دھوئیں سے سرخ روتی ہوئی آنکھوں سے اپنی ماں کو دیکھا اور پھر نظریں چرا گئی اس کی ماں جانتی تھی کہ اس کی بیٹی جوانی کی اس دہلیز پر کھڑی ہے جو خواب آلود سرشاریوں کا میٹھا میٹھا درد لیے ہر شے میں پھولوں کی خوشبو اور ہر آواز میں گیتوں کی لے ڈھونڈ لیا کرتی تھی۔ دھوئیں سے سرخ اور آنسوؤں سے ڈبڈباتی آنکھوں سے کیا دیکھ پاتی۔ آنسوؤں نے اس کو کچھ نہ دیکھنے دیا تھا نہ اپنی ماں کا پچھتاوا، نہ اس کی آنکھوں میں تیرتے بارش کی پہلی بوند جیسے موٹے موٹے آنسو۔ وہ کچھ بھی نہ دیکھ پا رہی تھی۔ اس کی نظریں آگ کے شعلوں میں جلتے اپنے عہد و پیماں، مرتضٰی کا مضمحل چہرہ اور اپنی ماں کی آرزوؤں کو دیکھنے میں منہمک تھیں۔

☆......☆......☆

اس کی ماں نے مرتضٰی اور سوہنی کی خواہشات کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

آج اس کی رخصتی کا دن تھا۔ سہیلیاں گیت گا رہی تھیں۔ وہ خوش تھی، بہت خوش۔ اتنی خوش کہ لگتا تھا کہ ساری کائنات کی خوشیاں سمٹ کر اس کے دامن میں آ گئی ہوں اور مرتضٰی تو باہر ناچ رہا تھا۔ سب یار دوست اس کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ اماں اس کے واری صدقے جا رہی تھی اور آخر کار وہ کٹھن اور جان لیوا وقت آ گیا جب اس کو رخصت ہو کر یہ گاؤں، اپنی سہیلیاں اور اپنی ماں کو چھوڑ کر چلے جانا تھا۔

وہ محبوب اور ماں کے درمیان کھڑی دو حصوں میں منقسم باری باری کبھی اپنی ماں اور کبھی مرتضٰی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔ اس نے استفہامیہ انداز میں اپنی ماں کو دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو اب میں کیا کروں۔ اس کی ماں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ ماں سے لپٹ کر زار و قطار رو دی، اس کی آنکھوں کا کاجل بہہ کر اس کے گالوں پر عجیب سی لکیریں بنا گیا تھا۔ ماں نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کے گال صاف کیے اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ وہ اپنے گھر کی ڈیوڑھی سے صحن اور صحن سے مرتضٰی کی معیت میں صدر دروازے تک آ گئی تھی۔ اس نے مڑ کر اپنی ماں کی جانب دیکھا، وہ اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں وحشت، بے سکون، اضطراب کے سائے ناچ رہے تھے جو کہ اس کا چہرہ متغیر کر رہے تھے۔ اس نے یہ رنگ تو کبھی اتنے واضح اپنی ماں کی آنکھوں میں نہیں دیکھے تھے۔

''اماں میں جا رہی ہوں۔'' اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ اماں نے جواب دینے کے بجائے اس کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دی۔

''خالہ ہم کراچی پہنچ کر تجھے فون کریں گے۔'' مرتضٰی نے خالہ کو تسلی دی تھی۔ وہ طمانیت سے

مسکرادی تھی۔

"اماں میری فکر نہ کرنا۔ اماں تُو سمجھ رہی ہے نا۔" اماں کی خاموشی اس کا دل چیر رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی تھی شاید کہیں نہ کہیں اس کی ماں ناراض ہے اس سے۔

اسے اپنی ذات سے، خود غرضی، مطلب پرستی کی بو آنے لگی تھی۔ اس کے ضمیر نے ملامت کے کئی کوڑے اس کے اعصاب پر برسائے تھے کہ بوڑھی ماں کو تنہا چھوڑ کے جانا زیادتی ہے۔ باپ کی موت کے بعد اس کی ماں نے ساری جوانی اس کے لیے وقف کردی تھی۔ وہ اپنی ماں کا واحد سہارا تھی۔ اس کا ارادہ متزلزل ہونے لگا تھا، لیکن مرتضیٰ کے مضبوط ہاتھ نے اسے اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کھینچا۔

تھوڑی دیر پہلے والی سوہنی جو ماں کی محبت میں تڑپ رہی تھی، مچل رہی تھی، وحشت زدہ ہو رہی تھی، بدل کر مرتضیٰ کی ہوگئی تھی۔

"سوہنی میری پیاری سوہنی میں تیرے ساتھ ہوں۔ تُو دل چھوٹا کیوں کرتی ہے۔" مرتضیٰ کی گمبھیر آواز میں گم ہو کر وہ سحر زدہ سی گھر سے باہر نکل آئی تھی۔

☆......☆☆

لہلہاتے کھیتوں نے اس کو اپنی جگہ متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ پرانے برگد کے درخت نے اس کے پیر میں زنجیریں ڈالنے کی کوششیں کی تھیں، لیکن وہ مرتضیٰ کا ہاتھ پکڑے پگڈنڈی پر چلتی رہی۔ اس نے مڑ کے بار بار اپنے گھر کی طرف دیکھا، ماں دروازے پر کھڑی تھی اور آخری بار مڑ کے دیکھنے پر وہ اس کو زار و قطار روتی ہوئی نظر آئی تھی۔

کھیتوں کی دلکشی، گاؤں کی خوب صورتی، برگد کے درخت کی کشش، حتیٰ کے ماں کے پیار نے بھی جو کام نہ کیا تھا، وہ اس ماں کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں نے کر دکھایا تھا، اس نے اپنا ہاتھ مرتضیٰ کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ مرتضیٰ چونک کر اس کی جانب بڑھا تھا۔

"کیا ہوا، کیا چلا نہیں جا رہا ہے؟ راستے کچے ہیں اور تیری ہیل اونچی ہے۔" وہ متفکر سا اس کی ہیل کی جانب دیکھنے لگا تھا۔

"نہیں مرتضیٰ میری ہیل ٹھیک ہے، بس مجھے آگے کے راستے نظر نہیں آ رہے، مجھے صرف پیچھے چھوٹ جانے والے راستے یاد ہیں۔ برگد کا درخت، کھیتوں کی ہریالی اور اپنی ماں۔ میں دو قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔"

مرتضیٰ بھونچکا رہ گیا تھا۔ اضطراب اس کی آنکھوں سے عیاں تھا۔ چہرے پر ہوائیوں نے اس کا چہرہ متغیر کر دیا تھا۔

"میں سمجھا نہیں تُو کیا کہہ رہی ہے۔" وہ تھوک نگل کر ٹپٹا کر بولا۔

"میں اپنی ماں کو نہیں چھوڑ سکتی مرتضیٰ، یہ جانتے ہوئے کہ اب کی بار میں تیرے ساتھ نہ گئی تو، تُو مجھے خود پہ حرام کرلے گا، تُو سارے رشتے توڑ دے گا۔ میری سالوں کی محبت کو ملیا میٹ کر دے گا۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی مرتضیٰ میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میری ماں کے آنسوؤں نے مجھے اندھا کر دیا ہے۔ آگے کے رستے دھندلا دیے ہیں، میں کیا کروں۔ میں اس کو تنِ تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔" وہ زار و قطار روتے ہوئے اندھا دھند اپنے گھر کی جانب بھاگنے لگی تھی۔ اب نہ تو اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور نہ ہی راستے دھندلائے ہوئے تھے۔

☆☆......☆☆

لمحوں نے خطا کی تھی

"بابا...... ہماری کوئی آنٹی یا ماموں نہیں تھا۔" صبا نے جھجک کر پوچھا۔ "بس ایک ماموں تھا تمہارا۔" وہ دور خلاؤں میں کہیں کھویا ہوا تھا۔ "تھا...... سے کیا مطلب" صبا نے ڈرتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا کہیں فاخرہ نہ آجائیں۔ اس خیال سے وہ......

دوسری کڑی اُس دوشیزہ کی کتھا، جس کی ایک لمحے کی خطا نے اُس کی ساری زندگی کو مجسم خطا بنا ڈالا تھا

"ہیلو باربی ڈول کیسی ہو" امن کالج گیٹ سے ابھی اندر داخل ہوئی تھی عروہ کو کل سے بخار تھا۔ اس لیے وہ آج کالج نہیں آئی تھی۔ امن کو فرقان اپنی بائیک پر چھوڑ کر گیا تھا۔

"ہیلو کیسی ہو" امن کو کسی لڑکے کی آواز بالکل قریب سے سنائی دی تھی۔ یہ آواز پہلے بھی جب اُبھری تو اس کو شبہ ہوا مگر اب پھر...... امن نے اپنے آگے پیچھے، دائیں بائیں کسی انجانی لڑکی کو کھوجا مگر ارد گرد کوئی نہیں تھی تو پھر کس کو مخاطب کیا۔ وہ اُلجھی۔

"میں تم سے ہی مخاطب ہوں گڑیا" اُس اجنبی نے امن کی حیرانی بھانپ لی تھی جبھی چند فرلانگ کا فاصلہ مٹا کر وہ امن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ بوکھلا کر رہ گئی، ایک تو اکیلی تھی، دوسرا انجانے یہ کون تھا اور کہاں سے وارد ہوا تھا۔ مارے گھبراہٹ کے امن کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگنے لگیں، اُس کے قدموں میں تیزی در آئی دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

"اُس دن تم نے بہت اچھا ڈانس کیا۔" شاید وہ تعریف کر رہا تھا مگر امن کو لگا جیسے کسی نے لوہے کی دہکتی کیل اُس کے بدن میں چبھو دی ہو۔ وہ اُس کی بے تکلفی پر گنگ، بے ترتیب سانسوں کو سنبھالتی تقریباً بھاگنے لگی۔ وہ بھی امن کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ مسلسل امن کو کنفیوژ کر رہا تھا۔ امن نے اپنی فائل پر گرفت مضبوط کی اور لڑکھڑاتے قدموں کو سختی سے جمایا۔

"میں تو بے حد متاثر ہوا" کیا ماہر رقاصہ کی طرح ناچی ہو، قدم اور بدن یوں تھرک رہے تھے کہ میں تو عش عش کر اُٹھا۔" وہ جو کوئی بھی تھا بہت ڈھیٹ اور چپکو تھا اُس کے الفاظ نے امن کے تن بدن میں آگ لگا کر رکھ دی تھی۔ تمسخرانہ لب ولہجہ لگا تھا اُسے۔ اے کاش عروہ ساتھ ہوتی، آج تو ضویا بھی نظر نہیں آ رہی تھی امن اُس کی گہری نگاہوں سے اُس کے تابڑ توڑ سوالوں سے حواس کھو رہی تھی۔ اس سمے تنہا ہونے کا احساس اُسے سراسیمہ کر گیا۔

"میرا نام سجاد بلوچ ہے۔ میں نایاب لودھی کا کزن ہوں۔" وہ اب امن سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر امن سے ہم کلام اپنا تعارف کروا رہا تھا۔

"میری بلا سے۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"مجھ سے کچھ کہا میم۔" یعنی کہ حد ہے بے شرمی اور ڈھٹائی کی، جان نہ پہچان، امن نے ناگواری اور

برہمی سے اُسے دیکھا امن کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کی طبیعت صاف کر ڈالے مگر اکیلی......

سجاد نے اُس کی بے زاری کو ٹھٹھک کر دیکھا امن کا چہرہ غصے سے بھاپ چھوڑ رہا تھا۔نخوت و بے رخی عیاں تھی مگر اُس کے ہاتھوں کی لرزش، تھرتھراتے ہونٹ کچھ بھی سجاد سے چھپا ہوا نہیں تھا۔وہ ہنسی تمسخر اُڑاتی ہنسی، کسی کی مجبوری سے لطف اندوز ہونے والی ہنسی ہنستا رہا...... تا دیر۔

''اوکے عروہ رحمان چلتا ہوں۔'' وہ سرمستی کے عالم میں جھومتا، شوخی سے کہتا واپس پلٹ گیا اور امن حواس باختہ سی اُسے جاتا دیکھتی رہی اُس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ وہ چھوٹے موٹے جھوٹ بول لیتی تھی چھوٹے چھوٹے دھوکے وہ اپنی مما کو دیتی رہتی تھی مگر کسی لڑکے سے ٹکرانا پہلا موقع تھا۔ اُس کے حقیقتاً ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے تھے۔ اس ساری غیر متوقع صورتِ حال کی وجہ سے اُس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔

''کون تھا یہ۔'' تبھی نیہات ضمیر کہیں سے نکل کر سامنے آ گیا۔ امن پہلے ہی تپی ہوئی تھی۔

''کون۔'' اُس نے الٹا سوال داغ دیا۔ امن محض دانت کچکچا کر رہ گئی۔

''وہ'' نیہات نے ابرو کی جنبش سے ذرا سا ابرو اچکا کر گیٹ کی طرف اشارہ کیا تو امن کا دل اُچھل کر حلق میں دھک دھک کرنے لگا۔ وہ جاتے ہوئے واپس پلٹا، ہوا میں ہاتھ بلند کر کے پُرجوش انداز میں ہاتھ ہلا کر ''بائے'' کیا اور گیٹ پار غائب ہو گیا۔

''کون تھا بتاؤ۔'' نیہات نے اپنے الفاظ دہرائے۔

''اوہو مجھے نہیں پتا۔'' امن نے آنکھیں بند کر کے سانس اندر کھینچی پھر سانس خارج کر کے تن من کرتی پاؤں پٹختی جارحانہ انداز میں گھورتی کالج عمارت میں گم ہو گئی۔

☆......☆......☆

رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ سناٹے اور تاریکی کا راج تھا، امن کی آنکھوں سے نیند ہاتھ چھڑا کر (دھیمی سی سلگتی سی آنچ دے کر) بھاگ نکلی تھی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ دو گہری سیاہ آنکھیں امن کے سراپے سے گویا چپک کر رہ گئی تھیں۔ دل عجیب سی لے پر کر دھڑک دھڑک کر شور بپا کیے بیٹھا تھا۔ امن اپنی کیفیت سے دہل گئی۔

''وہ کون تھا؟'' امن کے ذہن میں سوال اٹھا۔

''مجھے کیسے جانتا تھا'' ایک اور سوال دماغ میں گردش کرنے لگا۔

''مگر وہ تو مجھے عروہ رحمان کے نام سے پکار رہا تھا'' اس کا ذہن اُلجھتا جا رہا تھا۔ بہت سارے سوال اپنا جواب پانے کے لیے مچل رہے تھے کلبلاتے گردش کر رہے تھے۔

''کیا وہ مجھے عروہ سمجھ رہا ہے'' عجیب سی اُلجھی سی گتھی تھی، اُس کا دل سکڑ رہا تھا پھر پھیلتا سکڑ جاتا۔ بے قراری جب حد سے سوا ہوئی، امن اُٹھ بیٹھی۔ اپنے اطراف بچھی چارپائیوں پر نگاہ گئی، سب لوگ پُرسکون نیند سو رہے تھے۔ سب لوگ چھت پر تھے۔

امن کو اپنے اندر حبس اور گھٹن محسوس ہوئی، امن نے اپنی جلتی آنکھوں کو بند کیا تو تپش اور جلن نے گویا آنکھوں کو انگارہ بنا ڈالا تھا۔ وہ دم سادھے بیٹھی رہی پھر بے بسی سے دوبارہ لیٹ گئی۔ بدن کروٹوں کی وجہ سے دکھ رہا تھا۔ مگر نیند آنکھوں پر مہربان ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''وہ کون تھا۔'' امن نے آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھا۔ سوچیں امن کو اپنے ساتھ بھگائے لیے جا رہی تھیں۔ بے تابی، تجسس، خوف سب مل کر اُسے کھینچ رہے تھے کبھی دلِ پاگل ہو کر خمار بھری انگڑائی لیتا ہاتھ پکڑ کر خوابوں کے نگر میں اُڑانے لگتا مگر اگلے ہی پل کا وہ ٹھٹھر کر سہم جاتی۔ کوئی نادیدہ ڈر خوف اُسے روکنے لگتا۔ سب خوابوں پر غالب آنے لگتا...... مگر رکتا کون ہے؟ دل کے آگے ٹھہرنا اتنا آسان کہاں ہوتا ہے، عشق کی راہیں دشوار سہی، عشق جتنا بھی مہنگا پڑے دل اُسی راہ گامزن ہونے کے لیے مچلتا بھی بہت ہے۔

'سجاد بلوچ' امن کے لبوں نے اُس 'ہینڈسم' کا نام چھوا، اک ٹھنڈک سی من میں اُترتی چلی گئی۔ تاریکی کے سینے سے چاندنی نمودار ہوکر اپنی سفیدی اُجالنے لگی، سیاہ بالوں سے چاند بھی نکل آیا، رات روشن ہوگئی۔ تاحد نظر چاند اور تارے آسمان کے بدن پر جگمگانے لگے۔ امن نے مبہوت ہوکر پوری محویت سے اِس منظر کی فسوں خیزی دیکھی۔ دیکھتی رہی مگر یہ بھی لمحاتی کیفیت ثابت ہوئی، اُس کی ذہنی رو پھر 'اُسی' کی طرف بھٹک گئی۔ وہ اُسے سرے سے سوچنا ہی نہیں چاہ رہی تھی مگر جہاں بے بسی کی انتہا ہو، جب خود پر اپنا اختیار نہ رہے، وہاں جھنجلاہٹ طاری ہوکر انسان کو بے دم کردیتی ہے۔ محبت اپنے پنجوں میں دبوچ لیتی ہے۔ مات دینے پر تل جاتی ہے۔ ہار مان لینے پر اُکساتی ہے۔

''اُف میرے خدایا'' وہ اُکتا کر پھر اُٹھ بیٹھی دل اور ذہن میں جنگ چھڑ گئی تھی۔ ذہن سوچوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ حالانکہ امن باتوں کو گہرائی اور گیرائی سے جانچنے کی عادی تو تھی بھی نہیں۔ ساری رات ایسی ہی تھی، بے سکون، بے چین، مضطرب۔

☆......☆......☆

''مجھے دہی کھانا ہے'' ہنزہ نے کہا تو لبنیٰ نے جھٹ پیالے میں دہی نکالا، چینی ملائی اور پیالا ہنزلہ کے سامنے رکھا اور خود اُسے دہی کھلانے لگی۔ وہ بہت تعاون کرنے والا، بات کو سمجھ جانے والا بچہ تھا۔ پنجم میں تھا جبکہ حذیفہ ساتویں میں تھا۔ سونے کا بے حد شوقین، شرارتی بھی بہت تھا۔

''میں ذرا حذیفہ کو دیکھ لوں، مجال ہے ذرا جلدی اُٹھ جائے۔ عین وقت پر اُٹھانا پڑتا ہے۔'' لبنیٰ اُٹھی اور حذیفہ کو جگانے چلی گئی۔

''اُٹھو بیٹا اسکول سے دیر ہورہی ہے۔'' لبنیٰ نے اُسے پیار سے جگایا حذیفہ نے کسلمندی سے کروٹ بدل لی۔

''اُٹھو میری جان۔'' وہ لوگ چھت پر سوتے تھے مگر بچے صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد کمرے میں پنکھا چلا کر سوجاتے تھے۔ لبنیٰ بچوں کی تربیت کے لیے سختی کرتی تھی مگر زیادہ نہیں۔ بس اتنی ہی جتنی ضرورت تھی، سمجھاتی بھی تھی اونچ نیچ۔

حذیفہ اُٹھ کر واش روم میں چلا گیا تو لبنیٰ نے دیکھا امن ابھی تک بے سدھ سورہی تھی۔ لبنیٰ کو تشویش ہوئی وہ تو سمجھ رہی تھی کہ شاید امن اپنے کمرے میں کالج کے لیے تیار ہورہی ہے۔

''امن بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔'' لبنیٰ نے آگے بڑھ کر امن کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، امن نے آنکھیں کھولیں اُس کی آنکھیں گلابی ہورہی تھیں رات جگے سے۔

''تم اُٹھی ہی نہیں بیٹا' کیا بات ہے' ہر ماں کا دل ایسا ہی ہوتا ہے پل میں پریشان ہونا۔

''بس مما رات ٹھیک سے سو نہیں پائی، اس لیے سر میں درد ہے۔''

''دبا دوں بیٹا۔''

''نہیں تو مما، ٹھیک ہوجائے گا'' وہ اُٹھ بیٹھی اور لبنیٰ کا چہرہ دیکھنے لگی۔ بے لوث محبت کرنے والی اندھا دھند محبت بغیر صلے اور ستائش کے، بے ریا محبت'

''مما......'' امن نے بے خیالی سے پکارا۔

''جی بیٹا بولو۔'' لبنیٰ نے محبت پاش نگاہوں سے دیکھا۔

''آپ شادی سے پہلے نوکری کرتی تھیں نا؟''

''جی بیٹا۔''

''پھر چھوڑی کیوں۔''

''بس بیٹا تمہارے بابا کو خواتین کا نوکری کرنا پسند نہیں تھا اور مجھے بھی یہی مناسب لگا کہ مجھے نوکری چھوڑ دینی چاہیے، تاکہ میں گھر میں رہ کر اپنے بچوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرسکوں۔ اچھا اُٹھو کالج کی تیاری کرو باقی باتیں ناشتے کی ٹیبل پر۔''

امن اُٹھی اور تیار ہونے چلی گئی اور جب وہ ناشتے کی ٹیبل پر آئی تو دیکھا اب لبنیٰ حذیفہ کی ناز برداریوں میں مگن تھی۔

''مما کیا فاخرہ آنٹی کو بھی نوکری چھوڑ دینی چاہیے تھی'' نجانے آج امن کیا جاننا چاہ رہی تھی۔

''بیٹا اُس کی مجبوری تھی کمانا، اپنی اولاد کو پالنا' اُس نے اپنی جوانی کی ساری توانائیاں اپنی فیملی پر لگا دیں۔ خدا اُس کی اولاد کو نیک بنائے۔ ماں کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے۔'' لبنیٰ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی تو اُس کی آنکھوں میں نمی سی در آئی تھی۔

''مما بابا اور تایا رحمان آنٹی فاخرہ کو بُرا کیوں سمجھتے ہیں۔ کیا وہ بُری عورت ہیں۔'' امن نے بریڈ پر جیم لگا کر کھاتے ہوئے پوچھا تو لبنیٰ کے دل کو کچھ ہوا۔

''نہیں بیٹا فاخرہ بہت اچھی ہے۔ مجھ سے اور عائشہ بھابی سے بھی زیادہ اچھی۔ باہمت قابل فخر۔ جس نے نوکری بھی کی گھر بھی سنبھالا، بچوں کو بھی پالا بہت مشقت اٹھائی اُس نے۔''

''ہمیں اُس سے ملنے کی اجازت کیوں نہیں ہے پھر، وہ ہمارے گھر کیوں نہیں آتے جیسے عائشہ تائی آتی ہیں۔ اُن کے بچے آتے ہیں۔'' لبنیٰ نے ٹھٹھک کر امن کو دیکھا۔ اب وہ کیا جواب دے۔ اُس دن ساری گفتگو امن اور عروہ کے سامنے ہی تو ہوئی تھی۔ سارے بچے صرف اتنا جانتے تھے کہ تایا کی فیملی کا بائیکاٹ اس وجہ سے ہے کہ اُن کی بیوی بدکردار عورت ہیں۔ رحمان نے بتایا تھا سب کو۔

''امن اُٹھو تم لیٹ ہوگئی ہو، ابھی مجھے ہنزلہ، حذیفہ کو اسکول چھوڑنے بھی جانا ہے۔'' لبنیٰ نے ٹالا تھا اُسے وہ ٹل بھی گئی...... مگر کب تک...... پتا نہیں۔

☆......☆......☆

لبنیٰ نے چادر اوڑھی اور دروازہ لاک کر کے باہر نکلی۔ آج پیرنٹس میٹنگ تھی اسکول میں۔ وہ بچوں کو ساتھ لے کر ابھی چند قدم ہی بڑھی تھی کہ پیچھے سے عائشہ کی آواز پر لبنیٰ پلٹی۔ لبنیٰ بدمزا سی ہو کر رہ گئی، قدم سست پڑ گئے۔

''کیسی ہو لبنیٰ۔'' بھلا صبح صبح ہی گلی میں نکلنے کی کوئی تک بنتی ہے کیا۔

''جی ٹھیک ہوں۔'' لبنیٰ نے وہیں رک کر کہا۔ وہ لمبی گفتگو کے موڈ میں نہیں تھی، پہلے ہی لیٹ ہوگئی تھی وہ بات سے بات نکال لیتی تھی اور لبنیٰ کو لایعنی بے مقصد باتیں بُری لگتی تھیں۔

''رکو تو'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی اُس کے ساتھ ہولی۔

''آپ کہاں عائشہ بھابی'' نے اپنی ناگواری کو بمشکل دبا کر کہا۔

''ضرور سو رہی ہے احتشام اور ریان اسکول گئے اکیلی بور ہو رہی ہو چلو تمہارے ساتھ چلتی ہوں'' لبنیٰ چپ چاپ چل پڑی۔

''ارے لبنیٰ وہ دیکھو۔'' لبنیٰ حذیفہ اور ہنزلہ کے ساتھ چل رہی تھی جبھی عائشہ بھابی نے اُسے ٹہوکا دے کر اُس کی توجہ کسی طرف دلائی۔ لبنیٰ اپنے دھیان سے چونکی اور عائشہ بھابی کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ دو نوعمر سے لڑکے بائیک روکے کھڑے تھے آتے جاتے لوگوں کو گھور رہے تھے۔

''تو کیا بھابی......!'' لبنیٰ نے نافہمی سے عائشہ بھابی کو دیکھا۔

''آخر ایسی بھی کیا بات ہے۔ بازار ہے اور لوگ تو ہوتے ہی ہیں، بھانت بھانت کے لوگ اُس میں اچنبھے کی کیا بات ہے۔''

''یہ ضرور کسی لڑکی کے لیے ہی کھڑے ہیں۔'' عائشہ بھابی نے رازدارانہ انداز میں ذرا جھک کر لبنیٰ سے کہا۔ لبنیٰ نے تاسف سے سر جھٹکا مگر بولی کچھ نہیں۔

تبھی ایک عجیب بات ہوئی، بالکل اچانک سامنے سے بشیراں کے ساتھ صبا نکلی تھی اور ہوا کے جھونکے کی اُن کے پاس سے گزر گئی تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ دونوں ہی ششدر سی رہ گئیں۔

''یہ صبا تھی نا۔'' کافی دیر بعد عائشہ کی آواز نکلی۔

''اتنی خوبصورت! کیسی اٹھان ہے بالکل اپنی ماں جیسی'' عائشہ مبہوت سی ہو کر رہ گئی تھیں۔

''یہ جہاں کہاں..... اوہ اچھا اب سمجھ آیا'' اُس نے چٹکی بجائی اور اُن بائیک والے لڑکوں کی طرف اشارہ کیا جیسے کڑی سے کڑی ملانے میں کامیاب ہوگئی ہو۔

''بھابی خدا کا خوف کریں، اتنی چھوٹی سی ہے وہ'' صدمے سے لبنیٰ کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''مانو نہ مانو، یہ لڑکے اسی کے لیے ہی کھڑے تھے'' وہ وثوق سے بولی۔

''پلیز بھابی بس کردیں، معصوم سی ہے وہ ابھی، ہماری بھی تو بیٹیاں ہیں ایسے مت کہیں۔ اچھے گمان رکھنے چاہیے ہمیں۔ وہ بھی تو ہمارے ہی خاندان کا حصہ ہے۔'' کہہ کر رکی نہیں پیچھے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا مگر اُس کے دل پر منوں بوجھ آن پڑا تھا۔

آج کل شہر میں بچوں کے اغوا کی وارداتیں ہورہی تھیں۔ نجانے کون لوگ تھے جو بے رحمی اور سفاکی سے ماؤں کے کلیجوں میں آگ لگا رہے تھے۔ آج کی مدر میٹنگ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

بچوں کے ساتھ ساتھ شہر سے کچھ عورتوں کو بھی اغوا کیا گیا تھا۔ اغوا کرنے والوں کا تاحال کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ مختلف جگہوں سے ہراساں وخوفزدہ کرنے والی خبریں آرہی تھیں۔ شہر میں ہراس پھیلا ہوا تھا۔ اسکولوں کے اساتذہ اپنی جگہ اس ساری صورتحال سے پریشان تھے اسی لیے بچوں کی ماؤں کو بلوا کر بچوں پر کڑی نظر رکھنے کی تاکید کی تھی کہ بچوں کو اکیلے اسکول نہ بھیجیں۔ اس سلسلے میں رکشے والوں پر بھی بھروسہ نہ کریں۔ پوری ذمہ داری کے ساتھ بچوں کو اسکول چھوڑ کر واپس لے کر جائیں۔

''اپنی اولاد کی جان سے بڑھ کر کچھ بھی اہم اور قیمتی نہیں ہوتا۔'' پرنسپل کی آواز گونج رہی تھی سب خواتین ہمہ تن گوش ہوکر سن رہی تھیں۔

''اسکول کے اندر بچوں کی نگہداشت اور اُس پر نظر رکھنا ہمارا فرض ہے۔ ہم اپنی ذمہ داری خوش اسلوبی سے نبھائیں گے۔ اپنے فرض کی تکمیل میں قطعی کوئی کوتاہی نہیں کریں گے مگر اسکول کے باہر ہماری کوئی ذمہ داری نہیں۔'' لبنیٰ کے اوسان خطا ہونے لگے۔ دل پتے کی مانند لرزنے لگا۔ سانس خشک ہورہی تھی۔ دل میں وہم اور وسوسے جمع ہورہے تھے۔

☆......☆......☆

امن کا بے چین دل کچھ سنبھل سا پایا گیا تھا کہ وہ اُس سے ٹکرا گیا۔ اُس سے امن کی دوسری مڈبھیڑ کافی دن بعد ہوئی تھی۔ امن عروہ کے ساتھ کالج جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی مگر حاجی صاحب کے گھر کے سامنے اُسے کھڑا دیکھ کر امن کی سانسیں بے ربط ہونے لگیں۔ بلاشبہ وہ وہی تھا مگر ان کی گلی کے نکڑ پر وہ بلیک پینٹ پر سفید بنیان پہنے گلے میں تولیہ لٹکائے لاپرواانداز میں کھڑا تھا۔

امن ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھے گئی۔ وہ متوجہ نہیں تھا ذرا سا رخ موڑے کھڑا تھا۔ امن کی نظر اُس کی قامت کو سراہ رہی تھی۔ بلاشبہ اُس کا دراز سراپا نظر انداز کیے جانے کے قابل تو قطعی نہیں تھا۔ وہ پلٹا اور ان دونوں کو یوں دیکھا جیسے اچانک اُن دونوں لڑکیوں پر نظر پڑی ہو پھر محویت سے اپنی طرف دیکھتی امن کو دیکھا...... نگاہ ٹھہر گئی شناسائی کی ہلکی سی رمق آنکھوں میں جھلملائی، پھر دلجمعی سے گھورنے لگا۔ آنکھوں کے زاویے اور ہی ہوگئے۔ اب امن سٹپٹا کر خجل سی ہوئی اور نظریں دائیں بائیں گھمانے لگی۔ اُس کے پاس سے گزرتے ہوئے امن کے قدم واضح طور پر ڈگمگائے۔

''عروہ یہ کون ہے؟'' امن نے پوچھا۔

''مجھے کیا پتا، پہلی بار دیکھا ویسے مزے کا ہے۔'' عروہ نے یوں چٹخارہ بھرا جیسے وہ کوئی کھانے والی چیز ہو۔

''ہاں ہے تو مگر یہ حاجی صاحب کے گھر کیسے، کون...... ہوسکتا ہے، کوئی مہمان۔'' خود ہی قیاس آرائی کی۔

امن چور نظروں سے پلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی، دل خوش گواری سے دھڑک رہا تھا۔

''کیا مجھے بتادینا چاہیے عروہ کو کہ یہ مجھے پہلے کالج

میں بھی مل چکا ہے، بلکہ سوال جواب بھی......'

'مگر اُس نے مجھے عروہ رحمان سمجھ کر پکارا تھا۔ کیا وہ عروہ کو جانتا ہے مگر عروہ تو اُسے نہیں جانتی، ورنہ آج وہ اُسے دیکھ کر ضرور امن کو بتا دیتی اگر شناسائی ہوتی عروہ کی تو......'

''تمہارا دھیان کدھر ہے امن، میں باتیں کیے جارہی ہوں، تم بے توجہی سے سن رہی ہو۔''

''آں...... کیا کہا تم نے، میں نے سنا نہیں۔'' امن نے فائل ایک ہاتھ سے دوسرے میں کی اور اپنی جھینپ مٹانے کو نظریں چرانے لگی۔

''کیا بات ہے امن، کچھ عجیب سی لگ رہی ہو۔''

''نن نہیں تو۔''

''اچھا جلدی کرو ورنہ وہ ضویا کا کھڑوس بھائی ڈانٹ کے رکھ دے گا۔''

امن نے عروہ کا دھیان ہٹنے پر ایک پُرسکون سانس خارج کر کے قدم پھرتی سے آگے بڑھائے۔ وہ اب دوسری گلی میں آ چکی تھیں۔ امن نے ایسے ہی پیچھے مڑ کر دیکھا اور وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ سجاد بلوچ اُن کے پیچھے آ رہا تھا۔ امن کا دل بلیوں اُچھلنے لگا...... میرے لیے آ رہا ہے...... صرف میرے لیے۔

''میں عروہ کو نہیں بتاؤں گی کچھ بھی نہیں، اور سجاد کے سامنے عروہ بن جاؤں گی۔''

☆......☆......☆

وہ ہسپتال کی چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت کوئی بھی رنگ نہیں تھا۔ آنکھوں میں صرف خالی پن تھا۔ اس نے یک ٹک نگاہیں چھت پر گاڑ رکھی تھیں۔ یوں ساکت و صامت کہ ذرا سی ابرو کی جنبش ہوئی تو تسلسل ٹوٹ جائے گا۔

''طبیعت کیسی ہے اب آپ کی۔'' کسی نے بالکل قریب سے پکارا، تسلسل ٹوٹ گیا، اُس نے آنے والے کی طرف دیکھا مگر بے تاثر نگاہیں، سپاٹ چہرہ، سامنے نرس زرینہ کھڑی تھی۔

''مجھ سے کچھ کہا۔'' اس نے انگلی اپنی طرف کر کے پوچھا زرینہ مسکرائی۔ ویسی ہی مسکراہٹ جیسی ایک نرس کی اپنے مریض کے لیے ہوتی ہے، پیشہ ورانہ مسکان، جذبات سے عاری۔

''جی آپ سے ہی کہا ہے۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔'' اُس نے پھر دوبارہ مہربان مسکراہٹ لبوں پر سجائی۔

''مجھے...... مجھے کیا ہوا......'' اُس نے تامل سے کہا انداز استفہامیہ تھا۔

''آپ کو دماغی جھٹکے لگتے ہیں، مطلب دماغی دورے پڑتے ہیں۔''

''اچھا...... اب کیسی ہے میری طبیعت تم بتاؤ۔''

زرینہ کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ وہ آدھا پاگل تھا اور پورے پاگل سے نیم پاگل زیادہ دماغ کھاتا ہے، مگر وہ مجبور تھی اُس کی روٹی روزی کا مسئلہ تھا۔

''آپ کی ذہنی ابتری کبھی کبھی پاگل پن کی آخری حدوں کو چھونے لگتی ہے، اسی لیے آپ کو باقاعدہ ہسپتال میں ایڈمٹ کروایا گیا ہے تاکہ آپ کی مکمل دیکھ بھال ہو سکے اور آپ کو پُرسکون رکھا جائے۔''

''اچھا......'' اس نے اپنے پاؤں کے ناخن کو اضطرابی انداز میں کھینچتے ہوئے سانس بھری۔

''آپ کو سکون کے انجکشن دیے جا رہے ہیں۔''

زرینہ کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی...... مگر دل زچ۔

''مجھے کس چیز کی بے سکونی ہے'' وہ اب سفید براق بیڈ شیٹ کو اضطرابی انداز میں بھی اکٹھا کرتا مگر جس جگہ وہ خود بیٹھا ہوا تھا وہاں سے بیڈ شیٹ کھینچتی نہیں تو جھنجھلانے لگتا خوامخواہ زور لگا رہا تھا۔

''آپ کو کیا بے سکونی ہے یہ تو آپ کو ہی پتا ہوگا۔'' زرینہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ وہ جتنا بھی تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتی پھر بھی کچھ مریض اتنے سوال کرتے تھے اور ایسے ایسے سوال کہ زرینہ کا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہتا تھا۔ اُسے لگتا کہ بہت جلد اس کے دماغ

کی چولیں بھی ہل جائیں گی۔
"بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے، مجھے گھر جانے کیوں نہیں دیتے۔" وہ ابھی تک بیڈ شیٹ کے ساتھ نبرد آزما تھا۔ ہوش مند ہوتا تو جان جاتا اپنے نیچے دبی چیز کو نکالنے کے لیے خود وہاں سے اُٹھنا پڑتا ہے۔ وہ اب غرا رہا تھا غصے بھری نظروں سے زرینہ کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں غصے کے ساتھ پاگل پن بھی جھلکنے لگا تھا وہ پل میں مشتعل ہوا تھا اور اُس کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگیں جیسے کوئی اُس کا نرخرہ دبا رہا ہو۔ اذیت اُس کے خوبصورت نقوش کو بگاڑنے لگی اس کا اونچا لمبا وجود جھٹکے کھانے لگا۔ اُس نے چیخ ماری اور پھر چیخنے لگا اور پھر چیختا رہا۔ زرینہ نے تیزی سے وارڈ بوائے کو بلوایا۔ اُس کی مدد سے مریض کو لٹایا اور جلدی سے انجکشن تیار کیا گیا۔ انجکشن لگنے کے بعد وہ کچھ لمحے مچلا تڑپا پھر شانت ہو گیا۔ اُس کے بند پلکوں کے پیچھے چھپا کرب اب راحت وسکون میں بدلنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

بشیراں اکیلی عورت تھی فاخرہ نے اُسے اپنے گھر میں ہی رکھ لیا تھا۔ بچے بھی بشیراں سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ وہ اُن کے دکھ درد کی ساتھی تھی۔ دل سے وفادار بھی فاخرہ نے خالہ اماں اور زمان سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا اور اُسے اب تو حیرت ہوتی تھی کہ آخر وہ کیوں اُن کے ہاتھوں اتنے سال زدوکوب ہوتی رہی، کیوں ظلم سہہ سہہ کر اُن کو شیر بنا دیا۔ وہ اتنی کمزور کیوں ہو گئی وہ دبتی گئی زمان اور خالہ اُسے دباتے رہے۔ ظلم کرنے والے کو ظالم بنانے میں ظلم سہنے والے کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہوتا ہے جتنا کہ ظلم کرنے والے کا۔ چونکہ فاخرہ اب خالہ اماں اور زمان کو درخوار اعتنا نہیں سمجھتی تھی اس لیے خالہ اماں نے دست درازی بند کر دی تھی مگر اپنی زبان کے وار کرنے سے پھر بھی باز نہیں آتی تھی جب جب موقع ملتا زہر اُگلتی رہتی تھیں مگر اب فاخرہ نہ ہی پروا کرتی تھی اور نا ہی غم کو دل سے لگاتی تھی۔

صبا نے بورڈ میں پہلی پوزیشن لی تھی۔ شہر بھر میں صبا زمان کی دھوم مچ گئی تھی۔ سب واہ واہ کر رہے تھے۔ مختلف اخباروں کے نمائندے اُن کے گھر پہنچ گئے تھے۔ صبا زمان کی تصویریں اخبار والے بنا رہے تھے۔ صبا سے سوال کیے جا رہے تھے۔ صبا پورے اعتماد سے جوابات دے رہی تھی داد وتحسین کے ڈونگرے صبا پر برسائے جا رہے تھے۔ فاخرہ نے فخر وانبساط سے دیکھا صبا کہہ رہی تھی۔
"میری ہر کامیابی میری مما کی مرہونِ منت ہے۔ میری مما کی ریاضتوں اور محنتوں کا ثمر ہے" فاخرہ کو لگا صبا کا لہجہ نم سا بھرایا ہوا سا۔
"میری مما دنیا کی بیسٹ مما ہیں۔ بہت ہمت والی، آئی لو یو مما، آئی لو یو سوچ۔" صبا نے وفورِ جذبات سے کہا، اُس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ فاخرہ نے آگے بڑھ کر اُسے گلے لگا کر بھینچ لیا اور صبا کے بالوں پر ٹھوڑی ٹکا دی۔
"مما کی جان، مجھے تم پر فخر ہے بیٹا۔" دو آنسو کپکپاتے ہوئے گرے اور صبا کے بالوں میں جذب ہو گئے۔
"مما......" صبا سسکی اور سسکتی رہی۔ آہوں کراہوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔
"کیا ہوا صبا! ایسے تڑپ تڑپ کر کیوں رو رہی ہو بیٹا......" فاخرہ نے اچنبھے سے اُسے خود سے الگ کر کے تشویش سے دیکھا۔ صبا کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ فاخرہ کے دل کو دھچکا سا لگا اور اُس نے پھر صبا کو خود سے لپٹا لیا۔ اب وہ دونوں ہی رونے لگیں۔ نجانے وہ کب تک اُسی کیفیت میں مدغم رہتیں کہ بشیراں نے آگے بڑھ کر دونوں کو الگ کیا۔ اخباری رپورٹر کب چلے گئے انہیں علم ہی نہ ہو سکا۔
وہ صبا کے ساتھ اتنی گم ہو گئی تھی کہ اُسے احساس تک نہیں ہوا کہ اخباری رپورٹر گھر پر ہیں۔ فاخرہ کو اپنی جذباتیت پر ہلکی سی شرمندگی ہوئی، ایسی بے خبری بھی کیا، جو اطراف سے بیگانہ کر ڈالے۔

''آ ئیں اِدھر بیٹھیں۔'' بشیراں نے دونوں کو چارپائی پر بٹھایا، پانی لاکر دیا۔ صبا کا چہرہ ایک دم سے بجھ سا گیا تھا۔ آنسو مسلسل بہہ رہے تھے، وہ نظریں جھکائے بے تاثر انداز میں بیٹھی اپنی گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھے جارہی تھی۔

''میں تو سمجھ رہی تھی صبا تم خوشی سے آنسو بہارہی ہو مگر......'' فاخرہ نے لب کاٹتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی۔ ادھوری بات میں بہت سے خدشے چھپے بیٹھے تھے۔ صبا نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا یونہی ٹھس سی بیٹھی رہی، یہاں ہوکر بھی جیسے موجود نہ ہو۔

''کیا ہوا ہے صبا بتاؤ مجھے۔'' فاخرہ نے صبا کے گال پر ہاتھ رکھ کر اُس کا نرم و نازک سا چہرہ اپنی طرف موڑا۔ صبا نے ذرا کی ذرا نگاہیں اُٹھائی تھیں خالی خالی، عجیب سی سرد نظریں، فاخرہ کٹ کر رہ گئی۔

''صبا اپنی مما کو بتاؤ کیوں رو رہی ہو۔ یہ تو خوشی کا موقع ہے پھر یہ آنسو...... وہ بھی اتنی شدت سے کیا معنی رکھتے ہیں۔ میرا دل وسوسوں کی زد میں جھٹکے کھانے لگا ہے، بولو صبا کیا مجھ سے ناراض ہو۔'' فاخرہ آزردگی سے بولی تو صبا نے چونک کر فاخرہ کو دیکھا اور پھر اُس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

''مما بھلا آپ سے میں ناراض کیوں ہونے لگی۔''

''میں ڈر گئی بیٹا کہ انجانے میں مجھ سے کوئی غفلت نہ ہوگئی ہو۔'' فاخرہ نے اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''آپ ڈرنا چھوڑ دیں مما، خوف کے حصار سے نکل آئیں۔ میں آپ سے کبھی بدگمان نہیں ہوسکتی۔ میں ایسی بیٹی ہوں جسے اپنی مما کے دل میں پلتے سارے اندیشے نظر آتے ہیں۔ آپ کا خدشات سے اتنا دل کمزور ردنا تو اں نہیں ہونا چاہیے۔ سارے خدشات دھو ڈالیے مٹا ڈالیے آپ فخر ہیں ہمارا، ہم آپ کی مضبوطی ہیں۔ آپ کا مستقبل ہیں۔ مما میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

''پھر بھی تم اتنی بے چینی اور تڑپ سے روئی کیوں

بیٹا۔'' فاخرہ کے ہاتھ پر اُس کے آنسو گر رہے تھے اور اُس کا ہاتھ صبا کے بالوں میں سرسرا رہا تھا اور اُس کا ذہن بھٹکا ہوا تھا۔ فاخرہ کی سوچیں اُسے اِدھر اُدھر بھٹکائے ہوئے تھیں۔ فاخرہ کا دل اب صرف ماں کا دل تھا اور ماں کا دل ایسا صاف شفاف آئینہ ہوتا ہے جس میں اپنی اولاد کا درد، اس کی یاسیت صاف واضح دکھائی دیتی ہے۔ بھلے اولاد جتنا بھی ٹال مٹول سے کام لے، عذر تراش لے ماں کا دل گواہ بن جاتا ہے۔

''مما آپ نے ہمارے لیے بہت محنت کی ہے۔ جاب کی، گھر سنبھالا، ہمیں سنبھالا اور ہمیشہ خود پڑھایا۔ صرف آٹھویں میں میں نے نیہات بھیا سے مدد لی، وہ بھی صرف میتھ کی وجہ سے۔'' صبا نے ایک آزردہ سی سانس خارج کی اور اپنے ہاتھوں کی پشت سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ فاخرہ کا دل ذرا سنبھلنے لگا ورنہ وہ اُس وقت سے اپنے دل اور اعصاب کو جکڑا ہوا پا رہی تھی۔ صبا کے اضطرابی انداز نے فاخرہ کو مغموم و آزردہ ہی نہیں کیا بلکہ عجیب سی گھٹن اُسے اپنی سانسوں میں شامل ہوتی محسوس ہوئی مگر اب بے قرار دل کو ذرا قرار آیا تھا۔

''آج آپ کو، آپ کی روز شب کی ریاضتوں کا صلہ مل گیا۔ مما، اس لیے میں اتنا روئی، اپنی مما کی محنتوں کے ثمر پر بلکی، اب بس رونا دھونا، کھانا نکالیں بہت بھوک لگی ہے۔'' وہ اُٹھ کر بیٹھی فاخرہ کی ڈھارس بندھی مگر فاخرہ اب بھی استفہامیہ نظروں سے صبا کو دیکھے جارہی تھی۔

''صبا تم سچ کہہ رہی ہو۔ کیا یہ سب ہی سوچ کر روئی ہو تم، کوئی اور بات تو نہیں جس نے تمہارے دل کو تکلیف دی ہو۔''

''ارے نہیں مما اُٹھیں اب۔'' صبا نے ہاتھ پکڑ کر فاخرہ کو کھڑا کیا۔

''زور کی بھوک لگی ہے۔'' اس نے دھائی دی۔

''بہت بہت مبارک ہو بیٹا، تم نے تو سچ میں مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔'' بشیراں جو کافی دیر اُن کے پاس بیٹھی

فاخرہ اور صبا کی دلگیری دیکھ رہی تھی۔ ایک دم بولی تو صبا کھلکھلا کر ہنس پڑی، فاخرہ بھی زیرلب مسکرائی۔ صبا بشیراں سے لپٹ گئی۔

''خالہ بہت محبت ہے آپ کی، آپ نے بھی بلاشبہ ایک ماں کی طرح ہی ہمیں محبت دی ہے۔ آپ کا بھی بہت بڑا اور نمایاں کردار ہے میری کامیابی میں۔''

''مما یہ اسد اور اسوہ کہاں ہیں؟ دادو اور فضا بھی نظر نہیں آرہے۔''

''اسد اور اسوہ کو ساتھ لے کر خالہ قریبی پارک میں گئی ہیں اور فضا کمرے میں سوئی ہوئی ہے، ظاہر اسکولوں سے چھٹیاں ہیں۔ ابھی بچوں کی نئی کلاسز شروع نہیں ہوئیں۔ فراغت ہی فراغت ہے ابھی۔''

''اور بابا...... مجھے اُن کو بتانا ہے۔'' صبا پرجوش سی زمان کے کمرے کی طرف بھاگی، بشیراں اور فاخرہ نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سر ہلا کر ہنسنے لگیں، پرُسکون ہنسی مگر یہ ہنسی بہت جلد پھر آنسوؤں میں بدلنے والی تھی، وہ دونوں بے خبر تھیں۔

☆......☆......☆

''بابا...... بابا......'' وہ بھاگم بھاگ کمرے میں گھسی تھی، چند قدموں پر محیط کمرا پھر بھی اُس کا اندازہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے پہنچا ہو۔

''بابا میں نے پوزیشن لی ہے۔ آپ کی صبا نے پورے بورڈ میں پہلی پوزیشن لی ہے۔'' صبا نے کہا اُس کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ زمان کی بے نور آنکھوں سے کوئی تاثر نہیں اُبھرتا تھا مگر اس وقت اُس کا چہرہ خوشی سے جگمگانے لگا تھا اور زمان نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ صبا اُن کے پھیلے ہوئے بازوؤں کو دیکھتی زمان کے سینے سے آن لگی۔ اُس کے پھیلے بازو سمٹ کر صبا کے گرد حصار بن گئے۔

وہ دیوانہ وار صبا کو چوم رہا تھا، مبارک باد دے رہا تھا۔ خوش تھا اور بے تحاشا خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔

آنسو اُس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ ٹپک رہے تھے۔ بصیرت سے محروم شخص اس وقت خود کو بہت بدقسمت سمجھ رہا تھا جو اپنی اولاد کو دیکھنے کے لیے ساری زندگی ترستا رہا تھا۔

''آئی لو یو بیٹا! میں بہت خوش ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ تم میری بیٹی ہو۔'' زمان کی آنکھیں بند تھیں مگر اُس کی سماعتیں عام آدمی سے کہیں زیادہ تیز تھیں۔ ہر چیز اُس نے محسوس ہی کرنی تھی اور یہ عادت بچپن کی تھی۔

اب زمان اپنی عادت کی بدولت صبا کے نقوش ٹٹولنے لگا، بے بسی کے آنسو بھی خوشی کے آنسوؤں میں مل کر بہنے لگے۔

''آپ کو بھی مبارک ہو۔ آپ اُٹھیے مجھے آپ کو بہت ہی زبردست بات بتانی ہے۔ پھر اکٹھے کھانا کھائیں گے۔ ٹھیک ہے'' صبا نے سہارا دے کر زمان کو اٹھایا۔

''کیا تمہارے دل میں کبھی یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی بیٹا کہ میں اپنے بچوں کو باہر گھمانے لے کر چلوں۔ تم لوگوں کی ہر خوشی دھوم دھام سے مناؤں۔ باہر سے رات کا کھانا کھائیں آئس کریم کھائیں، شاپنگ کریں۔''

''نہیں کبھی بھی نہیں، جو ہے جیسا ہے اللہ کا شکر ہے بابا، خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ آپ کی نسل آپ کا نام آگے چلنا تھا اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کیے کہ مما جیسی بااعتماد، پڑھی لکھی عورت سے آپ کی شادی ہوئی ،جنھوں نے اپنے نازک کندھوں پر سارے بار اٹھا لیے۔'' صبا نے زمان کے آنسو صاف کیے اور دونوں ہاتھوں میں اُس کا چہرہ تھام کر پیشانی چوم لی۔ تبھی بشیراں ایک پلیٹ ہاتھ میں پکڑے اندر آئی۔ پلیٹ دیکھ کر صبا مسکرائی۔ فاخرہ نے مٹھائی منگوائی تھی اور اس وقت بشیراں مٹھائی لے کر ہی کمرے میں آئی تھی۔

''بابا منہ میٹھا کریں۔'' صبا نے رس گلہ ہاتھ میں

پکڑ کر آدھا توڑ کر زمان کے منہ میں ڈالا اور آدھا خود کھالیا۔

"بابا پتا ہے آج اخبار کے رپورٹر میری تصویریں بنانے آئے تھے۔ انھوں نے میری دو تین منٹ کی مووی بھی بنائی، ایک دو سوال بھی کیے شاید وہ کسی چینل والے تھے۔"

"واہ بیٹا شاباش میری بیٹی، یونہی محنت کرتی رہنا۔" زمان نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"تمہاری ماں بھی پوزیشن ہولڈر تھی، اُس کی بھی اخبار میں تصویریں چھپتی تھیں۔ بہت ذہین لڑکی تھی، آؤٹ اسٹینڈنگ، اُس کا باپ، بہت غریب تھا اخبار بیچتا تھا۔ سنا تھا سائیکل پر گھر گھر اخبار ڈالتا تھا۔ غریب آدمی تھا۔ اکلوتی بیٹی تھی فاخرہ اُن کی۔" جانے وہ کس رو میں بہے جا رہا تھا صبا ہمیشہ اپنے ننھیال والوں کے بارے میں جاننا چاہتی تھی مگر کس سے...... فاخرہ کو کرید کر وہ پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے اپنے سارے سوال اپنے اندر چھپا لیتی تھی۔

"بابا...... ہماری کوئی آنٹی یا ماموں نہیں تھا۔" صبا نے جھجک کر پوچھا۔

"بس ایک ماموں تھا تمہارا۔" وہ دور خلاؤں میں کہیں کھویا ہوا تھا۔

"تھا...... سے کیا مطلب" صبا نے ڈرتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا کہیں فاخرہ نہ آجائیں۔ اس خیال سے وہ اُٹھی اور آہستگی سے کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگادی۔

"مر گیا تھا......" زمان نے سفاکی سے کہا۔ چند لمحے پہلے کی ساری خوشگواری بھاپ بن کر اُڑ گئی، چند ثانیے پہلے زمان کے چہرے پر روشنی سی بکھری تھی جب وہ اپنی بیٹی کی بات کر رہا تھا۔ اب اُسی چہرے پر تاریک سے سائے لرز اٹھے تھے۔

"کیسے...... کب" صبا کے ہونٹوں سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرے اگر اُس نے کچھ پوچھا نہیں تھا فاخرہ سے تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اُسے رشتوں کی طلب نہیں تھی۔ وہ تو فاخرہ کو اذیت سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"خودکشی کر لی تھی اُس نے۔" زمان نے بے حسی و کرختگی سے کہا۔ صبا نے بے ساختہ ہاتھ لبوں پر رکھ لیا اُس کے اندر ہراس پھیل گیا وہ چند ثانیے کچھ بول ہی نہیں سکی بولنے کے قابل ہی نہیں رہی۔ وہ ششدر و ساکت سی سانس روکے متحیر سی بس دنگ ہو کر دیکھے جا رہی تھی۔

"مگر کیوں......" بہت دیر بعد صبا نے خود کو بولتے سنا، اس کی سکت ہی جیسے دم توڑ گئی تھی۔ اتنی بڑی بات، اتنا بڑا صدمہ کہ جس رشتے کی کھوج میں ابھی آپ نکلے بھی نہ ہوں وہ ملنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے تو حواس گم ہونا تو فطری عمل ہے، یہی حال صبا کا تھا۔

"اپنی ماں سے پوچھنا......" زمان کے اندر باہر نفرت کا الاؤ دہکنے لگا۔ تپش اُس کے چہرے سے پھوٹ پھوٹ کر اُس کا چہرہ کریہہ بنا رہی تھی۔ صبا اُس کے پل پل بدلتے رنگ اور تیور دیکھ رہی تھی۔ تبھی نجانے صبا کو کیا ہوا، وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ زمان ٹھٹکا اگلے ہی لمحے صبا زمان کے پیروں پر گر کر زار و قطار رونے لگی۔

"کک...... کیا ہوا بیٹا۔" زمان نے ذرا سا جھک کر ہاتھ آگے بڑھایا، اس کا مقصد صبا کے سر پر ہاتھ رکھنا تھا مگر بجھائی نہ دینے کی وجہ سے اس کا ہاتھ اُسی مٹھائی والی شیشے کی پلیٹ سے ٹکرایا، بیڈ سے ہوتی پلیٹ فرش پر گری اور ٹوٹ گئی۔ ایک زوردار چھناکے کی آواز کے ساتھ شیشے کے ٹکڑے سارے کمرے میں بکھر گئے۔ زمان کا ہاتھ کچھ لمحے وہیں ساکت رہ گیا...... مگر صبا کا سر قدموں سے نہیں اُٹھا۔

صبا کا سسکیوں کا شور زمان کے دل میں دراڑیں ڈالنے لگا۔ اس کا نازک بدن شدتِ گریہ سے ہچکولے کھا رہا تھا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے،

بے دریغ بہے جارہے تھے۔ تبھی زمان کا کپکپاتا ہاتھ اُس کے سر پر آن رُکا اور اضطرابی کیفیت میں صبا کے بالوں کو سہلانے لگا۔

''مت رو میری بیٹی، مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔'' زمان کا لہجہ نم تھا۔

''بابا، میری مما کو معاف کر دیں۔'' صبا نے ذرا سا سر اُٹھا کر گلوگیر آواز میں التجا کی، پھر سر قدموں میں جھکا دیا۔ زمان سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ وہ حیرت سے صبا کی بات میں ہی کھویا رہا۔

''آج آپ کی بیٹی نے آپ کو اتنی بڑی خوش خبری دی، آپ بھی مجھے خوشی کی خبر سنا دیجیے بابا، میری خاطر میری مما کو معاف کر دیں۔ دل سے معاف کر دیں۔ میں نہیں جانتی کہ انھوں نے ایسا کیا کیا ہے جو اُن کو آپ سب کا عتاب سہنا پڑ رہا ہے پلیز بابا۔''

صبا کے نرم ہاتھ زمان کے پیروں کو دبوچے ہوئے تھے۔ اُس کا معصوم ذہن آگ بگولا ہو کر دہک رہا تھا۔ دل گداز ہو کر بہہ رہا تھا۔

''میں اُسے کیسے معاف کر دوں۔ وہ قابلِ نفرت عورت ہے۔ جب جب میں یہ سوچتا ہوں کہ......'' وہ کہتا ہوا رک گیا دھیان میں آیا آگے بیٹی ہے۔

''بابا آخر اُن سے ایسا کون سا جرم سرزد ہو گیا کہ آپ لوگ ساری زندگی اُن کو لعنت ملامت کرتے رہے، اُن کو دھتکارتے رہے اُن کی عزتِ نفس کو مجروح کرتے رہے۔ اُن کی ذات کو مالِ غنیمت سمجھ لیا۔ جس کے جو من میں آئے وہی کرے۔'' اس کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ اُس کا تر و تازہ چہرہ کملا کر رہ گیا تھا۔ اُس نے ایک جھٹکے سے سر اوپر اُٹھایا بے دردی سے اپنی آنکھوں کو رگڑا۔

''مجھے بتائیں اُن کا جرم بتائیں۔'' وہ زمان کے مقابل بیٹھی اب اُسے گھور رہی تھی۔ زمان نے اپنی ٹانگیں اکٹھی کیں۔ زمان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے آج صبا جس طرح روئی تھی، اُس کی سسکیاں، آہ و زاری، التجائیں اُس نے زمان کو رلا دیا تھا۔

''صبا کبھی مت رونا دوبارہ بیٹا، میری جان نکل جائے گی۔''

''میں اپنی اولاد سے بہت محبت کرتا ہوں تم تو میری پہلوٹھی کی اولاد ہو۔''

''ہر کوئی اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے یہ کوئی غیر معمولی یا انوکھی بات نہیں ہے۔'' وہ بے زاری سے بولی۔

''آپ اور آپ کا خاندان میری مما سے نفرت کرتا ہے۔ اُن کو حقیر گردانتے ہیں آپ لوگ۔ بابا جتنا دشوار نفرت سہنا ہے اُس سے بھی کہیں بڑھ کر نفرت کرنا ہے۔ میرے ماں باپ اتنے سالوں سے کتنا کٹھن کام کر رہے ہیں۔ نفرت سے تیر چلانے کا اور نفرت کے وار سہنے کا۔

آپ اُسی عورت سے نفرت کر رہے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے رزق کا وسیلہ بنایا، نسل چلانے والی بنایا۔ ٹھیک ہے آپ اُن کو معاف نہ کریں۔''

''میری زندگی میں جتنی بھی آسودگیاں، عزت، نام، مرتبے ملیں گے سب مما کی بدولت ہوں گے کیونکہ وہ دینا جانتی ہیں، بانٹنا جانتی ہیں، صابر ہیں، اللہ پر بھروسہ رکھتی ہیں۔ اپنے تمام معاملات خدا پر چھوڑ دیتی ہیں۔ مما عظیم ہیں۔''

''اور میری زندگی میں جتنی بھی ناکامیاں، کجیاں کوتاہیاں، غفلتیں اور تشنگی آئی ہے اور آئے گی وہ سب آپ کی وجہ سے ہوگی کیونکہ آپ انتہائی کم ظرف اور چھوٹے دل، چھوٹے ذہن کے مالک ہیں۔ دوسروں کی قسمت کے فیصلے لکھنے والے، درگزر نہ کرنے والے تنگ نظر، جو نہ اچھے شوہر بن سکے اور نہ باپ۔'' زمان کا اذیت سے منہ کھل گیا تھا مگر صبا وہاں رکی نہیں تھی۔

☆☆☆

صبا کے حالات نے اُسے وقت سے پہلے بہت ساری چیزوں کے بارے میں آگاہی دے دی تھی۔

بلا کی ذہین تھی، حساس تھی، باتوں اور معاملات کو سمجھتی تھی۔ زمان کے پاس سے وہ بہت غصے میں کھولتے ہوئے نکلی تھی اور اب آنکھیں موندے دوسرے کمرے میں جا کر سوتی بن گئی۔ فاخرہ اور بشیراں باری باری کھانے کے لیے دیکھنے آئیں مگر اُسے سوتا سمجھ کر سر جھٹک کر چلی گئیں۔ انھیں صبا کے بھوکا سونے کا ملال تھا۔

صبا کی بند پلکوں کے پیچھے خیالات نے کیسا اُدھم مچا رکھا تھا یہ صرف وہی جانتی تھی۔ جب سے اُسے پتا چلا تھا کہ اس نے پوزیشن لی ہے تب سے ہی اُس کا دل اُداس ہو گیا تھا۔ سب رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی اکیلے ہونا آج اُسے شدت سے محسوس ہوا تھا۔ حتیٰ کہ باپ بھی محافظ نہیں، ماں کے ساتھ کھڑا ہو کر اپنے بھائیوں اور ماں کی ہاں میں ہاں ملانے والا، کبھی فاخرہ کے ساتھ کھڑا نہ ہو سکا۔ یہ قلق تھا صبا کا۔

صبا نے بچپن سے ہی ددھیالی رشتوں کو نفرت وحقارت سے بجھے تیر چلاتے ہی دیکھا تھا۔ اور ننھیال میں کون کون تھا اور کہاں تھا یہ اُسے معلوم نہیں تھا مگر آج زمان نے صبا کے دل کو انجانے میں چھید ڈالا تھا کہ اس کا ایک ماموں بھی تھا جس نے خودکشی کر لی۔ اُس کی ایک دوسرے میں پیوست پلکیں اپنے اندر کیسے درد اور غم واندوہ پھیلتے دیکھ رہی تھیں کون جانتا۔ کون جان سکتا تھا۔

کوئی بھی قصہ ہو، کوئی بھی کہانی ہو۔ اُس کے ہر کردار کی بربادی کا نوحہ لکھتے ہوئے فاخرہ کو ہی مورد الزام ٹھہرایا جاتا تھا۔ ہر بات کا اختتامیہ فاخرہ جبیں پر ہی ہوتا تھا۔ خوب دل کی بھڑاس نکالی جاتی۔

''کاش میرے بس میں ہو تو میں کوئی جادو کی چھڑی گھماؤں اور سب ٹھیک کر دوں۔ اپنی مما کو معتبر کر دوں، سوچوں کے رنگ اُس کے اندر ہلچل مچانے لگے۔ اُس نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ لفظوں کے کھیل میں کوئی کیسے زخمی ہوتا ہے۔ کہنے والا کب واقف ہوتا ہے۔ لفظ بذاتِ خود تو بہت بے ضرر ہوتے ہیں یہ تو ادائی کرنے والے پر منحصر ہے کہ اُس کی ادائی میں کیا عوامل، کیا مقاصد پوشیدہ ہیں۔ لفظوں کا استعمال محبت، شائستگی اور رکھ رکھاؤ سے کیا جائے تو تلخ بات بھی امرت بن جاتی ہے۔ اگر لفظوں کا استعمال کرختگی، حقارت اور سفاکی سے کیا جائے تو نرم بات بھی زہر قاتل ثابت ہوتی ہے۔ یہی زمان نے کیا تھا اور انجانے میں کسی رو میں بھٹک کر کیا تھا۔

صبا کے ذہن میں بہت سے نوکیلے سوال اُگ آئے تھے مگر فی الفور اپنی مما سے کوئی سوال نہیں کرنا چاہتی تھی۔ نیند نے نجانے کب اُس معصوم کو اپنی مہربان آغوش میں بھر کر سب ذہنی انتشار اور بے سکونی سے نجات دلا دی تھی۔

رات جتنی بے چین تھی سہانی صبح اتنی ہی دلکش نظارے لیے حاضر تھی۔ صبا کی تصویر اخباروں میں لگی تھی۔ صبح صبح ہی مبارکباد کے فون آنے لگے، فاخرہ خوش دلی سے مبارکبادیں وصول کر رہی تھی۔ گھر آنے والوں کی مٹھائی اور چائے سے خاطر مدارت کی جا رہی تھی۔

لبنیٰ نے بھی فون کر کے بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا، فاخرہ کی محنت اور لگن کو سراہا، صبا کے لیے دعائیں دیں۔ فاخرہ کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ آنے والوں کا تانتا بندھ گیا فاخرہ کے اسکول کی ساتھی ٹیچرز، گلی محلے کی خواتین، صبا کی تعریفیں کر رہی تھیں۔ صبا زمان کے نام کی دھوم مچ گئی تھی۔

صبا ابھی سو رہی تھی۔ فاخرہ صبا کی گزشتہ دن کی بے کلی سے پوری طرح سے تو نہیں مگر آگاہ ضرور تھی اس لیے اس نے صبا کو جگایا نہیں تھا۔ کل صبا کی آنکھوں سے اُداسی، بے چینی ہلکی سی وحشت پھیلتی سمٹتی رہی تھی۔ ابھی کچھ خواتین فاخرہ کے گھر سے گئی تھیں۔ فاخرہ اُن کو چھوڑنے دروازے تک گئی تھی وہ واپس پلٹی تو اس کا دل بھرانے لگا۔ کوئی بھی تو اپنا ایسا نہیں تھا جو اُن کی اتنی بڑی خوشی میں شریک ہوتا۔ کوئی بھی خون کا رشتہ، اس سے

پہلے کہ فاخرہ مزید ملول و غم زدہ ہوتی اس کے سیل فون کی بیل ہوئی تھی۔ فاخرہ نے لپک کر فون اُٹھایا، انجان سا نمبر تھا فاخرہ نے ذرا سے توقف کے بعد کال او کے کر کے سیل فون کان سے لگالیا۔

''ہیلو کون'' فاخرہ نے مدھم لہجے میں پوچھا۔

''آنٹی میرا نام ضویا ضمیر ہے، صبا ہمارے کوچنگ سینٹر میں پڑھتی ہے۔''

''اوہ، اچھا اچھا بیٹا کیسی ہو، کیسے فون کیا۔'' فاخرہ مسکرائی۔

''جی ٹھیک ہوں، آپ کیسی ہیں۔'' ضویا بہت جوش و خروش سے بات آگے بڑھا رہی تھی۔

''بیٹا میں بھی ٹھیک ہوں۔''

''آنٹی آپ کو بہت بہت مبارک ہو صبا کی شاندار کامیابی پر۔''

''بہت شکریہ بیٹا۔''

''صبا سے بات ہو سکتی ہے کیا۔''

''وہ ابھی سوئی ہوئی ہے بیٹا۔'' فاخرہ نے بات سمیٹنا چاہی کیونکہ خالہ چھت سے سیڑھیاں اُتر کر آ رہی تھی۔

''آنٹی میں آپ کے گھر آنا چاہتی ہوں صبا سے ملنے اور مبارکباد دینے کے لیے۔'' ضویا اطلاع دے رہی تھی یا اجازت طلب کر رہی تھی، فاخرہ نہیں جان سکی۔ اُس کا دل تو خالہ کے موڈ کو دیکھ کر کانپ اُٹھا اگر خالہ نے کچھ ایسا ویسا کہہ دیا...... ضویا نے سن لیا...... کتنی سبکی ہوگی۔

''ٹھیک ہے بیٹا خدا حافظ۔'' فاخرہ نے کسی ممکنہ بدمزگی اور ضویا کے سامنے شرمندگی سے بچنے کے لیے عجلت میں بات سمیٹ دی۔

''اب کچھ پکانے کھلانے کا ارادہ بھی ہے کہ فون پر ہی گپیں لگاتی رہوگی۔'' خالہ آخری سیڑھی پر کھڑی جارحانہ تیوروں کے ساتھ فاخرہ کو گھور رہی تھی۔ خالہ میں پہلے جیسا کروفر اور طنطنہ تو نہیں رہا تھا مگر بولتی وہ اب بھی کڑوا کسیلا ہی تھی۔ عادت سے مجبور تھی۔ ویسے بھی اذیت دینا بھی ایک خماری اور سرشاری کی کیفیت طاری کرتا ہے ایسے لوگوں پر۔ برسوں کی روٹین تھی گالی گلوچ، مار دھاڑ کی، جاتے جاتے ہی جاتی۔ ہاتھ اُٹھانا بند کر دیا تھا بچیوں سے پٹ کر مگر زبان چلانا آنکھیں دکھانا۔ زخمی انا کی تسکین ایسے ہی سہی۔

''ناشتا بن گیا ہے۔'' بشیراں نے اطلاع دی تو خالہ اماں نے کھا جانے والی نظروں سے اُسے دیکھا اُسے بشیراں بھی بُری لگتی تھی۔ مگر بس نہیں چلتا تھا ورنہ کچا کھا جاتیں۔

☆......☆......☆

فاخرہ آئرن اسٹینڈ کے پاس کھڑی زمان کے کپڑے استری کر رہی تھی تبھی صبا بکھرے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتی فاخرہ کے قریب چلی آئی۔ بالوں کو سلجھا کر کیچر میں جکڑا۔

''اسلام وعلیکم مما۔'' صبا نے آہستگی سے سلام کیا اس کا بارونق چہرہ ستا ہوا مرجھایا ہوا سا تھا۔

''وعلیکم السلام! آج بہت سوئی تم۔''

''جی بس ٹھیک سے سو نہیں سکی۔'' فاخرہ نے توجہ سے دیکھا صبا کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری اور بوجھل سے ہو رہے تھے، جو اُس کے بے چین رتجگے کے گواہ تھے۔ اس کا کھلا ہوا چہرہ اُس کے اندر پنپتے اضطراب کا غماز نظر آ رہا تھا۔

''کیا کھاؤ گی۔'' فاخرہ نے کچھ نہیں پوچھا کہ وہ اتنی بے کل سی کیوں ہے۔ ہوسکتا ہے میرا وہم ہو۔

''میں فریش ہو کر آتی ہوں مما۔ کھانے کو کچھ بھی دے دیں، بہت زوروں کی بھوک لگی ہے۔''

فاخرہ نے زمان کا سوٹ ہینگ کر کے استری کا پلگ نکالا اور کچن کی طرف قدم بڑھا دیے۔ فاخرہ نے بل دار پراٹھا اور آملیٹ بنایا تب تک صبا منہ ہاتھ دھو کر آئی وہیں چوکی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''ضویا ضمیر کا فون آیا تھا، مبارکباد دے رہی تھی۔''

فاخرہ نے دودھ پتی اور ہلکی سی چینی ڈال کر ساس پین چولہے پر رکھا۔ آنچ ہلکی تھی۔ جب تک صبا پراٹھا کھاتی چائے تیار ہو جاتی۔

''اچھا......واہ......'' صبا کے اداس چہرے کے اندر سے مسکراہٹ پھوٹی چہرہ روشن ہو گیا۔

''آنا چاہ رہی تھی۔'' فاخرہ کی نظروں کی گرفت صبا کے چہرے پر تھی۔

''آپ نے کیا کہا۔'' صبا نے پوچھا۔

''میں نے کہا آجاؤ۔'' فاخرہ نے چائے کپوں میں انڈیلتے ہوئے اطلاع بہم پہنچائی۔

''گڈ! ۔ تھینکس مما۔'' صبا اظہارِ تشکر سے کہہ گئی۔

''ضویا آنے والی ہے، کیا کیا بنالوں لنچ میں۔''

فاخرہ نے چھوٹی سی میز پر دونوں کپ رکھ دیے اور خود بھی چوکی کھینچ کر صبا کے پاس بیٹھ گئی پھر دونوں پلان بنانے لگیں۔ صبا ضویا کے آنے کی خوشی میں وقتی طور پر بھول گئی سب۔ بشیراں اور فاخرہ بازار جا رہی تھیں، صبا نے اُن کے جانے کے بعد سنک میں رکھے برتن دھو کر رکھے، سلیب صاف کی اور پھر گھر کی صفائی ستھرائی میں جت گئی۔ فضا بھی اُس کی مدد کروا رہی تھی، اسوہ اور اسد صحن میں کھیل رہے تھے۔ جب صبا اپنے کمرے کو صاف کر کے زمان کے کمرے میں آئی تو دیکھا وہ دونوں ماں بیٹا سر جوڑے بیٹھے تھے۔ اُن کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی یوں راز و نیاز میں وہ دونوں مگن تھے جیسے بہت ہی اہم مسئلے پر بات ہو رہی ہو۔ اماں نے قہر آلود نظروں سے صبا کو دیکھا اور منہ ہی منہ میں بدبدائی ہونٹوں کو گول گول گھمایا آنکھوں کو ٹیڑھا میڑھا کیا۔ ایسے میں وہ اتنی مضحکہ خیز لگ رہی تھی کہ صبا کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔

''باادب بانصیب، بے ادب بدنصیب۔'' اماں نے صبا کو ہنستے دیکھ کر باآواز بلند کہا۔ اماں کو تو پتنگے لگ گئے تھے صبا کی کھلکھلاہٹوں پر۔ وہ ان کا چھچھانا کہاں برداشت کر سکتی تھی۔

''جیسے کہ میری مما باادب بانصیب۔'' صبا نے زور لگا کر کہا اور جھاڑو لگانے لگی۔ زمان خاموش تھا۔ رات سے ہی سناٹوں کی زد میں تھا رات بھر اس نے بھی یادوں کی زہر پھانکی تھی۔ اس کا شکن آلود بستر بتا رہا تھا کہ اس نے رات بھر کتنی کروٹیں بدلی تھیں۔ صبا کی درد میں ڈوبی آواز کیسے اُسے ساری رات دار پر لٹکاتی اور کھینچتی رہی تھی۔ اس کے دل کے بیچوں بیچ جیسے کسی نے ڈھیر ساری سوئیاں چبھو ڈالی تھیں۔

''جیسی تیری ماں نافرمان اور سرکش آوارہ، ویسی ہی تُو'' جب صبا باہر نکل گئی تو زہر میں بجھا یہ جملہ اماں کے ہونٹوں سے ادا ہوا، زمان تڑپ کر رہ گیا۔

''اماں صبا کے بارے میں ایسے مت کہیں، میری بیٹی بہت اچھی ہے۔''

''اچھا، بیٹی ماں سے بڑھ کر ہو گئی اب۔'' اماں تن فن کرنے لگی زمان بدک گیا اماں سے ڈرتا تھا۔

چھوٹا سا گھر صاف ستھرا ہو چکا تھا۔ بشیراں اور فاخرہ لدی پھندی گھر آئی تھیں۔ گوشت، سبزیاں، فروٹ، مٹھائی۔ اب وہ دونوں ذرا سانس بحال کر کے کھانا پکانے میں جت گئیں۔

صبا نے اسد اور اسوہ کو نہلا کر کپڑے بدلوائے اماں کی گھوریاں، طعنے تشنے بڑبڑاہٹیں جاری و ساری تھیں مگر کسی نے چنداں پروا نہ کی۔ صبا نہانے چلی گئی فضا کچن میں فاخرہ کے ساتھ مدد کروا رہی تھی۔

دو بجے ضویا اپنی امی اور بہن کے ساتھ آئی تھی۔ اُن کا پُرتپاک استقبال کیا گیا۔ گرمجوشی سے سب ایک دوسرے سے گلے ملے۔ کوئی پہلی بار صبا کے حوالے سے گھر آیا تھا۔ فاخرہ نے دل کھول کر کھانے بنائے تھے۔ زندگی میں پہلی بار فاخرہ نے اپنا مال اپنی مرضی اپنی خوشی اور پسند سے استعمال کیا تھا۔

وہ لوگ چار بجے گئے تھے۔ مل کر کھانا کھایا گیا گپ شپ لگائی گئی۔ ضویا اور اُس کی امی بار بار صبا کی بلائیں لے رہی تھیں۔ محبت پاش نظروں سے فاخرہ کو

اور صبا کو دیکھتی رہیں۔ اپنائیت، خلوص بہت تھا اُن میں۔ فاخرہ اور صبا نے بھی خاطر مدارت میں کوئی کمی نہیں کی۔ یہ تو ویسے بھی محبت اور رشتوں کے ترسے ہوئے لوگ تھے۔ کسی نے مٹھی بھر محبت دی تو جواباً دامن بھر کے دینے والے لوگ۔

جاتے سمے وہ فاخرہ کو اپنے گھر انوائیٹ کر کے گئے تھے۔ پرزور اصرار پر فاخرہ نے حامی بھرلی۔ صبا کے چہرے کے کھلتے رنگ فاخرہ کے اندر طمانیت بچھاتے جارہے تھے۔ صد شکر ہے اماں نے مہمانوں کے سامنے کسی بداخلاقی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا چپ چاپ ایک ایک کو تکتی رہیں بس۔ آج کا دن اپنے آنچل میں بہت ساری راحتیں لے کر طلوع ہوا تھا۔ جس نے کلفتوں کو زائل کر دیا، بلاشبہ آج کا دن زندگی کا خوبصورت ترین دن تھا۔

☆......☆......☆

رحمان کا بیٹا احتشام مڈل کے امتحان میں فیل ہوگیا۔ زندگی میں پہلی بار رحمان کو احتشام پر غصہ آیا تھا اور بے حد آیا تھا۔ غصے اور اشتعال سے اُس کی حالت غیر ہو رہی تھی اس نے احتشام کو بری طرح ڈانٹا تھا۔ رحمان بار بار اُسے مارنے کو لپکتا مگر عائشہ اپنی ہی دھائی ڈال کر درمیان میں آ کر رنگ میں بھنگ ڈال دیتی۔ رحمان عائشہ کو پکڑ کر ایک سائیڈ پر کرتا اور احتشام کی جانب بڑھتا، ایک دو دھپ لگاتا عائشہ پھر بیچ بچاؤ کرواتے ہوئے اُودھم مچانے لگی۔ رحمان زچ ہوگیا، اُس نے عائشہ کی کلائی زور سے پکڑ کر اُسے پٹخ دیا۔ عائشہ چکراتی ہوئی کہاں گری اسے کچھ خبر نہیں تھی مگر آنکھوں کے آگے تارے نظر آنے لگے تھے اُس نے اپنے گھومتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما۔ مگر زبان بند نہیں ہوئی تھی، واویلا کرتی، شور ڈالتی۔

''نہ کمانے کی کوئی کمی رکھی نہ پہننے اوڑھنے کی پھر پڑھے گا تیرا باپ......'' رحمان نے قریب رکھا بلا اُٹھالیا۔ احتشام کو مارنا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ وہ اُچھل کر کبھی بیڈ پر چڑھ جاتا رحمان اُسے بیڈ پر چڑھ کر دبوچ لیتا، وہ پھر برق رفتاری سے رحمان کو شکنجے سے خود کو آزاد کرواتا۔ رحمان پیچھے احتشام آگے...... مگر بالآخر رحمان نے احتشام کو نیچے گرا ہی لیا، رحمان کے بلوں کے وار احتشام اپنے ہاتھوں پر تب تک سہتا رہا جب تک سہہ سکتا تھا۔ دونوں ماں بیٹا نے چیخ و پکار، آہ و بکا مچا رکھی تھی۔ رحمان کے دو تین بلے اُس کی ٹانگوں پر مار کر بلا پھینک دیا اور خود ہانپتا ہوا صوفے پر ڈھے گیا۔ اُس کے اعصاب چیخ رہے تھے۔ احتشام نے مار کم کھائی تھی مگر نچایا بھگایا دوڑایا زیادہ تھا رحمان کو۔

''اب پڑگئی ٹھنڈ تیرے کلیجے میں منحوس۔'' عائشہ نے تنفر سے رحمان کو دیکھا اور احتشام کو فرش پر سے اُٹھانے لگی۔ احتشام جان بوجھ کر لمبا ہوتا جارہا تھا ہائے وائے کیے جارہا تھا۔

''اتنی خفت اُٹھانا پڑی مجھے اپنے دوستوں کے سامنے، ایسے اس ناہنجار کے فیل ہونے کا مجھ سے افسوس کرتے رہے جیسے کوئی مرگیا ہو اور وہ تعزیت کررہے ہوں۔'' رحمان کا غصہ دکھ میں بدل گیا۔

''اور تم نے گھر آ کر اُس کی کھال اُدھیڑ دی۔ مجھے بھی نہیں چھوڑا۔'' وہ دانت پیس کر بولی۔

''سارا قصور تمہارا ہے۔ ایسی بدتہذیب اور جاہل عورت پلے پڑی ہے کہ نہ گھر کا خیال رکھتی ہے نہ بچوں کا۔''

''تو کر لیتے کسی پڑھی لکھی سے۔'' وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ دیدے بھی پھٹے پڑ رہے تھے۔

''ہاں کوئی پڑھی لکھی ہوتی تو یہ حال نہ ہوتا۔ تربیت بھی لازمی کرتی۔'' وہ بھی دو بدو بولا۔ دونوں کے درمیان تو تکار نجانے کب تک چلتی کہ باہر بیل ہوئی تھی۔ رحمان تاسف سے سر ہلاتا اُٹھ کر دیکھنے چلا گیا کہ کون آیا ہے اور عائشہ احتشام کو سہارا دے کر اُس کے کمرے میں لے گئی۔ بہت دیر سے اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تماشا دیکھتی فروہ نے بےزاری سے کھڑکی کے کھلے پٹ بند کیے اور اپنے بیڈ پر آن بیٹھی۔

''یار ایم ویٹنگ'' اریز چوہدری کا میسج تھا۔ فروہ نے

اکتاہٹ سے رپلائی کیا۔

''یار بابا نے احتشام کو بہت مارا ہے۔ گھر کا ماحول تناؤ کا شکار ہے، میں کیسے ملنے آجاؤں۔''

''تم خود ہی ملنے نہیں آنا چاہ رہیں، بہانے مت بناؤ۔'' اُس کا ناراضی سے معمور میسیج آ گیا۔ فروہ ٹھس سے انداز میں بیٹھی رہی۔ سیل فون سائیڈ پر اُچھال دیا۔ اچھے بھلے موڈ کا ستیاناس مار ڈالا تھا اس سارے تماشے نے۔

''وہ سوچوں میں اُلجھی بیٹھی تھی اس کا ذہن شل ہو رہا تھا۔ مختلف قسم کے متضاد خیالات اُس کے اعصاب کو ادھ موا کر گئے تھے، اس کا خواہشوں و امنگوں سے بھرا دل زمانے بھر کی جھنجلاہٹ سمیٹ لایا تھا۔

پھر وہ اُٹھی اور کمرے میں چکر کاٹنے لگی تادیر ایسی ہی حالت میں وہ ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر چکر لگاتی رہی مگر اس کے ذہنی خلفشار میں رتی برابر کمی نہیں آئی تب وہ کمرے کے وسط میں کھڑی کچھ دیر سوچتی رہی پھر آگے بڑھ کر بیڈ پر سے اپنا سیل فون اٹھایا اور اریز چوہدری کا نمبر ملانے لگی۔ وہ کال پک نہیں کر رہا تھا۔ اُس نے پھر کال کی مگر اس بار آگے سے کاٹ دی گئی۔ فروہ نے اُلجھ کر سیل فون کی اسکرین کو دیکھا۔ فروہ رحمان کی اس لمحے حقیقی معنوں میں آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُس کی صبیح پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک اُٹھے، وہ گھبرا کر رہ گئی۔ ساری صورت حال قطعی غیر متوقع تھی۔ فروہ نے ایک بار پھر کال کی تھی صد شکر اس بار کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

''ہیلو اریز'' فروہ بے تابی سے بولی۔

''ہاں بولو۔'' وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔

''ناراض ہو۔''

''کیا نہیں ہونا چاہیے۔'' اُس نے الٹا سوال داغ دیا۔

''سوری اریز گھر میں اتنی بدمزگی ہوئی ہے، بابا نے فیل ہونے پر احتشام کو بہت مارا ہے مما نے الگ اپنا رونا پیٹنا ڈالا ہوا تھا۔ عجیب سوگوار سا ماحول ہو گیا ہے۔'' وہ سہج سہج کر بول رہی تھی۔

''پھر مجھے کیوں بتا رہی ہو۔'' وہ بے دلی سے ترخ کر بولا فروہ کو ہلکا سا تاسف کا جھٹکا لگا، ایسی صاف گوئی۔

''اپنے نہ آنے کی مجبوری بتا رہی ہوں۔''

''پہلے تو تم نے کبھی اپنے بہن بھائیوں سے ایسی دلی وابستگی کا اظہار نہیں کیا۔ آج مجھ سے ملنے آنا تھا تو بھائی کی محبت دل میں جاگ اُٹھی۔'' وہ طنز کر رہا تھا، کاٹ تھی اس کے الفاظ میں مگر فروہ نے محسوس ہی نہیں کیا، محسوس تو اُسے تب ہوتا اگر وہ خود اپنے رشتوں سے محبت کرتی تب ہی اُسے اریز کا انداز اور الفاظ برے لگتے۔

''یہ بات نہیں ہے اریز، احتشام ہے ہی اتنا بدتمیز اور کاہل نکما کہ اُسے بابا بھلے جتنا بھی پیٹتے کم تھا مگر آج بابا گیارہ بجے ہی گھر آ گئے وہ بہت کم غیظ و غضب کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آج پہلی بار انھوں نے اتنے شدید ردعمل کا اظہار کیا، مجھے بارہ بجے تم سے ملنا تھا مگر اب بابا گھر پر ہیں۔'' فروہ جو اُسے بتانا یا سمجھانا چاہ رہی تھی وہ سمجھا یا نہیں ہاں اب کہ وہ بولا تو انداز کچھ نرم تھا ورنہ تو کس قدر مشکل ہو کر بھڑ کا تھا وہ۔

''تو اب کیا پروگرام ہے۔'' اس نے نئی بات کر دی۔ وہ اس بات کے سوا نہ کوئی دوسری بات کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی سننا۔ اور وہ خوش فہم لڑکی ایسے سپنے آنکھوں میں سجا رہی تھی جن کی تعبیریں نہیں ملتیں۔

''بابا گھر پر ہیں اور اب تو باہر کی چہل پہل بتا رہی ہے کہ چاچی لبنیٰ آئی ہے شاید، باتوں کی آواز آ رہی ہے۔'' اریز کو ایک بار پھر تپ چڑھنے لگی تھی۔ وہ گھیر گھار کر اصل بات پر اُسے لے کر آتا اور وہ اپنی ہی بے تکی ہانکے جا رہی تھی۔ اریز نے بمشکل اپنے اشتعال پر قابو پایا۔

''اب کب ملو گی'' اریز نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''کل'' فروہ نے صرف اتنا کہا اور انتظار کرنے لگی کہ اریز آگے سے کیا کہتا ہے۔

''ٹھیک ہے کل کا مطلب کل ہی ہونا چاہیے کسی ٹال مٹول سے کام مت لینا۔ اگر تم دل سے آمادہ نہیں ہو مجھے ملنے کے لیے تو صاف لفظوں میں کہہ دو، حیلے بہانے مت بناؤ۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو اریز، بھلا محبت کو حیلے بہانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اپنے دل کی خوشی سے ملنا چاہتی ہوں۔ محبت کرتی ہوں تم سے، محبت کے دھاگے اتنے کمزور نہیں ہوتے اریز کہ انھیں ذرا سا اُلجھنے پر کھینچ کر توڑ دیا جائے۔ محبت میں صداقت ہو تو دوریاں اثر انداز نہیں ہوتیں۔'' فروہ کے ہونٹوں سے لفظ نہیں محبت ادا ہو رہے تھے دوسری طرف اریز اپنی مٹھیاں بھینچے پیچ و تاب کھا رہا تھا مگر اظہار نہیں کر سکتا تھا، ہاں لوہا گرم دیکھ کر ہلکی سی ضرب ضرور لگانی چاہی تھی۔

''فروہ مجھے کبھی دھوکہ مت دینا، میں جی نہیں سکوں گا۔'' اریز کی دل سوزی پر فروہ کا دل تڑپ اُٹھا اور زمانے بھر کا گداز اُس کے ایک دل میں آن سمایا۔ پل میں آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ جب بولی تو اس کی آواز کی بھراہٹ اریز سے چھپی نہیں رہی تھی۔

''میری محبت وقتی کشش تو نہیں ہے اریز جو فنا کے گھاٹ اتر جائے گی۔ یہ تو ان مٹ ہے، اٹوٹ بندھن ہے ہمارا۔ تم تو میری روح میں سما چکے ہو، کوئی بھی کسی قیمت پر بھی مجھے تم سے جدا نہیں کر سکتا اور اریز تم سے دھوکے یا فریب کا تصور بھی سوہانِ روح ہے۔'' وہ رو دی۔

''فروہ مجھے کبھی اکیلا مت چھوڑنا، مجھے ادھورا مت کرنا۔ اگر محبت سے آشنا کیا ہے تو جدائی کی دیوار کبھی مت اُٹھانا ہجر کی سزا مت دینا۔'' اریز بظاہر مسکرا کر بولا مگر اُس نے اپنے لہجے میں زمانے بھر کا درد سمو کر کہا۔

''ہماری محبت کو ہار کا ذائقہ کبھی نہیں چکھنا پڑے گا اریز، مجھے جیت کی امید دلاتے رہنا، تمہاری ہم راہی میری زندگی کا سب سے بڑا خواب ہے۔''

''میں تمھیں کبھی تہی داماں نہیں کروں گا۔ اپنے ساتھ رکھوں گا۔ تمہاری محبت میری طاقت ہے۔ میرا حوالہ ہے۔ لوگ تو موہوم سے اثر کے باعث برسوں اکٹھے رہ لیتے ہیں، تم تو میری ہو فروہ صرف میری۔'' اریز کی آواز مدھم پڑی، نشیلی خمار آلود دل کو تسخیر کر لینے والی روح کی گہرائیوں میں اُتر جانے والی۔

''آئی لو یو اریز۔'' وہ جذبات سے بوجھل آواز میں بولی، سرشاری و خماری اُس کے انگ انگ میں اتر رہی تھی۔ وہ خبطی سی دیوانی سی خود کو بے گانہ، جس کے خواب آسمان چھونے کے لیے تھا، جس کا دل ہواؤں میں اُڑنے کے لیے اُڑان چاہ رہا تھا، بادلوں میں رقص کرتی چاند پانے کی تمنائی۔

''لو یو ٹو میری جان، میری فروہ۔'' اریز کی سرگوشی کسی شہد کی مانند فروہ کی سماعتوں میں ٹپکائی گئی تھی۔ اس کا تن بدن محبت کی پھوار میں بھیگنے لگا۔ اس کی آنکھیں ستاروں کی مانند چمکنے لگیں۔

''اپنا وعدہ ایفا کرو، کل لازمی ملنا ورنہ روٹھ جاؤں گا اور پھر مانوں گا بھی نہیں، بھلے پھر جتنا مرضی منانا۔'' اریز کی پیار بھری دھمکی دی اور فروہ کھلکھلا اُٹھی۔ اس بات سے اُسے کوئی سروکار نہیں تھا کہ احتشام کا کیا حال ہے، رحمان کتنا مغموم ہے، عائشہ کتنا روئی ہے مگر وہ خوش تھی بے تحاشا۔

''ضرور آؤں گی، اچھا رکھتی ہوں اب۔''

''نہیں۔''

''کیا نہیں۔'' فروہ نے ٹھٹھک کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اریز نے بے ساختہ کہا تو دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ فروہ کا موڈ فریش ہو چکا تھا کیونکہ اریز کا بگڑا رویہ اب ٹھیک ہو گیا تھا۔ اُس کی اپنی زندگی تھی۔ ایک مخصوص راہ تھی۔ ایک پسندیدہ سفر تھا اور اپنی ہی خواہشیں زادِ راہ تھیں اور انہی خوبصورت شب و روز میں وہ رہنا چاہتی تھی، اپنی ہی ذات میں گم۔ اُس کی زندگی میں اریز کا آنا زیست کے معنی ہی بدل گیا تھا۔ احساسات نے رنگ بدل کر ایک خوشبوؤں بھرے

جہاں سے اُسے روشناس کروادیا تھا، خواہشات کے کچھ نئے عکس کچھ نئی دل فریب پرکشش دنیا وجود میں آئی تھی۔ وہ بیڈ سے اُٹھی تو اس کی چوڑیوں کا جلترنگ بج اُٹھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اُٹھی اور اپنا سیل فون چارجنگ پر لگا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

☆......☆......☆

رحمان انتہائی بددل ہو کر صوفے پر بیٹھا تھا۔ اُس کی پیشانی پر شکنوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ اُس کی انگلیاں اضطراری انداز میں بار بار پیشانی کو مسل رہی تھیں۔ وہ بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ سامنے والے صوفے پر فرقان اور لبنیٰ بیٹھے تھے۔

''میں تو کھانا بنا رہی تھی جب ریان حواس باختہ سا ہمارے گھر گیا کہ بابا احتشام کو مار رہے ہیں۔ مما رو رہی ہیں کیا ہو گیا ایسا۔'' لبنیٰ نے بہت سلیقے سے بات کی تھی۔

''وہ فیل ہو گیا ہے بھابی۔'' رحمان نے ایسے مری ہوئی آواز میں کہا گویا کسی نے اُس کے اندر سے روح نچوڑ لی ہو۔ لبنیٰ ششدر سی بے ساختہ فرقان کو دیکھنے لگی۔ وہ بھی بھونچکا رہ گیا۔ لبنیٰ نے اپنے نیم وا ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ کچھ دیر خاموشی اُن تینوں کے درمیان آکر بیٹھ گئی۔ ایسے موقعوں پر کوئی حرفِ تسلی کام نہیں آتا کوئی کیا کہے۔ اظہارِ افسوس کرے یا تسلی و تشفی دے، یہ کمزور لمحے تھے۔ لبنیٰ کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ بات کیا کرے، کیسے کرے، ایسا کیا کہے کہ رحمان کا درد کا مداوا ہو سکے۔ اس کی جان مشکل میں آن پڑی تھی پھر عائشہ بھابی نے اُس کی مشکل آسان کردی۔ وہ لبنیٰ کو سامنے پا کر دھاڑیں مار مار روتی آکر لبنیٰ سے لپٹ گئی تھی۔ لبنیٰ یک دم بوکھلا کر رہ گئی۔ یہ کیسی افتاد آن پڑی تھی۔

''اتنا مارا، مار مار کے لہولہان کردیا، احتشام کی ہتھیلیوں کا سارا ماس پھٹ گیا ہے۔ اتنی بے دردی اور سنگدلی سے پیٹا۔''

''بھابی چپ کر جائیں نا، حوصلہ رکھیں، احتشام ٹھیک ہو جائے گا۔''

''سب اسی عورت کا قصور ہے۔ اسی نے احتشام کو بگاڑا ہے، گھر کا اور بچوں کا خیال رکھنا عورت کا ہی فرض ہے نا، مگر اس کو تو گھر گھر پھرنے سے ہی فرصت نہیں ہے۔ خبریں اکٹھی کرنا اور پھر گھر گھر نشر کرنا۔'' رحمان آگ بگولہ ہو رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا سب کچھ تہس نہس کر ڈالے۔

''ہاں میں بہت بُری ہوں، تم تو جیسے بہت دھیان رکھتے ہو نا اپنی اولاد کا۔'' عائشہ بھی دو بدو مقابلے پر اتر آئی۔ دونوں خوں خوار نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''جو چیز منہ سے نکالتے ہیں فوراً لے کر دیتا ہوں۔ کسی بھی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے۔ فریج چوبیس گھنٹے فروٹس، کوکز، اور مٹھائیوں سے بھرا رہتا ہے۔ دنیا کی کون سی آسائش ہے جو تم لوگوں کو میسر نہیں۔ مگر پڑھنا تو بچوں نے خود ہی ہے، اچھے اسکول میں پڑھ رہے ہیں، کوچنگ سینٹر جوائن کر رکھا ہے کھلا خرچا مگر کارکردگی صفر......''

''سب ہی کرتے ہیں تم انوکھے نہیں ہو، احسان نہیں کرتے۔'' وہ بھی عائشہ تھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والی۔ وہ کہاں کسی کی سنتی تھی۔ لحاظ مروت جب ماں باپ میں ہی نہ ہو تو بچے بھی وہی کچھ سیکھیں گے۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔ ہر کسی کے رنگ ڈھنگ نرالے تھے۔

''آپ لوگوں کے آپس کی لڑائی جھگڑے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا بھابی بلکہ اور بگڑ جائے گا۔ آرام سے بیٹھ کر بات کریں، اس طرح ہنگامہ نہ کریں۔'' لبنیٰ نے تنگ آکر کہہ دیا وہ کچھ دخل اندازی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر عائشہ بھابی کی قینچی کی طرح چلتی زبان سے عاجز آکر بول اُٹھی، فرقان بھی خاموش تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی ہی زندگی کے ہر معاملے قصوروار تھے مگر کیا وہ لبنیٰ کا یہ کڑوا سچ برداشت کر لیتے۔ کبھی بھی نہیں اس لیے خواہ مخواہ سمجھانے بجھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، جب کوئی اثر ہی نہیں ہونا تھا۔

وہ دونوں اب بھی لبنیٰ اور فرقان کا لحاظ کیے بنا ایک دوسرے پر الزام رکھ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو کوس رہے تھے۔ بڑھ چڑھ کر الفاظ کے تیر چلا چلا کر جھنڈے گاڑ رہے تھے۔ بالآخر عائشہ منہ پر دوپٹہ ڈال کر پھپھک کر رونے لگی۔ لبنیٰ کو اس وقت اپنا یہاں موجود ہونا انتہائی طیش دلا رہا تھا۔ وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی، کیا ڈھارس بندھواتی، کیا کہتی، عائشہ ڈنکے کی چوٹ پر مقابلہ کر کے اب ٹسوے بہا رہی تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب فروہ کمرے سے ٹی وی لاؤنج میں آئی تھی۔ اس نے یوں تاثر دیا جیسے باہر ہونے والی ساری کارروائی سے بے خبر ہو۔ عائشہ اب فروہ کو بتا رہی تھی کیا ہوا، کیسے ہوا۔ فروہ اُس کی دلجوئی کر رہی تھی۔ لبنیٰ ان کو مگن دیکھ کر موقع غنیمت جان کر وہاں سے اُٹھ گئی ہاں البتہ فرقان رحمان کے پاس جا بیٹھا۔

فروہ کی اریز سے دوستی دو ماہ پرانی تھی۔ وہ اُسے فیس بک پر ملا تھا۔ وہ بلاشبہ دل موہ لینے والی بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی شکل وصورت فروہ کی دلچسپی کا سبب بنی تھی۔ اس نے خود فروہ کو فرینڈ ریکوسٹ بھیجی تھی جسے بلاتردد فروہ نے ایکسپٹ کر لیا اور پھر وہ دوست بن گئے۔ چند دنوں کی دوستی محبت میں کب تبدیل ہوئی پتا بھی نہیں چلا۔ ان کی دو تین ملاقاتیں بھی ہو چکی تھیں سرسری سی۔ مقصد صرف ایک دوسرے کو دیکھنا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی تصویریں تو دیکھتے ہی رہتے تھے مگر فیس ٹو فیس دیکھنے کی تو بات ہی اور تھی اس لیے اب ان کی باقاعدہ ملاقات ہونی تھی، اکٹھے کھانا کھانے کا بھی پروگرام تھا۔

فروہ گھر سے تیار شیار ہو کر نہیں آئی تھی بس کمرے سے وہ بہترین لباس میچنگ جوتے پہن کر ہی باہر نکلی تھی۔ اس نے عائشہ کے کمرے میں جھانکا، وہ اپنے بیڈ روم میں نہیں تھی۔ کچن سے کھڑ پٹر کی آوازیں آ رہی تھیں مطلب زینت کچن میں ہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

''مما کہاں ہیں'' زینت واضح سٹپٹائی۔ اُس کے ہاتھ میں تازہ جوس کا گلاس تھا، مارے گھبراہٹ کے جوس ذرا سا چھلک گیا۔ مگر فروہ کہاں متوجہ تھی۔

''احتشام کے پاس ہیں۔'' زینت کے بتانے پر وہ جیسے عجلت میں آئی تھی ویسے ہی پلٹی۔ زینت نے سکون کی سانس لی۔ فروہ کچھ سوچ کر پھر اُسی رخ پر کھڑی بولی۔

''اور بابا......''

''وہ چلے گئے صبح صبح ہی۔'' فروہ اب احتشام کے بیڈ روم کی طرف بڑھی، زینت نے جوس کا گلاس غٹا غٹ اندر اُتارا اور لمبی سی ڈکار لے کر خدا کا شکر ادا کیا جس نے زینت کو ایسے گھر میں نوکری دلوائی۔

عائشہ احتشام کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ دونوں ماں بیٹا باتیں کر رہے تھے۔ عائشہ خوب اُس پر پیار لٹا رہی تھی۔ وہ پہلے ہی لاڈلا تھا، اب تو خوب نخرے کر کے لاڈ اٹھا رہا تھا۔

''مما میں جا رہی ہوں پارلر۔'' فروہ نے اطلاع دی۔

''کچھ کھایا بیٹا۔''

''نہیں مما صبح صبح کہاں کچھ حلق سے اُترتا ہے۔''

''تمہارے بابا بھی آج صبح صبح چلے گئے بغیر کچھ کھائے پیے۔ ملتان جانا تھا کسی دوست کے ساتھ انہیں، کوئی نیا کاروبار شروع کر رہے ہیں کسی دوست کے ساتھ۔'' وہ بغیر پوچھے ہی بتاتی چلی گئیں۔

''اپنی گاڑی پر گئے ہیں کیا''

''ہاں۔'' عائشہ کی ہاں پر فروہ بدمزا سی ہو کر رہ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج گاڑی وہ لے جاتی مگر......

''اچھا ٹھیک ہے مما میں چلوں۔''

(اس خوبصورت ناولٹ کا اگلا حصہ ماہ مئی میں ملاحظہ فرمایئے)

'ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔' اُن کا تو جہیز کا خرچہ ہی بچ رہا تھا۔ پھر حیدر آباد کون سا دور تھا۔ ابا نے اپنے ایک دوست کی معرفت معلومات کرائیں تو اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ کون سا عیب تھا جو اُس آدمی میں نہ تھا دو بیویاں ہضم کر چکا تھا اور تیسری......

رشتوں کی اہمیت عیاں کرتا، ایک فسانہ خاص

رات کا کھانا زیادہ کھالیا تھا ارسہ باجی کھانا اتنا مزیدار بناتی تھیں کہ ہاتھ روکنا مشکل ہو جاتا۔ تبھی علیزہ نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ طبیعت سُست ہو رہی تھی۔ اس لیے وہ کالج سے چھٹی کر کے گھر آ گئی۔ گھر میں سناٹے کا راج تھا، بھیا اور پاپا تو یقیناً آفس میں ہوں گے مگر امی اور ارسہ باجی کہاں ہیں؟ گیٹ کی چابی ایک اُس کے پاس بھی رہتی تھی تا کہ وقت بے وقت آنے پر کسی کو گیٹ کھولنے کی زحمت نہ ہو۔ اس نے کچن کا رُخ کیا اور ٹھٹک کر رُک گئی کیونکہ ارسہ باجی کی سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں جو سلیب پر سر رکھے۔ بری طرح رو رہی تھیں اُن کے ہاتھ میں نورین پھوپو کی تصویر تھی۔ ''اماں مجھے اس بے رحم دنیا کے حوالے کر کے کیوں چلی گئیں؟ مجھے ممانی کی نفرت بھری نگاہیں برداشت نہیں ہوتیں میں پل پل مر رہی ہوں۔ ابا مجھ سے لاتعلق ہیں اگر ماموں کا سہارا اور حرام موت کا خوف نہیں ہوتا تو میں کب کی خودکشی کر لیتی۔'' علیزہ کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے وہ سیدھی ہوئیں اور زبردستی مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''تم آج جلدی کالج سے آ گئیں۔''

علیزہ جانتی تھی امی نے کچھ نا کچھ کہہ دیا ہوگا مگر اسے پوچھنا اچھا نہیں لگا کہ آخر جو بھی ہو وہ اس کی ماں تھیں۔ اس لیے ٹھنڈی سانس لے کر آہستہ سے بولی۔

''سر میں درد تھا اس لیے کلاس بنک کر لی لائیے آپ کی کچھ مدد کروں۔'' مگر ارسہ باجی نے اُس کی ایک نہ سنی اور زبردستی چائے کے کپ کے ساتھ درد کی گولی دے کر اُسے کمرے میں بھیج دیا۔

''ارسہ باجی کتنی اچھی اور پیاری ہیں پتا نہیں امی کو ان سے کیا دشمنی ہے؟'' نیند کی وادیوں میں اُترتے ہوئے اُس نے سوچا تھا۔

☆......☆......☆

ارسہ علیزہ کی پھوپوزاد بہن تھی ارسہ کی والدہ نورین اور علیزہ کے والد ذیشان صدیقی آپس میں کزن تھے۔ دونوں کی منگنی ہو چکی تھی اور ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے مگر پھر خاندان میں کیا اختلافات ہوئے کہ یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور نورین کی شادی حیدر آباد میں اور ذیشان کی

شادی ربیعہ سے ہوگئی یہ کوئی طوفانی اور فلمی قسم کا
عشق نہیں تھا صرف منگنی کے بعد کا لگاؤ اور وابستگی
تھی مگر ربیعہ کے دل میں یہ بات پھانس کی طرح
گڑھی ہوئی تھی کہ ذیشان کبھی نورین کو پسند کرتے
تھے حالانکہ وہ اب دو بچوں علیزہ اور منہاج کے
باپ تھے بے حد پُر خلوص، وفادار اور محبت کرنے
والے، اچانک ایک دن نورین کے شوہر کا فون
آ گیا وہ بیمار تھی اور ذیشان کو بلا رہی تھی۔ والدین
دونوں کے ہی وفات پا چکے تھے اور یہ واحد رشتہ
بچا تھا۔ ذیشان نے ایک لمحہ سوچنے میں نہ لگایا اور
حیدرآباد کے لیے نکل گئے۔ نورین کی حالت
دیکھ کر اُن کی آنکھیں دکھ سے پھیل گئیں۔ ہنستی
مسکراتی نورین ڈھانچے کی شکل میں اُن کے
سامنے تھی۔ ارسہ کو شاید نورین ذیشان کے بارے
میں پہلے ہی بتا چکی تھی۔ اس لیے وہ ماموں کے سینے
سے لگ کر بری طرح رونے لگی۔ نورین کے شوہر کا
رویہ اُکھڑا اُکھڑا اور لیا دیا سا تھا۔ چہرے پر ملال یا
پریشانی کی بجائے بیزاریت ہویدا تھی۔ شوہر کے
جانے کے بعد نورین بری طرح رونے لگی۔

''ذیشان تم نے پلٹ کر پوچھا تک نہیں کہ
زندہ ہوں یا مر گئی؟'' ذیشان شرمندہ ہو گئے۔

''میں تو سمجھ رہا تھا تم اپنے شوہر کے ساتھ
خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی ہو۔''

''خوشگوار ازدواجی زندگی!'' نورین کے
ہونٹوں پر استہزائیہ ہنسی تھی۔

''ذیشان میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ
میرے بعد تم ارسہ کو اپنے ساتھ لے جانا۔ مجھے
یقین ہے تم اس کو اپنی بیٹی سمجھو گے اور کبھی اسے

دکھوں کے الام میں نہیں ڈھکیلو گے۔ تمہارے سوا
اِس کا کوئی نہیں!''

''پاگل ہو کیوں مایوسی کی باتیں کرتی ہو ہم
تمہیں کراچی لے جا کر علاج کرائیں گے۔''
ذیشان نے خلوص سے کہا۔

''ذیشان تم میری آخری اُمید ہو انکار مت
کرنا ورنہ مرنے کے بعد بھی میری رُوح کو چین
نہیں ملے گا۔'' نورین نے سُنی اَن سُنی کرتے
ہوئے مایوسی سے کہا۔

''تم بے فکر ہو، جاؤ ارسہ آج سے میری بیٹی ہے
لیکن تم نے اُس کے باپ سے بھی اجازت لی؟''

''اجازت!'' نورین کے ہونٹوں پر ایک
کرب آمیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''وہ تو انتظار میں ہیں کہ کب میری آنکھیں بند
ہوں اور وہ میری ارسہ کو کسی بڈھے ٹھڈے کے سر
منڈھ کر اپنا بیاہ رچا لیں۔ ذیشان میری بیٹی ہیرا ہے
ہیرا، تمہیں یا بھابی کو کبھی اس سے کوئی شکایت نہیں
ہوگی۔ یہ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔ حالات نے
اُسے بچپن ہی سے سنجیدہ، سمجھدار اور ہر کام میں ماہر
بنا دیا ہے۔ باپ کی تو جاہل رکھنے کی کوشش تھی لیکن
میں نے اسے BSC اورنرز کرا دیا ہے اگر بیمار نہ
پڑتی تو اب تک MSC کر چکی ہوتی۔'' پھر دیکھتے
ہی دیکھتے نورین کی طبیعت بگڑ گئی اور اُس نے سکون
سے بیٹی کی بانہوں میں دم توڑ دیا اور نورین کے کہنے
کے عین مطابق اُس کے باپ نے بغیر کسی حیل و
حجت ارسہ کی ذمہ داری ماموں کے سر تھوپ دی۔
ارسہ کو کراچی پہنچتے ہی ربیعہ کے سامنے بٹھا کر ذیشان
نے سنجیدگی سے کہا۔

''دیکھو ربیعہ میں نے ساری زندگی تمہاری
جلی کٹی سنیں اور سن کر ٹال دیا۔ جب تک ماں باپ
زندہ رہے اُن کی خدمت تمہاری نہیں اپنی ذمہ
داری سمجھ کر میں نے خود کی۔ لیکن ارسہ کو اگر اس
گھر میں کوئی تکلیف ہوئی تو میں نہ معاف کروں گا
نہ لحاظ کروں گا۔ یوں سمجھو اب تمہاری ایک نہیں دو
بیٹیاں ہیں۔''

ربیعہ نے اُس وقت تو ذیشان سے وعدہ کر لیا
اور ذیشان کی موجودگی میں اُس کا خیال رکھنے کی
کوشش بھی کی لیکن آہستہ آہستہ وہ اپنے خول سے
باہر آ گئیں اور ارسہ کو طعنے، تشنوں پر رکھ لیا۔ ارسہ کی
MSC کرنے کی شدید خواہش تھی۔ لیکن ذیشان
کے اصرار کے باوجود ممانی کے ڈر سے اس نے انکار
کر دیا۔ ''ماموں پڑھائی چھوڑے ہوئے عرصہ
ہو گیا۔ اب پڑھائی میں میرا دل نہیں لگتا!'' بیوی کے
تیور دیکھتے ہوئے وہ مصلحتاً خاموش ہو گئے۔ اب ارسہ
تھی اور گھر کی پوری ذمہ داریاں۔ اس پورے گھر
میں اس کی واحد دوست اور ہمدرد تھی علیزہ۔ جو امی
کے منع کرنے کے باوجود کالج سے آ کر ارسہ کا ہاتھ
بٹانے کی پوری پوری کوشش کرتی تھی۔ اُس کو اپنی یہ
معصوم اور خوبصورت سی کزن بہت پسند تھی۔ مگر امی
کی طرح منہاج کو بھی اس سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔
جب بھی ربیعہ کو غصہ آتا وہ ماں کی ہاں میں ہاں
ملانے بیٹھ جاتا اور خوب نمک مرچ لگاتا اور علیزہ کو سر
سے پاؤں تک آگ لگ جاتی۔ ''بھیا آخر ارسہ باجی
نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ بجائے امی کو سمجھانے کے
آپ اُن کے غصے کو اور ہوا دیتے ہیں اور چن چن کر
ارسہ باجی کی وہ خامیاں گنوانا شروع کر دیتے ہیں۔
جو ان میں سرے سے ہیں ہی نہیں۔''

''تمہیں بڑی ہمدردی ہے ارسہ سے کیا رشوت
دی ہے اس نے تمہیں؟'' منہاج نے جل کر کہا۔

''محبت، چاہت اور اپنائیت کی رشوت، آپ
اور ابو آفس میں مصروف اور امی کو سیر سپاٹوں سے
فرصت نہیں ایسے میں ارسہ باجی کی آمد میرے لیے
تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔ سچ اگر آپ ارسہ
باجی کو میری نظر سے دیکھیں تو بے شمار خوبیاں نظر

آئیں گی اُن میں۔'' علیزہ فخر سے بولی۔

''کیوں کیا میں نے اپنی آنکھیں گروی رکھ دی ہیں یا اندھا ہوگیا ہوں۔ جو مجھے نظر نہیں آتا کہ مفت کی روٹیاں توڑنے کے علاوہ تمہاری ارسہ باجی کرتی کیا ہیں۔'' منہاج کے لہجے میں شرارت تھی لیکن علیزہ غصے میں واک آؤٹ کر گئی اور کمرے میں آتے ہوئے ربیعہ کے چہرے پر سکون اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

☆......☆......☆

ارسہ پریاں کی طرح بے حد خوبصورت اور جاذبِ نظر تھی۔ اُس کا رنگ گورا نہ تھا مگر بلا کا پُرکشش، پھر اُس کی بڑی بڑی آنکھیں، گھٹاؤں جیسے گھنے اور لمبے بال اور لمبا قد اُس کو ہر جگہ ممتاز اور نمایاں کر دیتا تھا جس سے ربیعہ خائف تھیں کیونکہ وہ ایک جوان بیٹے کی ماں تھیں۔ جس کے لیے انہوں نے بڑے اونچے خواب دیکھ رکھے تھے۔ جہاں سے اُن کو بے تحاشا دولت ملتی اور وہ مڈل کلاس سے اَپر نہ صحیح لیکن اَپر مڈل کلاس میں تو پہنچ ہی جاتیں اس کنگلی اور ننگی بھوکی ارسہ کو بہو بنا کر انہیں کیا ملتا اور وہ بہت خوش تھیں کہ منہاج اس سے خار کھاتا تھا ورنہ ذیشان ارادہ کر لیتے تو انہیں کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔ منہاج بھی نہیں۔ اور اب انہیں جلد از جلد کسی ایسے رشتے کی تلاش تھی جس کے سر منڈھ کر وہ ارسہ سے اپنی جان چھڑا لیں۔ اِدھر منہاج کے تلخ رویہ کی وجہ سے علیزہ ناراض تھی تو ارسہ پریشان کہ اُس کا ہر کام ٹھیک ہوتے ہوئے غلط ہو جاتا تھا۔ اس دن بھی منہاج کی شرٹ استری کرتے کرتے ممانی کی آواز پر وہ بھاگی تو پیچھے پیچھے منہاج بھی جلی ہوئی شرٹ ہلاتا ہوا کمرے میں آ گیا اور بگڑ کر بولا۔

''امی یا تو آپ خود استری کیا کریں یا پھر مجھے کہہ دیں خود کر لوں گا مگر اس کالی کوئل سے میرا کوئی کام نہیں کرایا کریں۔'' ارسہ کا دل دھک سے ہو گیا اُس کو اچھی طرح یاد تھا اس نے استری کو اسٹینڈ پر رکھا تھا پھر یہ شرٹ کیسے جل گئی؟'' امی بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے چلی گئیں تو علیزہ چیخ پڑی۔

''یہ آپ نے کالی کوئل کس کو کہا؟'' اس دوران ارسہ بھی کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

''اگر امی کا ڈر نہ ہوتا تو میں ارسہ باجی کو اپنی بھابی بنانے میں فخر محسوس کرتی۔''

''دماغ تو خراب نہیں ہے تمہارا کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی!'' منہاج نے مسکرا کر فرضی کالر جھاڑا تو علیزہ کو ہنسی آ گئی۔

''ویسے بھیا آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں اب آپ اتنے بھی گئے گزرے نہیں کہ ارسہ باجی کے سامنے گنگو تیلی لگیں۔'' علیزہ کی شرارت پر منہاج اُس کو مارنے دوڑے اور سامنے سے آتی ارسہ سے ٹکرا گئے اور وہ اُس کو بروقت پکڑ نہ لیتے تو اسے بری طرح گر جانا تھا۔

''اندھی ہو دیکھ کر نہیں چل سکتیں۔'' اس نے بگڑ کر کہا تو ارسہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک تو پہلے ہی سر ٹکرانے سے درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

''ارے اِس کو تو عادت ہے ہمدردیاں سمیٹنے کی اور ٹسوے بہانے کی کچھ مت کہو 'نازک پدمنی' کو جیسے ہم نے تو ظلم کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں؟'' حالانکہ قصور سارا منہاج کا تھا لیکن ربیعہ نے سارا الزام ارسہ کے سر دھر دیا اور وہ کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆......☆......☆

ارسہ آج کل بہت خوش تھی۔ منہاج کی جس دن سے قیمتی شرٹ جلی تھی اس نے سختی سے اپنے کسی بھی کام کو ہاتھ لگانے سے منع کر دیا تھا۔ اس طرح سے اس پر سے کام کا بوجھ بھی کم ہو گیا تھا

اور روز روز کی چخ چخ سے جان بھی چھوٹ گئی تھی۔ روزانہ صبح اچھی خاصی افراتفری مچ جاتی تھی علیزہ، منہاج اور پاپا گھر سے ساتھ ہی نکلتے تھے۔ لیکن ناشتے میں سب کی پسند علیحدہ علیحدہ ہوتی تھی اور علیزہ کی مدد کے باوجود بھی وہ گھن چکر بن جاتی تھی۔ پاپا اور منہاج بریڈ کے ساتھ آملیٹ پسند کرتے تھے، ممانی کو فرنچ ٹوسٹ، جبکہ علیزہ چائے کے ساتھ پکا پکایا پراٹھا کھاتی تھی اور اُس کا ناشتہ تو بچے کچے سے ہی ہوتا تھا۔ ناشتہ کرتے اچانک منہاج نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

''اتنا زیادہ نمک خدا کے لیے ارسہ کوئی کام تو ڈھنگ کا کرلیا کرو۔'' ممانی علیزہ سے باتوں میں مصروف تھیں ورنہ ارسہ کی شامت آجاتی تھی۔

''بیٹا جی میرے آملیٹ میں تو نمک بالکل ٹھیک ہے!'' ذیشان نے سنجیدگی سے کہا۔

''بابا الگ الگ آملیٹ بنانے میں کسی میں زیادہ بھی ہوسکتا ہے۔'' منہاج جلدی سے بولے۔

''مگر ماموں میں نے تو انڈے ساتھ ہی پھینٹے تھے صرف پلیٹوں میں علیحدہ علیحدہ نکالا ہے۔'' ارسہ نے ڈرتے ڈرتے لب کشائی کی اور منہاج کو پتنگے لگ گئے۔

''تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔'' اس نے ارسہ کو آنکھیں دکھائیں اور منع کرنے کے باوجود ذیشان نے اپنی پلیٹ منہاج کی طرف کھسکاتے ہوئے اُس کی پلیٹ اپنے آگے رکھ لی اور ٹشو سے اوپر چھڑکا ہوا نمک صاف کرنے لگے اُن کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی اور منہاج کھسیانے ہوکر جلدی جلدی کافی کے گھونٹ بھرنے لگے۔ ممانی اور ارسہ ہر چیز سے لاتعلق باتوں میں مصروف تھیں۔

☆......☆......☆

اچانک منہاج کا ٹرانسفر اسلام آباد ہوگیا وہ ایک فارماسوٹیکل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر کام کررہا تھا۔ ربیعہ نے تو رو رو کر ڈھیر کردیا۔ اکلوتے بیٹے میں اُن کی جان تھی۔ مگر مجبوری تھی اُس کو جانا پڑا۔ اُس کے جانے کے بعد گھر میں سناٹوں کا راج ہوگیا تھا۔ اُس کی کمی علیزہ بھی بہت زیادہ محسوس کررہی تھی جو بھائی سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور ارسہ......! وہ اپنے احساسات سمجھنے سے قاصر تھی۔ پھر اچانک ارسہ کے ابا آگئے۔ ارسہ اُن سے لپٹ کر رونے لگی۔ مگر اُن کا رویہ روکھا اور لیا دیا سا تھا۔ پھر انہوں نے ایک دم یہ کہہ کر سب کو حیران کردیا کہ وہ اپنی بیوی کے کزن سے اس کی شادی طے کرچکے ہیں اور اب ارسہ کو ہمیشہ کے لیے لینے آئے ہیں۔

امی کی تو خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ ''خس کم جہاں پاک''، لیکن پاپا کا ماتھا ٹھنک گیا۔

''نورین نے مرتے وقت ارسہ کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی تھی۔ اس وقت تو آپ کو کوئی اعتراض نہ تھا پھر یہ اچانک سوکھے دھانوں میں پانی کیسے پڑگیا؟'' پاپا کے سوال پر کھسیانے ہوتے ہوئے ارسہ کے ابو جلدی سے بولے۔

''میں مانتا ہوں آپ نے ارسہ کا بہت خیال رکھا جو آپ کا مجھ پر احسان ہے مگر اب اس کی ماں اِس کو بہت یاد کررہی ہے اور بحیثیت باپ اس کی شادی کرنے کا اختیار تو ہے نا مجھے؟'' پاپا کی تیوریوں پر بل پڑگئے۔ پھر وہ تحمل سے بولے۔

''بالکل ہے، لیکن میں نے بھی ارسہ کو علیزہ سے کم نہیں سمجھا۔ اس لیے خالی ہاتھ تو نہیں بھیجوں گا نا اپنی بیٹی کو۔ پندرہ دن بعد آکر اپنی امانت لے جایئے گا۔ اس دوران ہم بھی کچھ تیاری کرلیں گے۔'' ارسہ کے ابا خوشی خوشی واپس چلے گئے۔

''ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔'' اُن کا تو جہیز کا خرچہ ہی بچ رہا تھا۔ پھر حیدرآباد

کون سا دور تھا۔ ابا نے اپنے ایک دوست کی معرفت معلومات کرائیں تو اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ کون سا عیب تھا جو اُس آدمی میں نہ تھا دو بیویاں ہضم کر چکا تھا اور تیسری ڈکارنے کی تیاری تھی۔ چھ بچوں کا ادھیڑ عمر باپ۔

''ارے تو جس کی بیٹی ہے وہ جانے قاضی جی کیوں دبلے شہر کے اندیشے میں، آپ کی تو وہ مثال ہے کہ سارے جہان کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ نورین خود تو سکون میں ہوگئیں اور ہمیں بے سکون کر گئیں۔'' امی کی زبان کے آگے تو خندق تھی۔ اُن کو بولنے سے کون روک سکتا تھا لیکن پاپا بھی کچھ کم نہ تھے۔

''دیکھو ربیعہ ساری زندگی تم ایک انجانی آگ میں جلتی رہیں۔ شک کے ناگ نے تمہارے دل میں ناسور بنا لیا اور میں کوشش کے باوجود بھی تمہیں اپنے خلوص اور محبت کا یقین نہیں دلا سکا۔ تمہاری دشمنی نورین سے تھی۔ جو منوں مٹی تلے سوگئی ہے اب کم از کم اُس کی بیٹی کو تو معاف کردو!'' پاپا نے التجا کی۔

''ارے تو میں کون سا اُس پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہی ہوں۔ بس یہی تو کہہ رہی ہوں کہ جس کی بیٹی ہے اُس کو فیصلہ کرنے دیں ہم کون تین میں نہ تیرہ میں!''

''امی ہم کیوں نا بھیا سے اُس کی شادی کردیں۔'' علیزہ نے خوش ہو کر تجویز پیش کی اور ربیعہ کی تو جیسے تلوؤں سے لگی تو سر پر بجھی۔

''خبردار جو کسی نے میرے بیٹے کا نام لیا تو اچھا نہیں ہوگا کیا یہی منحوس میرے بیٹے کے لیے رہ گئی ہے شکر ہے منہاج بھی اس سے نفرت کرتا ہے۔ ویسے بھی میرے جیتے جی یہ ممکن نہیں۔'' ربیعہ غصے میں اُٹھ کر چلی گئیں اور پاپا بے بسی سے سر ہلاتے رہ گئے۔

☆......☆......☆

علیزہ سخت بے چین تھی۔ پھوپا کے آنے میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ خود ارسہ بھی گم صم اور خاموش تھی۔ اس کی بھوک پیاس مر چکی تھی۔ وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر روتی تھی اور جب اس کی ملتجیانہ نگاہیں ماموں کی طرف اُٹھتیں تو وہ نظریں چرانے پر مجبور ہو جاتے۔ پورے گھر میں کوئی اگر خوش تھا تو وہ تھیں ربیعہ علیزہ نے گھبرا کر منہاج کو فون کر ڈالا۔

''بھیا کچھ کیجیے پھوپا ارسہ باجی کو جہنم میں جھونک رہے ہیں۔'' اُس نے پوری تفصیل بتائی۔

''پاگل لڑکی میں کیا کر سکتا ہوں پھوپا کو اپنی بیٹی کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا پورا پورا حق ہے اور تم کیوں پرائی آگ میں جل رہی ہو۔ سنا ہے وہ آدمی بڑا پیسے والا ہے دولت میں کھیلیں گی تمہاری ارسہ باجی!'' منہاج نے ہنس کر چھیڑا اور علیزہ کو پتنگے لگ گئے۔

''بھاڑ میں جائے دولت مجھے آپ سے یہ اُمید نہ تھی۔'' علیزہ نے غصے سے موبائل بند کیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بغیر اطلاع منہاج کی آمد نے پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ منہاج کو دیکھتے ہی پاپا نے حکم صادر کیا۔ ''ارسہ کی بقیہ شاپنگ علیزہ بھائی کے ساتھ کرے گی ارسہ کی پسند سے۔''

''مجھے بازار نہیں جانا جس کی شادی ہے وہ خود جائے!'' علیزہ نے جل کر ٹکا سا جواب دیا۔

''ارے میری گڑیا ناراض کیوں ہو رہی ہو تمہیں بھی تمہاری پسند کے کپڑے دلاؤں گا۔'' منہاج کے اصرار پر علیزہ کو جانا ہی پڑا۔ ربیعہ کی طبیعت خراب تھی ورنہ ہرگز بھی تینوں کو ساتھ نہ جانے دیتی اور یہ احساس بھی خوش کن تھا کہ ارسہ سے جلدی ہی جان چھوٹنے والی ہے وہ پاپا

کے علم میں لائے بغیر مسلسل پھوپا کے رابطے میں تھیں اور اُن کے آنے کی منتظر تھیں۔

علیزہ آگے برا سا منہ بنائے بیٹھی تھی اور ارسہ بھی گاڑی میں پیچھے بیٹھی۔ خلاؤں میں نہ جانے کیا گھور رہی تھی جبکہ منہاج بہت خوش تھا اور ڈرائیو کرتے ہوئے ایک مشہور گانے کی دھن پر سیٹی بجا رہا تھا۔ جس سے علیزہ اور بھی سلگ رہی تھی۔ ایک آئس کریم پارلر کے آگے گاڑی روکتے ہوئے منہاج نے کہا۔

''علیزہ شاباش ذرا تین آئس کریم تو لے آؤ! آپ کے اور ارسہ باجی کے لیے لے آتی ہوں مجھے نہیں کھانی۔'' علیزہ کا موڈ بدستور آف تھا اور ارسہ تو جیسے اپنی ہی دنیا میں گم تھی۔

''میری اچھی بہن نہیں ہو دیکھو ہو سکتا پھر کبھی ہمیں اکٹھے اس طرح کھانے کا موقع نہ ملے۔'' منہاج نے خوشامد کی تو علیزہ برا سا منہ بناتے ہوئے گاڑی سے اُتر گئی۔

''ارسہ مجھے آپ سے ایک سوال کرنا ہے۔'' وہ پورا کا پورا پیچھے کی طرف گھوم گیا۔

''مجھ سے شادی کرو گی؟''

''جی!'' ارسہ کی حیرت سے آنکھیں پھٹ گئیں اور حواس گم ہو گئے۔

''یہ کوئی حساب کا مشکل سوال نہیں جو حیرت سے تمہارا منہ کھل گیا ہے۔'' منہاج نے کہا۔

''نہیں!'' ارسہ کے لہجے میں سختی تھی۔

''آپ کو مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں میں اپنے باپ کی خوشی میں خوش ہوں اور اگر یہ مذاق ہے تو بے حد بھونڈا اور بیہودہ!''

''مگر میں خوش نہیں۔'' منہاج نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیونکہ میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں!''

''خاموش ہو جائیں اور کسی اور کو بے وقوف بنائیں سارا وقت آپ کی کڑوی کسیلی باتیں سنتی رہی ہوں کالی کوئل، کام چور، نکمی، پھوہڑ، ہڈ حرام اور نہ جانے کیا کیا۔ بس آپ فوراً گھر چلیں مجھے کچھ نہیں لینا۔'' ارسہ نے سختی سے کہا۔

''اُف ارسہ کس قدر بے وقوف اور کوڑھ مغز ہو تم؟'' وہ گویا صدمے سے کراہا۔ ''اگر میں یہ سب کچھ نہ کرتا تو امی تمہارا جینا حرام کر دیتیں میری ذرا سی توجہ اور فیور تمہاری مشکلات میں اضافہ کر دیتا جو میں نہیں چاہتا تھا۔''

''مجھے آپ کی کسی بات پر بھروسہ نہیں بس آپ گھر چلیں مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننا۔'' ارسہ نے بے رخی سے کہا اور منہاج کا دل چاہا کہ ابھی اس کو بری طرح لتاڑ دے مگر ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اس قدر احمق ہو گی۔ اپنی اتنی قیمتی شرٹ جلالی، انڈے پر خود سے نمک چھڑک کر اپنی بیزاریت کا اظہار کیا اور تو اور تمہیں پھوہڑ اور کام چور کا خطاب دے کر اپنے کام کا بوجھ تم پر سے ہلکا کیا اور محترمہ کے مزاج ہی نہیں مل رہے تم سے زیادہ سمجھدار تو میرے پاپا ہیں۔ جو بغیر کہے میرے دل کی بات جان گئے۔ تم یقین کیوں نہیں کرتیں کہ یہ سب ایک ڈرامہ تھا اور اس ایکٹ کے اصل خالق میرے پاپا اور میں اکلوتا ایکٹر جوان کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔ چلو تمہیں مجھ پر نہیں تو اپنے ماموں پر تو اعتبار ہے۔'' اب ارسہ اتنی بھی بیوقوف نہیں تھی کہ الفاظ کی گہرائی اور لہجے کی سچائی نہ پہچانتی اور پھر ماموں کا حوالہ تو سب سے معتبر تھا اور اس سے بھی بڑھ کر دل کے نہاں خانوں میں چھپی منہاج کی محبت جو جانے کب اس کے روم روم میں سما گئی تھی۔ جس کے بارے میں تنہائی میں بھی سوچتے ہوئے وہ خوف زدہ ہو جاتی تھی اور اب یہ خواب شرمندہ تعبیر ہونے والے تھے۔ علیزہ آئس کریم لے کر آئی تو

ارسہ نے مسکرا کر تھینک یو کہا۔ اُس کے چہرے پر شرم وحیا اور خوشی کی عجیب سی چادر تنی ہوئی تھی جو علیزہ کی فہم سے باہر تھا کہ اچانک ایسا کیا ہو گیا کہ ارسہ باجی کی باچھیں کھلی پڑ رہی ہیں۔ ایک بنگلے کے آگے گاڑی رُکی تو علیزہ اچھنبے سے بولی۔

''بھیا یہ ہمیں آپ یہاں کیوں لے آئے ہمیں تو شاپنگ کے لیے جانا تھا؟''

''میری لاڈلی راج دلاری بہنا! ارسہ کو تمہاری بھابی بنا کر تمہاری خواہش کا احترام بھی کر رہا ہوں اور اس بڈھے کھوسٹ سے تمہاری باجی کی جان بھی چھڑا رہا ہوں۔'' علیزہ کی آنکھیں پہلے حیرت سے پھٹ گئیں پھر وہ روڈ پر ہی ارسہ سے لپٹ کر اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگی۔ اس دوران پاپا بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ قاضی کو لے کر آ گئے۔

☆......☆......☆

رات کے دس بج رہے تھے اور ربیعہ کا پریشانی سے برا حال تھا۔ شہر کے حالات نے ہر شخص کو ایک اَن دیکھے خوف میں مبتلا کر رکھا ہے اور آج تو تینوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے ابا کا بھی کچھ پتا نہ تھا۔ موبائل بھی سب کے بند تھے پھر چاروں جب گھر میں داخل ہوئے تو وہ گھبرا کر بولیں۔

''حد کرتے ہو تم لوگ اتنی دیر لگا دی اور موبائل بھی آف کچھ ماں کا بھی خیال ہے؟''

پھر اُن کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ سرخ رنگ کے کامدار سوٹ میں ارسہ نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت لگ رہی تھی اور منہاج نے بڑی محبت سے اُس کا حنائی ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔

''یہ سب کیا ہے ذیشان!'' ایک انہونی کا سوچتے ہوئے وہ بری طرح چلائیں۔

''تمہارے لیے سرپرائز، میں نے منہاج کا نکاح ارسہ سے کر دیا ہے۔ Reception تم

اپنی مرضی سے جب چاہو کر لینا۔'' پاپا لاپرواہی سے گویا ہوئے اور ربیعہ غصے سے کانپنے لگیں۔

''آپ نے مجھے پوچھے بغیر، میری مرضی جانے بغیر میرے بیٹے کا نکاح کر دیا اور مجھ سے اجازت لینا بھی ضروری نہ سمجھا اور یہ میسنا جو سارا وقت اس سے نفرت کے لاگ الاپتا رہتا تھا کس طرح محبت سے اُس کا ہاتھ پکڑے کھڑا ہے اور یہ میری اکلوتی بیٹی!'' غصے سے علیزہ کی طرف بڑھیں تو وہ سہم کر باپ کے پیچھے ہو گئی۔

''بس بہت ہو گیا ربیعہ بیگم، اب تک میں خاموش تھا گھر کے سکون کی خاطر، لیکن اب یہ میرے بیٹے کی خوشیوں کا سوال تھا تم کیسی ماں ہو جو اپنے بیٹے کے دل کی بات نہ سمجھ سکیں۔ اس کی آنکھوں کو نہ پڑھ سکیں۔ خود ساختہ حسد اور شک کی آگ میں ساری زندگی خود بھی جلتی رہیں اور ارسہ کو بھی اس کا نشانہ بنایا۔ بھلا میں اپنے بیٹے کی چاہت کو اس بدقماش بڈھے کے حوالے کیسے کر دیتا۔ میں نے اس کی مری ہوئی ماں کو اس کی خوشیوں کی ضمانت دی تھی اور پھر اس میں تو ہم سب کی بھی خوشی تھی۔ مگر تم نہ سمجھ سکیں۔''

پاپا نے افسوس سے سر ہلایا۔ علیزہ اور منہاج دوڑ کر ماں سے لپٹ گئے۔ ماموں کے اشارے پر ارسہ بھی ممانی کے آگے گڑگڑانے لگی لیکن انہوں نے غصے میں صاف صاف کہہ دیا۔

''اس گھر میں یا تو ارسہ رہے گی یا میں!'' اور پاپا کے کہنے پر بھیا اسی وقت ارسہ باجی کو اسلام آباد لے کر چلے گئے ارسہ کے باپ کو پتا چلا تو وہ بھی بڑا تلملائے مگر کیا کر سکتے تھے۔ سوائے اپنے بال نوچنے کے ارسہ بالغ اور سمجھدار تھی بچی نہیں تھی۔

گھر کی فضا بڑی بوجھل ہو گئی تھی۔ پاپا کو بھی خاموشی لگ گئی تھی اور امی بھی لگتا تھا پوری دنیا کیا خود سے بھی خفا ہیں۔ بھیا کے دن میں کئی کئی بار فون آتے مگر امی نمبر دیکھتے ہی بند کر دیتیں۔ ارسہ مسلسل پاپا اور علیزہ کے رابطے میں تھی اور سخت پریشان تھی اور اس کا ذمہ دار وہ خود کو سمجھتی تھی اور فون پر روتی رہتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سال گزر گیا۔ کالج کی چھٹیوں میں علیزہ کا اسلام آباد جانے کا پروگرام تھا مگر امی کے غصے کی وجہ سے اجازت لینے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس دن پاپا آفس سے آئے تو بڑے خوش تھے۔ ''لو بھئی علیزہ بیٹے اسلام آباد جانے کی تیاری کر لو، عنقریب تم پھوپو بننے والی ہو تمہاری بھابی کو تمہاری سخت ضرورت ہے۔''

علیزہ ''یاہو'' کا نعرہ لگا کر خوشی سے ماں سے لپٹ گئی۔

''وہ بچی ہے وہاں جا کر کیا کرے گی۔ ایسے موقع پر تو کسی بزرگ اور تجربہ کار خاتون کی ضرورت ہوتی ہے۔'' ربیعہ بول پڑیں۔

''ہاں تو کہاں سے لاؤں ایسی خاتون ارسہ کی ماں تو کب کی دنیا سے جا چکی ہے۔'' پاپا نے بیچارگی سے کہا اور امی بغیر کچھ کہے اُٹھ کر چل دیں پھر علیزہ نے دیکھا۔ ربیعہ سخت بے چین تھیں۔ پوری رات انہوں نے ٹہلتے ہوئے گزاری صبح بھیا کا فون آ گیا اور اس مرتبہ پاپا نے اسپیکر آن کر دیا۔

''امی کیا اب بھی ناراض رہیں گی۔ ڈاکٹر نے سیزیرین بتایا ہے تین دن بعد آپریشن ہے۔ پلیز امی اب تو مان جائیں۔ ہم دونوں کو آپ کا شدت سے انتظار ہے۔'' بھیا کی آواز بھرا گئی اور ربیعہ نے جواب دیے بغیر فون بند کر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''اُس نے مجھے اپنا دشمن سمجھا ارے اکلوتا لاڈلا بیٹا تھا۔ مجھے بتاتا تو صحیح بے شک غصہ کرتی، ناراض ہوتی میری اہمیت کا احساس تو ہوتا۔ کیا کیا ارمان نہ تھے اس کی شادی کے لیے جس کو 9 ماہ

اپنی کوکھ میں رکھا۔ اپنا خون پلا کر پروان چڑھایا۔ مگر اس نے کیا کیا میری ممتا کی توہین کی اور مجھے سب نے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا کیا ایک ماں کی یہی اوقات تھی۔'' ان کے ساتھ ساتھ علیزہ بھی ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

''آج اسے اپنی ماں کے جذبات کا احساس ہو رہا تھا۔ ارسہ باجی تو بے قصور تھیں۔ لیکن بھیا کو تو سوچنا چاہیے تھا امی کو منانا چاہیے تھا۔ انہوں نے انہیں اعتماد میں کیوں نہیں لیا۔ ہم سب نے امی کو تنہا کر دیا۔ اگر بھیا امی کو بتا کر شادی کرتے تو شاید امی کو اتنا دکھ نہ ہوتا۔''

پاپا بھی ربیعہ کو سمجھانے بیٹھ گئے۔ ''دیکھو ربیعہ میں نے آج تک تمہیں کبھی کچھ نہیں کہا نہ روکا نہ ٹوکا۔ تم نے جیسا چاہا ارسہ کے ساتھ سلوک کیا اور میں خاموش رہا۔ لیکن سوچو آج علیزہ ہے کل اپنے گھر چلی جائے گی تو ہمیں بڑھاپے میں سہارا دینے والا کون ہوگا؟ آخر تمہیں ارسہ سے کیا شکایت ہے۔ جس دن سے اس گھر میں آئی ہے پورے گھر کی ذمہ داری سنبھال کر اس نے تمہیں ہر ذمہ داری سے آزاد کر دیا ہے۔ تمہارے ہر حکم کو قرآن و حدیث کی طرح بجا لائی کبھی تمہیں پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ تمہاری ہر تلخ و شیریں بات کو ہنس کر سہا۔ کیا آج کل کی بہوئیں اتنی تابعدار، خدمت گزار اور فرمانبردار ہیں؟ کیا تم نے زمانے کا چلن نہیں دیکھا کہ بہوئیں تو بہوئیں اب تو بیٹے بھی اپنے والدین کو برداشت نہیں کرتے جبکہ تمہارا بیٹا تو تمہاری محبت میں تڑپ رہا ہے، گڑگڑا رہا ہے، معافی مانگ رہا ہے۔ اگر تم معاف کر دو گی تو یہ تمہارا بڑا پن اور ظرف ہوگا کہ معاف کرنا تو خدائی صفت ہے۔ دل سے سوچو تم کیا کھونے جا رہی ہو؟'' امی کے جواب نہ دینے پر وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے اُٹھ گئے۔ علیزہ کو خود امی کی بے حسی پر دکھ ہو رہا تھا۔ پھر اچانک امی کے موبائل پر ارسہ کا فون آ گیا۔

''ممانی آپ جتنا بھی ناراض ہوں مگر میں جانتی ہوں مجھے آپ کی دعاؤں نے ہی نئی زندگی دی ہے کیونکہ میری تو ماں ہے نہیں!'' وہ بری طرح رو رہی تھی۔

''بیٹا! تم ٹھیک تو ہو؟'' امی نے بے چینی سے پوچھا۔

''ہاں ممانی آپ کی دعاؤں سے معجزہ ہو گیا جس پر ڈاکٹر بھی حیران ہیں نارمل ڈلیوری ہوئی ہے اور آپ دو پوتوں اور ایک پوتی کی دادی بن گئی ہیں آج صبح، مگر میں نے ڈاکٹر کو صاف صاف کہہ دیا ہے کہ جب تک اِن کی دادی نہیں آئیں گی نہ میں اِن کی شکل دیکھوں گی نہ اِن کو دودھ پلاؤں گی۔''

''ارسہ بیٹی!'' امی کی چیخ بے ساختہ تھی۔ پھر روتے ہوئے بولیں۔

''خبردار جو تم نے اِن کو دودھ نہ پلایا کبھی معاف نہیں کروں گی۔ فوراً میرے بچوں کو دودھ پلاؤ، ورنہ میں سچ مچ ناراض ہو جاؤں گی۔'' ان کے رونے کی آواز سُن کر علیزہ اور ذیشان ننگے پاؤں بھاگے۔

''ارے میری شکل کیا دیکھ رہے ہیں جلدی سے تینوں کی پلین کی سیٹیں بک کرائیں۔ اکنامی کلاس نہ ملے تو بزنس کلاس کے ٹکٹ لے لینا۔ میرے دونوں پوتے اور ایک پوتی مجھے بلا رہے ہیں۔ آج اور ابھی اسلام آباد جانا ہے میری بہو کو میری ضرورت ہے۔'' پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ آنے والے مہمانوں نے برف پگھلا دی تھی اور خون کے رشتوں نے دل پر میں بھڑکتی ہوئی۔ نفرت کی آگ بجھا دی تھی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ''اصل سے سود پیارا ہوتا ہے۔''

☆☆......☆☆

اس روز جب باہر مینہ کی جھڑی تھی۔ میں چھتری لے کر نیچے اتری تو بابا کی خواب گاہ سے میری ماں کے رونے کی آواز آرہی تھی اور بابا ان پر برس رہے تھے۔ میں نے برابر کے کمرے میں سہمے ہوئے چھوٹے بھائیوں کو جھانکتے ہوئے دیکھا۔ یہ تو ہر روز کا معمول......

ماں کی محبت سے گندھا، ایک بہت خاص افسانہ

یہ گلابی جاڑوں کی گہری سیاہ شام تھی جب میری ماں نے مجھے یہ خبر دی کہ تمہاری شادی ٹھرا دی گئی ہے انہوں نے میری آنکھوں میں جھانکا چند لمحوں میں میری اڑان کی طرز آنکھوں میں پریشانی ، پیار، خوف اور تکلیف کے سائے دیکھ لیے۔ لیکن پھر بھی آنکھیں چرا گئیں۔ میں نے اپنے کمرے کی بالکونی میں آکر سامنے نظر دوڑائی جہاں بے ترتیب جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، اور ان کے درمیان آگے پیچھے، پتلے موٹے، لمبے چھوٹے، تنوں والے درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑے، تھے۔ ان کی اوٹ میں سے اُداس چاند جھانک رہا تھا شام کے ملگجے سائے میں یہ سارے منظر جادو سا جگا رہے تھے ۔اس جادوئی منظر میں، مجھے ، میرا بچپن صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں ایک پھول سی خوش باش لڑکی تھی جو اپنے گھر کے خوشنما باغ میں معصوم ہرنی کی طرح کلیلیں بھرتی پھرتی رہتی تھی۔ ایک سرکاری افسر کی اکلوتی بچی ہونے کے باعث سارے کنبے کی بڑی چہیتی تھی میرے بابا ہر چند نہایت سخت گیر تھے، مگر مجھ پر وہ اپنا سارا پیار نچھاور کرتے تھے۔ نام تو میرا مہر نابو تھا پر انہوں نے میرے بڑے پیارے پیارے نام رکھے تھے، مہرو گڑیا، ڈوڈو، ڈولی، پری، کوئین۔ میں ماں سے زیادہ باپ کے قریب تھی اور بیٹا ماں سے۔ شاید نصف مخالف ہونے کی وجہ سے محبت کی یہ کشش فطری ہے کچھ بھی ہو میں نے ہمیشہ اپنی ماں کو اپنے دونوں بھائیوں کے کاموں میں الجھا دیکھا۔ وہ بس انہیں کی ماں لگتی تھیں اور اور میں فاصلے پر کھڑی صرف انہیں تکا کرتی تھی یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ خاندان کا اگر کوئی ایک فرد ترقی کر جائے تو لوگ اس کو گھیر لیتے ہیں۔ دور پار کے سارے رشتہ دار آکر ہمارے گھر میں اکھٹے ہو گئے۔ ہر کوئی بابا کی وساطت سے سرکاری نوکری چاہتا تھا۔ وہ بہت اچھے تھے۔ بابا کے گاؤں کے کوئی عزیز تھے۔ تعلیم نہ ہونے کی بنا پر بابا نے باغبانی میں دلچسپی دیکھتے ہوئے انہیں اپنے گھر پر ہی مالی کے کام پر رکھ لیا تھا۔ چاچا دینو کو اپنے سنوارے ہوئے پھولوں، پودوں اور درختوں کے درمیان بڑا سکون

محسوس ہوتا تھا۔ باغ میں کام کرتے ہوئے جانے ہولے ہولے کیا کیا گیت گنگناتے تھے۔ رُک رُک کر اس طرح چلتے جیسے وہ پھلواری کے آقا ہوں۔ چاچا دینو بابا کی طرح مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔

اس روز جب باہر مینہ کی جھڑی تھی میں چھتری لے کر نیچے اتری تو بابا کی خواب گاہ سے میری ماں کے رونے کی آواز آرہی تھی اور بابا ان پر برس رہے تھے۔ میں نے برابر کے کمرے میں سہمے ہوئے چھوٹے بھائیوں کو جھانکتے ہوئے دیکھا۔ یہ تو ہر روز کا معمول تھا بابا یونہی غصہ ہوتے تھے میرا وہ بچپن تھا جب ہر چیز کو بچے ہلکا لیتے ہیں مجھے معلوم تھا۔ دوسرے روز ماں نکھری نکھری ناشتے کی ٹیبل پر بابا کو ناشتہ دیں گی اور بابا ان کی تعریف کریں گے۔ یہ سوچتے ہوئے میں بابا دینو کے پاس پہنچی، جو

پانی میں بالکل بھیگ چکے تھے، اور اپنا کام ختم کرکے کوارٹر کی طرف جارہے تھے اچانک انہیں کسی نے آواز دی میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا وہ چودہ سالہ لڑکا تھا۔ اپنی عمر کی مناسبت سے کہیں زیادہ اس کی طویل قامت تھی۔ صبح سویرے ڈرائیور ہمیں گاڑی میں اسکول چھوڑ دیتا تو وہ پیدل اپنے اسکول کے لیے جارہا ہوتا تھا۔ سیٹی بجاتا ہوا ہولے ہولے پھولوں اور پودوں سے نکلتا گھر سے باہر قدم بڑھاتا۔ میں پیچھے کار میں بیٹھی کھڑکی کے شیشوں سے اسے جاتا ہوا دیکھتی۔ پھر آہستہ آہستہ ہمارے گھر والوں کے قریب آتا گیا۔ اس نے سب پر ایسا خوگوار اثر ڈالا تھا کہ ہر کوئی اسے پکارتا وہ گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتا تھا۔ بابا ہمیشہ ماں کو گھر کے کاموں میں لگائے رکھا۔ . کا. قیمتی ملازمہ بھی رکھ سکتے تھے

مگران کا کہنا تھا، "پھر بیوی کا کیا فائدہ؟ جب سارا کام ملازم کریں گے۔" اس لیے صفائی کے علاوہ ماں کو سارا گھر دیکھنا پڑتا تھا۔ وہ باورچی خانے میں بے دھڑک جاتا اور ماں کا ہاتھ بٹاتا، ڈھیروں باتیں کرتا، کبھی کبھی مجھے اس کے بہت زیادہ بولنے پر چڑ ہوتی۔ پھر نہ جانے کیسے میری اس سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ وہ مجھ سے ایک سال بڑا تھا۔ وہ مجھے اپنے گاؤں کی سیدھی سادھی کہانیاں سناتا تھا، اور میں اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں پر ٹکائے اس پر نظریں جمائے چپ چاپ بیٹھی کہانیاں سنتی رہتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اس کی اور کیوں کھنچتی چلی جارہی تھی؟ بس وہ دوسروں سے ذرا مختلف تھا۔ اسے دوسروں سے نباہ کرنے کا سلیقہ آتا تھا اس کی ذہانت اور میٹھے بولوں نے میرے خاندان کا دل موہ لیا تھا لیکن وہ میرے بابا کا دل نہ جیت سکا۔

دھیرے دھیرے میرے اور اس کے درمیان دوستی کا گہرا ناطہ، مضبوط تر ہوتا جارہا تھا۔ میری ماں اب اس سے ناراض رہنے لگیں تھیں، بلا وجہ اسے بات بات پر ڈانٹ دیا کرتی تھیں۔ وہ خوش اخلاق ضرور تھا، مگر انا پرست بھی تھا۔ ذہین نہیں تھا، بہت کچھ اپنے زور بازو پر کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ اس لیے گھمنڈی لگتا تھا۔ کالج کی زندگی نے اسے بے پناہ مصروف کردیا تھا میڈیکل کی تعلیم کا اسے جنون تھا وہ خود مستقبل میں ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، اس لیے وہ کتابوں کا کیڑا بن چکا تھا۔ مگر فرصت کے جتنے لمحے اسے ملتے وہ میرے پاس بھاگا چلا آتا۔ یہ سب میری ماں کو بہت ناگوار لگتا۔ ایک روز میری ماں نے مجھے کہا "اب تم بڑی لگتی ہو ہمیں تم دونوں کا زیادہ میل جول پسند نہیں ہے تمہارے بابا تو شہزاد کو ذرا خاطر میں نہیں لاتے دیکھو میری بیٹی! جوان جہان لڑکی کا کسی لڑکے کے ساتھ زیادہ ربط وضبط ہو تو بدنامی

کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔" ماں کا تنبیہ کرنا مجھے بہت برا لگا۔ کئی روز کمرے میں بند رہی۔ کافی سوچنے کے بعد میں نے محسوس کیا جیسے میرے سامنے رنگوں کی برسات چلی آرہی ہے۔ ان رنگوں کی قوس قزح نے مجھے گھیر لیا ہے۔ میں نے ہولے سے جب اپنا ہاتھ دل پر رکھا تھا تو دل شہزاد کے نام پر زور سے دھڑکا۔ آنکھیں بند کیں تو اس کا مسکراتا چہرہ مجھے نظر آیا۔ دل نے سرگوشی کی "ہائے اللہ مجھے تو اس سے پیار ہوگیا۔" اس رات میں اور وہ باغ میں پھولوں کے درمیان سر جوڑے باتیں کررہے تھے پہلی بار مجھے پیار کا احساس ہوا تھا ہر ہر بات پر میرے ہونٹوں پہ تبسم اور آنکھوں سے پیار جھلک رہا تھا۔ وہ کوئی بات کررہا تھا۔ دفعتاً میں نے مسکرا کر کہا۔ معلوم ہے آج میری ماں نے مجھے کیا کہا تھا؟ اس نے گردن انکار میں ہلائی "ماں" نے کہا ہے میں نے ایک لفظ پر زور دے کر کہا "میں اب تم سے نہ ملا کروں" وہ مسکرایا "ہاں وہ ٹھیک کہہ رہی تھی اب ہم بڑے ہوگئے ہیں۔ میں نے جھنجلا کر اپنا سر جھٹکا "ہنہ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا تم اب مجھ سے نہیں ملو گے؟ میرے ماتھے پر غصے کی وجہ سے تیوریاں جو پڑیں تو وہ ہنس دیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما ۔مطلب یہ ہے کہ وہ تمہاری ماں ہے وہ محسوس کرنے لگی کہ ہیں کہ میں تمہاری طرف کھنچا چلا جارہا ہوں، اس لیے وہ مجھے ناپسند کرنے لگیں ہیں۔ ان کو میرا تم سے ملنا اچھا نہیں لگتا۔

میں چونکی تو کیا تم مجھے چھوڑ دو گے؟ بھلا سانس لیے بغیر کوئی جی سکتا ہے؟ اب کیسے چھوڑوں گا۔" اس کی آنکھوں میں پیار امنڈ رہا تھا۔ اچانک آہٹ محسوس ہوئی اور میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔

چند روز سے وہ بالکل نظر نہیں آرہا تھا چاچا بھی غائب تھے۔ میں کس سے پوچھتی۔ میں نے اس کو

بہت بھولنا چاہا۔ مگر ادھر زمانے کے رواج کے مطابق میرے والدین نے میرے لیے رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ لیکن ایک ایک کر کے میں ان سب کو ٹھکراتی رہی میں اکثر کہہ دیا کرتی تھی کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔ میری ماں کے دل پہ چوٹ لگتی تھی۔ ہر ماں کی طرح میری ماں کی بھی یہ خواہش تھی کہ میں اپنے گھر کی ہو جاؤں۔

میں یادوں میں گم اپنے باغ میں گُم صم سی کھڑی تھی۔ تب میری ماں نے چپکے سے آ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا میں چونک گئی۔ ”میں جانتی ہوں میری بیٹی تم مجھ سے کیوں ناراض ہو اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو مجھے دکھ کے ساتھ تمہیں یہ بتانا پڑ رہا ہے کہ شہزاد تمہارے ابا کے حکم سے بہت دور جا چکا ہے اور اب تمہارے اور اس کے درمیان بہت دوری حائل ہے بہتر یہی ہے کہ تم اسے بھول جاؤ اور نئی زندگی کا سفر آغاز کرو۔“ میری ماں نے پیار سے میرے کھلے بالوں پر ہاتھ پھیرا میں ناراضگی سے دُور جا کر کھڑی ہوگئی میری خاموشی اور میرا رویہ انہیں بتا رہا تھا کہ میں اس ساری صورت حال کا انہیں قصور وار سمجھتی ہوں تب وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں ”میں تمہارے باپ کے ساتھ کٹھ پتلی کی طرح رہی ہوں میری ڈور ہمیشہ ان کے ہاتھ رہی ہے انہیں خاندان میں، گھر میں جو کچھ کرنا ہوتا ہے وہ مجھ سے یہی کرواتے ہیں وہ تم سے کبھی خود اس سلسلے میں مخاطب نہیں ہوں گے۔ تم میری بات پر یقین کرو وہ لڑکا مجھے بہت پسند تھا مگر تمہارے باپ ایسا نہیں چاہتے میں تو یہ چاہتی تھی کہ تمہارے ابا اس کی رہنمائی کریں، اور تم ہمیشہ ہمارے پاس رہو مگر تمہارے ابا کو سوسائٹی میں رہنا ہے وہ مقابل کا رشتہ چاہتے ہیں جو تمہیں دنیا بھر کا عیش دے چاہے ان کی طرح وہ تمہیں بھی کٹھ پتلی بنا کر رکھے ہو سکے تو ایک ماں کی مجبوری سمجھو اور مجھے معاف کر دو، ماں جا چکی تھی اور میں دم بخود کھڑی تھی۔

بابا کو ہمیشہ میں نے ماں سے زیادہ مہربان پایا تھا پھر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ آنسو تھم نہیں رہے تھے میری بے بسی پر آسمان بھی رو رہا تھا موسلا دھار بارش میں کھڑی بھیگتی رہی دوسرے دن مجھے بخار ہو گیا میں اسکی جدائی کا صدمہ سہہ نہیں پا رہی تھی۔ گرمیاں، پھر سردیاں، خزاں پھر بہار آ گئی۔ شاخوں میں کونپلیں، پھوٹیں، انہی تبدیلیوں کے ساتھ میری زندگی نے بھی کروٹ لی اور میں سومرو خاندان میں بیاہ دی گئی جس دن میری رخصتی تھی اس دن مجھے احساس ہوا میری ماں مجھے واقعی میرے بابا سے زیادہ پیار کرتی تھی وہ بار بار اپنے آنچل سے آنسوں صاف کر رہی تھیں اور مجھ پر سورتیں اور آیتیں پڑھ کر پھونک رہی تھیں یہ خواب ہر ماں کا ہوتا ہے کہ اسکی بیٹی کو دنیا کا سکھ ملے لیکن ہر بیٹی کے نصیب میں سکھ نہیں ہوتا زمانے کی ٹھوکریں بھی ہوتی ہیں لالچی لوگ مل جائیں تو زندگی عذاب بن جاتی ہے، اور اگر شوہر بھی اپنے گھر والوں کی طرح بے حس نکلے تو دکھوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ پھر وہ چہکتی لڑکی کہیں کھو جاتی ہے جو بابل کی دہلیز سے رخصت ہوتی ہے۔ میں نے بڑی سچائی سے اور خلوص سے اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کیا تھا اور میں سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی مگر موسم کا تعلق لطیف احساسات سے ہوتا ہے ہزار باڑیں لگانے کے باوجود یادیں مجھے گھیر لیتی تھیں۔ اس دن بھی دل ایسے ہی کچھ اداس سا ہو رہا تھا۔ جب میرے شوہر نامدار نے آ کر مجھے بالوں سے پکڑا تھا اور گالیاں دیتے ہوئے مجھے گھسیٹا تھا اسے اور اس کے گھر والوں کو میرا جہیز ذرا نہ بھایا تھا۔ میرے

والدین نے بھی مجھے بہت کچھ دیا تھا لیکن پھر بھی میرا جہیز ان کی توقعات پر پورا نہیں اترا تھا اور وہ اس کا بدلہ اس طرح سے لے رہے تھے۔

اس روز نہ چاہتے ہوئے میرے قدم بابا کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ میرے ہاتھ دروازے پر دستک دیتے ہوئے کپکپا رہے تھے میں نے ہمت کر کے دروازہ کھٹکھٹایا میری ماں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے دروازہ کھولا اندر ڈاکٹر موجود تھا میری ماں مجھ سے لپٹ کر بہت روئی تھی مجھے ان کے آنسوں اور تڑپ بتا رہے تھے کہ انہیں میرے دکھوں کا علم تھا۔ ماں نے اس شام مجھے بتایا تمہارے شوہر نے بابا سے تمہاری جائیداد کا حصہ طلب کیا ہے اور نہ دینے کی صورت میں طلاق دینے کی دھمکی دی ہے۔ یہ اس کی کم ظرفی کی انتہا تھی جس نے میرے والد کو صدمہ پہنچایا میرے بابا رویے میں سخت تھے لیکن اصول پسند تھے۔ بہت خوددار تھے۔ اپنے منہ سے مانگنا وہ مردانگی کے خلاف سمجھتے تھے میرے شوہر کا تقاضا سن کر ان کی حالت تو خراب ہونی تھی قدرت کے مکافات عمل کا اپنا ہی ایک نظام ہے بابا نے جسے فقیر جانا وہ خوددار نکلا اور ہماری زندگی سے بہت دور چلا گیا اور جسے امیر سمجھا وہ فقیر سے بھی بدتر نکلا اب بیٹی کی تباہی دیکھ کر وہ پریشان تھے۔

دونوں بیٹوں کو بابا نے کینیڈا بھیج دیا تھا اور وہ وہاں کی دنیا میں مست ہوگئے تھے میں اسپتال کے کوریڈور میں بیٹھی سوچ رہی تھی بیٹے کی پیدائش پر والدین خوشیاں مناتے ہیں ہر عورت بیٹے کی ماں بننا چاہتی ہے ہر باپ بننے والے مرد کو بیٹے کا باپ بننے کی دعا دی جاتی ہے منتوں مرادوں سے پالے بیٹے ایسے ہی نکلتے ہیں جیسے میرے بھائی نکلے ہیں؟؟ بھیجا پڑھنے کے لیے تھا اور وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے تھے فون پر کبھی کبھی ان سے رابطہ ہوتا تھا لمحوں میں زندگی کیا سے کیا ہو جاتی ہے؟ میرے بابا اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے آخری نظر جب انہوں نے مجھ پر ڈالی تھی تو انہوں نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ وہ اپنے اس فیصلے پر پرنادم تھے۔ لیکن لوازمتیں، گزرا وقت بھلا کہاں واپس لاتی ہیں۔ پھر بابا کی موت نے مجھے بے تحاشہ رلایا۔ بابا نے تو پھر بھی مجھے چاہتوں سے رکھا تھا، مجھے ان سے محبت تھی۔ کئی ہفتوں میں بابا کے غم میں نڈھال رہی۔ میری ماں کو میری بہت فکر تھی وہ مجھے جائیداد میں سے بہت کچھ دینا چاہتی تھیں مگر جب وکیل کو بلایا گیا تو معلوم ہوا ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا، سوائے دس بارہ لاکھ کے۔ بابا اپنے بیٹوں کے مطالبے، بڑی بڑی رقمیں بجھوا کر پورا کرتے رہے تھے ویسے بھی بابا ان مردوں میں سے تھے جو اپنی آمدنی کبھی اپنے بیوی بچوں کو نہیں بتاتے۔ بس ان کی ضرورتیں پوری کرتے رہتے ہیں بابا خود مختار تھے جو چاہتے تھے۔ وہ کرتے تھے اب کیا ہوسکتا تھا میری ماں نے مجھے یہ صلاح دی کہ وہ لوگ مجھے سکون سے رہنے نہیں دیں گے" وہ جھوٹے لوگ ہیں۔ ہم سچ بھی بتائیں گے تو وہ جھوٹ سمجھیں گے اس سے بہتر یہ ہے کہ تم خلع لے لو اب فیصلہ تم کرو گی۔ روز روز کے مرنے سے بہتر ہے تم فیصلہ کرلو۔"

ماں اپنی خواب گاہ میں جا چکی تھیں میں۔ بیچ میں کھڑی تھی۔ یہ بڑے تکلیف دہ لمحات تھے۔ مجھے زور کا سر چکرایا اور میں گر پڑی زمین نے بھی قدم جمنے نہیں دیئے۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آیا اور خبر یہ تھی کہ اب خود میں ماں کے درجے پر پہنچ گئی ہوں۔ قدرت کا اپنا فیصلہ تھا مجھے اس بچے کی خاطر جانا تھا۔ دل پر پتھر کی سل رکھ کے میں گئی۔ اپنے ہی گھر میں قدم بڑی مشکل سے رکھے۔ وسوسے اور وہم تھے، آنے والے لمحوں نے مجھے خوفزدہ کر رکھا تھا۔ میرے شوہر کی بس ایک ہی رٹ تھی۔" جائیداد کا

بٹوارہ اب تک کیوں نہیں ہوا؟ تمہیں اب تک تمہارا حق نہیں دیا گیا؟'' میں نے ہر بات کی وضاحت کر دی تھی۔ مگر وہ تو یقین کرنے پر تیار ہی نہیں تھا۔ اس نے اور اس کے گھر والوں نے مجھے طنز و تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس گھر کی صبح و شام میں ایک ایسی ہی فضا تھی۔ مجھے یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ حوصلہ شکنی نے میرے حوصلے بڑھا دیئے تھے۔ کیوں کہ میں ماں بننے والی تھی ماں کا دل تو ویسے بھی سمندر ہوتا ہے۔ وہ ہر دکھ سہہ لیتی ہے۔ میرے اندر بھی ہر تکلیف سہنے کی ایک قوت پیدا ہو چکی تھی۔ اب پتہ چلا تھا کہ لوگ لڑکیوں کی پیدائش پر کیوں اداس ہوتے ہیں اور بدنصیبی کیا ہوتی ہے؟ اچانک اس اطلاع نے مجھے دہلا دیا کہ میری ماں، مجھ سے ملنے آئی ہیں۔ وہ میری ماں تھیں۔ مجھ سے ملنے آسکتی تھیں۔ میں بیٹی تھی ان کی مگر جہاں میں کھڑی تھی وہ ذلتوں کی جگہ تھی۔ میں اپنی ماں کو بے عزت ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے میں چاہ رہی تھی کہ میری ماں جلد از جلد اس گھر سے چلی جائیں مگر وہی ہوا، جس کا ڈر تھا مجھے۔ داماد اور ساس کا ٹکراؤ ہوا۔ میرے شوہر نے سلام کے بغیر میری ماں کو ترش لہجے میں کہا ''یہاں کیوں آئی ہو چلی جاؤ یہاں سے۔''

''میں نے بیٹی بیاہی ہے بیچی نہیں ہے۔ میں ملنے آئی ہوں اپنی بیٹی سے'' میری ماں نے بارعب جواب دیا۔

''منہ دیکھنے کی محبت جتاتی ہو۔ شوہر کا سارا پیسہ ہضم کر گئی ہو۔ آئی بیٹی والی۔ بیٹی کو گھر بٹھانا تھا، شادی کیوں کی؟ محترمہ آپ کا حق ختم ہوا میں شوہر ہوں یہاں میرا حکم چلتا ہے۔'' اس نے حقارت سے میری ماں کو دیکھا اور چیخ کر مجھ سے کہا ''دھکے دے کہ نکال دو اسے ورنہ یہاں سے تم بھی دفع ہو جاؤ۔'' تکبر اس کے لہجے اور انداز سے جھلک رہا تھا۔ میری بے بس ماں خون کے گھونٹ پی کر چلی گئی اور میں ضبط سے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی میں اپنی مجبوری پر رو رہی تھی میں کیا کرتی؟ زندگی کبھی کبھی ایسے دوراہے پر لے آتی ہے جہاں اختیارات بے معنی ہو جاتے ہیں انسان چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ میرا چہرہ آنسوؤں میں تر تھا۔ دکھوں نے مجھے نڈھال کر دیا تھا یہاں کھانے پینے کی اجازت نہیں تھی۔ بڑا ناپا تلا کھانا پکتا تھا جو صورتحال ان دنوں میری تھی اس میں بھوک زیادہ لگتی تھی اکثر کئی دن کی بچی روٹیاں مجھے کھانی پڑتی تھیں لیکن میں صبر کر رہی تھی۔

میری ماں بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑی تھیں وہ تنہا تھیں، مجھے ان کی بہت فکر تھی۔ میں نے اپنے دونوں بھائیوں کو بڑا تفصیلی خط لکھا تھا مہینوں گزر گئے کوئی جواب نہیں آیا تھا میں مایوس ہو چکی تھی۔

پھر ایک روز میرے گھر ایک ننھی منی بچی نے جنم لیا۔ کہتے ہیں جب بیٹی خود ماں بنتی ہے تو تب اسے اپنی ماں کی قدر ہوتی ہے میرے ساتھ بھی ایسا معاملہ تھا۔ میں جب باہر نکلی تو میری ماں مصلے پر بیٹھی میرے لیے دعا کر رہی تھی۔ میں نے بڑھ کر اپنی ماں کے ہاتھ تھام لیے انہیں آنکھوں سے لگایا اور چوما۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے تمام تکالیف کا احساس اس وقت ختم ہوا، جب میری بیٹی کو نرس نے میری آغوش میں دیا۔ وہ گلابی گڑیا جس کے چھوٹے چھوٹے سرخ ہونٹ بند تھے وہ اپنی آنکھیں موندے ہوئے تھی، میری طرف آنکھیں کھول کر دیکھا اور مسکرائی میں سرشار ہو گئی جینے کا ایک سہارا میری بیٹی، میری گڑیا مجھے مل گئی میری ماں نے گود سے میری بیٹی کو لیا اور بہت پیار کیا۔ میری ساری مسرت اس وقت کافور ہوئی۔ جب نرس نے مجھے اسپتال کا بل دیا میرا شوہر بغیر بل ادا کیے چلا گیا تھا بیٹی کی پیدائش کی خبر نے اسے بدظن کر دیا تھا۔

وہ قدرت کے فیصلے پر خوش نہیں ہوا میرے دکھوں میں اضافہ ہو چکا تھا مگر میں شاکر تھی۔ میں نے افسردگی سے اس معصوم کو دیکھا اور سوچا کہ اپنی بیٹی کو ایک نظر دیکھ لیتا، تو سب کچھ بھول جاتا۔ میری ماں جو اولاد کی اولاد دیکھ کر سرشار تھیں، اب دکھی نظر آرہی تھیں انہوں نے میرے چہرے پر غم کے سائے دیکھے، وہ بل ادا کر کے مجھے اپنے ساتھ گھر لے آئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ''وہاں تمہیں صدمے ملیں گے۔ ابھی تم کچھ دن میرے ساتھ رہو تم کمزور ہو گئی ہو۔ کھاؤ پیو آرام کرو پھر چلی جانا۔'' مجھے اپنے آرام سے زیادہ اپنی تنہائی کا احساس تھا اس لیے میں نے ان کی بات مان لی۔

موسم اپنے مختلف روپ لیئے آجا رہے تھے لیکن میرے شوہر کا کچھ پتا نہیں تھا بس ایک خط آیا تھا کہ ''میں باہر جا رہا ہوں۔ تمہیں میرے گھر آنے کی ضرورت نہیں۔'' میری ماں کو اس بدلحاظ، بے مروت اور بدتمیز آدمی کی مجھ سے چھٹکارہ پانے کی یہ چال لگ رہی تھی لیکن وہ مطمئن تھیں۔ تعلق جو بوجھ بن جائے اسے ٹوٹ جانا چاہیے میری بھی یہ عقل کہتی تھی۔ ماں تھی۔ اپنی بچی کو زمانے کی خوشیاں دینا چاہتی تھی۔ مگر بے بس تھی۔ میری ماں مجھے دیکھ کر کڑھتی تھیں مگر ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

پھر میری ماں کی ایک دعا قبول ہوئی انہیں اپنے بیٹوں کا دیدار نصیب ہوا جو پاکستان دس سال بعد آئے تھے لیکن اب جیسے انہیں پاکستان سے الرجی سی محسوس ہو رہی تھی اپنی ماں اور بہن سے ملنے کی خوشی کی جگہ بس ان کے چہروں پر بیزاری ہی نظر آرہی تھی۔

وقت کتنی جلدی بدل جاتا ہے۔ میرے بڑے بھائی نے کہا۔ میں اداسی سے مسکرائی ''بھلا وقت کہاں بدلتا ہے بدل تو ہم جاتے ہیں۔ انہیں آئے ہوئے ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ وہ جانے کی بات کرنے لگے

دونوں کے بیوی بچے امریکہ میں ہی تھے وہ تو جائیداد کا بٹوارہ کرنے آئے تھے ان کے آنے کا مقصد جان کر مجھے اور میری ماں کو دکھ ہوا اور جب انہیں اصل صورتحال سے آگاہ کیا گیا تو وہ اپنے مرحوم باپ کو برا بھلا کہنے لگے۔ جس نے ان کے لیے کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے خاموشی میں پناہ لے رکھی تھی میری ماں تو سناٹے میں گھری تھیں۔ کوئی بیٹا بھی ماں کے متعلق نہیں سوچ رہا تھا نہ ساتھ جانے کی بات کر رہا تھا۔ وہ اپنا حصہ مانگ رہے تھے میں سوچ رہی تھی میری ماں کو کیا ملا؟ میری ماں کے یہ بچے، اس کی جان کے روگ بن گئے اور رخصت ہو گئے...... پلکوں پر تارے سجائے میری ماں بے بس اور مجبور کھڑی رہ گئی۔ گزرتے وقت کے ساتھ میں ماں کے لیے امتحان بن گئی۔ خاندان اور برادری کے لوگ میری ماں کو میرے طعنے دینے لگے۔ میری بچی دو سال کی ہو گئی تھی۔ ایک روز میں نے اپنا سامان باندھا اور اپنی ماں سے رخصتی چاہی۔ ''ماں! زندگی کا ایک بڑا غلط فیصلہ ہمیشہ زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ میری شادی ایک بہت بڑا حادثہ تھی میں چور چور ہو گئی ہوں اب بس یہ بچی میرے جینے کا سہارا ہے۔ میں پھر ایک بار سمجھوتا کرنے جا رہی ہوں۔ مجھے آج چاچا کی ایک بات یاد آرہی ہے جو وہ اکثر کہتے تھے۔

''دی مائے جو عکس ہوندی آھی''

(بیٹی ماں کا آئینہ ہوتی ہے)

میری ماں نے مجھے دعاؤں میں رخصت کیا۔ میری توقع کے مطابق میرا شوہر گھر ہی میں تھا۔ جھوٹ میرے شوہر کی شخصیت کا خاصہ تھا اس کا کہنا تھا ''میں دبئی سے کل ہی واپس آیا ہوں'' میں نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا اس نے بچی کو پیار کیا اور ٹی وی دیکھنے لگا۔ رشتوں میں مٹھاس نہ ہو تو رشتے بے معنی ہوتے ہیں۔ ایک بیٹی کا، باپ سے

بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے مگر میری بیٹی کو اپنے باپ سے خوف آتا تھا وہ سہمی سہمی رہتی تھی۔ میں مجبور تھی اس کا باپ بدل نہیں سکتی تھی وہ جیسا بھی تھا۔ آخر ایک کڑوا سچ تھا۔ وہ ہی میری بیٹی کا باپ تھا گزرے وقت سے اسے بھی کچھ سبق تو ملا تھا۔ مرد کے بغیر جہاں عورت مکمل نہیں۔ وہاں مرد کے لیے بیوی بچوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ سو وہ بھی ہمیں تھوڑا بہت سہی، برداشت کر رہا تھا ایسے بے نام رشتوں کے درمیان اپنی دنیا بڑی سرد، اکیلی اور تنہا ہی ہوتی ہے۔

وہ رات کا کوئی آدھا پہر تھا جب میں ڈر گئی۔ مجھے ماں بہت یاد آ رہی تھی دل جیسے کوئی مٹھی میں لے کر دبا رہا تھا۔ میں اس کی وجہ کچھ اور سمجھی۔ میں ایک بار پھر ماں بننے جا رہی تھی صرف اپنی بچی کے لیے۔ اکیلا بچہ دوسرے بچوں میں کھیلتا تم ہے پھر تنہائی اس کی شخصیت میں بعض مسائل پیدا کر دیتی ہے جسے والدین سمجھ نہیں پاتے۔

دوسرے روز صبح سویرے میرے شوہر اچانک مجھے میری امی کے گھر لے آئے میں حیران اور پریشان تھی۔ گھر میں خاندان اور آس پاس لے لوگ جمع تھے میری ماں سفید چادر اوڑھے ہمیشہ کی نیند سو رہی تھی۔ میرا دل پھٹنے لگا میں نے چیخ ماری ”ماں“ اور بے ہوش ہو گئی۔ ایک ماں کا رشتہ ہی غرض سے پاک ہوتا ہے میری ماں مجھے چھوڑ گئی۔ یہ احساس مجھے مارے دے رہا تھا مہینوں میں غم سے نڈھال رہی مجھے ہوش نہیں تھا اسی دوران میرے گھر پھر ننھی منی بچی کی پیدائش ہوئی اس کے چھوٹے سے وجود کو گود میں لے کر بہت روئی ہر فرد مجھے بیٹے کی دعا دے رہا تھا اپنے شوہر کے بدلاؤ کے لیے میں بیٹا ہی چاہتی تھی۔ شاید وہ اپنی اولاد سے پیار کرنے لگے لیکن قدرت کے تو اپنے فیصلے ہوتے ہیں جس کے آگے انسان بے بس ہوتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ہر گھاؤ، ہر زخم بھرتا ہے دکھ، تکلیفیں اٹھا کر بھی ماں مسکراتی ہے میرا ملال پھر سرشاری میں بدل گیا چلو میری بچی کی بہن آ گئی میری بیٹی اپنی پیاری سی بہن پا کر واقعی بہت خوش ہوئی میرے شوہر کے رویے میں ناگواری تھی۔ ایسے مردوں کو قدرت کا یہ اشارہ سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا انہیں بیٹیاں کیوں دے رہا ہے؟ وہ پھر بھی فرعونیت سے باز نہیں آتے لیکن میں اپنے اندر ایک تبدیلی اور محسوس کر رہی تھی اب میں ایک نہیں دو بچیوں کی ماں تھی۔ میں نے ہر معاملہ اللہ کے سپرد کیا، اور خود کو بچیوں کی پرورش میں مصروف کر لیا۔ میں جب بھی ان کے چھوٹے چھوٹے کام کرتی مجھے اپنی ماں بہت یاد آتی میری بچیاں کھیل کھیل میں مجھے ہنساتیں تو مجھے اندر اپنی ماں مسکراتی محسوس ہوتی اگر وہ مجھے رو رو کر راتوں میں جگاتیں تو مجھے اپنی ماں کے رتجگے یاد آتے۔ میں اپنی بچیوں کی کہی اور ان کہی باتیں سمجھتی تھی۔ میری ماں نے بھی اسی طرح مشقت اور محبت سے ہمارا کہا پورا کیا ہوگا۔ کبھی لوری سناتے ہوئے میں اپنی بیٹی کے سر پہ ہاتھ پھیرتی تو سوچتی کبھی ایسی میٹھی نیند میری آنکھوں میں بھی ہوتی ہو گی ماں کی نرم آغوش کیسی پیاری پناہ تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ماں کا رشتہ ممتا سے بھرپور ہوتا ہے مرتے دم تک ایک ہی ماں اپنی اولاد کی خیر خواہی فراموش نہیں کرتی۔

ایک روز وکیل صاحب نے مجھ سے رابطہ کیا اور بتایا کہ ”میری ماں کے پاس جو کچھ بھی تھا انہوں نے وہ سب میرے نام کر دیا تھا۔ ان کی ایک وصیت تھی کہ ”میں اپنی بچیوں کی بہترین تعلیم و تربیت کروں“ ماں کا یہ انوکھا تحفہ مجھے تڑپا گیا۔ میں نے نماز پڑھی اور جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو سب سے پہلے لبوں پر اپنی ماں کے لیے بے شمار دعائیں آ گئیں اور اُن کی مغفرت کی دعا کرتے ہوئے میں بے اختیار رو دی۔

☆☆......☆☆

کچھ اَن کہے جذبے

"سکندر کا جو کچھ بھی تھا، ہمارے پاس حریم کی امانت تھا اور اب جبکہ وہ بالغ ہے، باشعور ہے تو ہم نے پہلے ہی اس کی امانت اس کے نام کر دی۔" "ہمیں آپ کی امانت داری پہ شک نہیں ہے۔ دیکھیں زندگی راحیل اور حریم نے مل کر گزارنی ہے۔ جو کچھ ہمارا ہے، وہ حریم کا......

محبت کی گیرائی لیے، ایک حساس ناولٹ

شام کی خاموشی کو، یہاں چھت پر کھڑا ہو کر، انجوائے کرنا شاید اس کی عادت بن چکی تھی......

وہ خاموشی پسند کرتا تھا تبھی تو تنہائی میں وقت بتانا اس کے مزاج میں شامل ہو گیا تھا......؟ یا واقعی وہ خود پسند ہو گیا تھا؟ وہ اکثر ہی یہ تمام پہلو سوچا کرتا تھا کہ وہ کہاں غلط ہے؟ یا دوسروں کی سوچ اس کے بارے میں غلط ہے؟......

"ہائے کیا سوچا جا رہا ہے؟"

ثانیہ کی آواز نے اس کے ذہن میں الجھتے سوالوں کا تسلسل توڑا تھا۔ وہ قدرے چونک کر مڑا، عام سی نگاہ اس پر ڈالی، پھر واپس اپنی پوزیشن میں کھڑا ہو گیا۔ ثانیہ اس کے برابر آن رکی۔ "اکیلے کیا کر رہے ہیں؟ سب کے ساتھ بیٹھیں، نیچے، سب نے ہنگامہ مچایا ہوا ہے؟"

"مجھے ہنگامہ پسند نہیں ہے۔"

"پھر آپ کو پسند کیا ہے؟"

سوال عام سا تھا، مگر پوچھنے والے کے لہجے میں جو خاص بات تھی اس نے تیمور حیدر کو، رخ موڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔

"تمہیں کیا ضرورت پیش آ گئی جاننے کی؟"

اُس کا انداز کھردرا سا ہو گیا۔

لمحہ بھر کو ثانیہ خاموش رہ گئی۔ پھر جانے کیا سوچ کر ہمت باندھی اور بولی۔

"اکثر ایک سوال ذہن میں آتا ہے، مگر آپ سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ آج پوچھ لوں؟"

اس سے بات کرنے کے لیے واقعی ہمت چاہیے ہوتی تھی۔ بنا دیکھے اس نے سر کو جنبش دی تھی۔ کچھ دیر وہ لب ہلانے کی تگ و دو میں رہی پھر آخر سوال کر ہی ڈالا۔

"آپ کے نزدیک محبت کیا ہے؟" کتنا غیر متوقع سوال تھا۔

مگر اس نے پھر بھی پلٹ کر ثانیہ کو نہیں دیکھا تھا، بس گرل پر ہاتھ دھرے اس کے سوال کو سوچ رہا تھا۔

"کتابوں کی دلیل دوں یا خود کو سامنے رکھ دوں؟"

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ آپ کسی سے محبت کرتے ہیں۔'' ثانیہ نے پھر ہمت کی مگر اس بار بھی فقط خاموشی ملی تھی۔ لیکن تیمور کے لب یکدم بھینچ گئے تھے۔

''خاموشی اکثر اقرار ہوا کرتی ہے۔ کیا میں اس خوش نصیب کا نام جان سکتی ہوں، جسے آپ چاہتے ہیں؟''

ثانیہ کے شوخ لہجے میں جو خوش گمانیاں تھیں وہ انہیں مضبوط نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ثانیہ احمد کی نگاہوں میں جو عکس تھا، اسے گہرا نہیں ہونا چاہیے...... اس نے چند ساعتیں فقط خاموش نگاہوں سے مڑ کر اس کا کھلتا چہرہ دیکھا تھا، پھر اپنی جگہ سے ہٹ کر اس کے سامنے آن رکا۔

''تیمور حیدر ہے اس کا نام''

برفیلا انداز اور پتھروں کی طرح چوٹ دیتے لفظ...... ثانیہ کے مسکراتے لب سکڑ گئے۔

''یونو! مجھے صرف اپنی ذات سے محبت ہے۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے رکا نہیں تھا۔

ثانیہ نے لبالب بھر آنے والی آنکھوں کو بے دردی سے رگڑا تھا۔

''سچ کہتی ہے حریم کہ تیمور حیدر کے سینے میں دل کی جگہ پتھر ہے، وہ سوائے خود کے کسی کو نہیں چاہ سکتا۔''

☆☆......

کمرے کا دروازہ کھولتے ہی سگریٹ کے دھویں نے اس کا استقبال کیا تھا۔

لمحہ بھر میں اُسے علم ہو گیا کہ آج پھر موصوف پر گہری اداسی کا دورہ پڑا ہے۔

وہ کھانستا ہوا صوفے پر بیٹھے تیمور کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ جو اس کی آمد پر، اسی طرح لاتعلق تھا اور مستقل مزاجی سے سگریٹ پھونک رہا تھا۔

عاقب کو اس کی اداسی جاننے کے لیے لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اس کی سرخ ہوتی آنکھیں سب کچھ بتا جاتی تھیں۔

''کیا واقعی ایسا ہے چاچو! کہ میں صرف اپنی ذات سے پیار کرتا ہوں؟'' عاقب کے لب کھولنے سے پہلے ہی وہ بول پڑا تھا۔

''جنہیں صرف خود سے پیار ہو، ان کی آنکھوں میں یوں سرخی نہیں ہوتی، دوسروں کے لیے۔ نہ ہی وہ تمہاری طرح خود کو اذیت دیتے ہیں...... تمہارے تو چہرے پر لکھا ہے کہ تم پاگلوں کی طرح چاہتے ہو اُسے۔''

''صرف آپ کو نظر آتا ہے۔ اُسے تو کبھی نہیں آیا...... ثانیہ احمد کی آنکھوں میں اترا عکس، اس کے دل میں جنم لیتے احساسات پل بھر میں مجھے نظر آگئے۔ میرے دل میں برسوں سے روشن تصویر میری آنکھوں میں مچلتے خواب اسے کیوں نظر نہیں آتے پھر؟''

''اگر اُسے کبھی نظر نہیں آئے، تو تم نے کوشش بھی تو نہیں کی بتانے کی۔'' عاقب نے ہمیشہ ہی اِس بات کے لیے اسے ٹوکا تھا۔

''کیا لگتا ہے آپ کو...... وہ میری بات سن سکتی تھی؟ جسے میری شکل سے وہی چڑ ہے اُسے صرف راحیل......''

''راحیل اب آیا ہے اس کی زندگی میں، تم بچپن سے ساتھ رہے ہو، کبھی کوشش تو کرتے۔''

''خاندان بھر میں اس نے مجھے خود پسند اور گھمنڈی قرار دے دیا ہے۔ نفرت کرتی ہے مجھ سے اور آپ کہتے ہیں کہ میں اسے اپنی فیلنگز بتانے کی کوشش کرتا۔''

''مجھے بھی کوشش کرنے نہیں دی، میں بھابی اور بھیا سے بات کرتا ڈائریکٹ، تمام پرابلم حل ہو جاتی۔

پھر میں دیکھتا کہ راحیل کہاں سے بیچ میں آ جاتا۔"
"اس کی رضا کے بنا اُسے حاصل کرتا، یہ مجھے منظور نہیں۔"
"پھر مرو! گنواؤ! اپنی جان اس دھوئیں میں۔"
عاقب جل کر رہ گیا۔

☆☆

یہ سچ تھا کہ ان کا ساتھ بچپن سے تھا۔ وہ یعنی 'حریم سکندر' اس کی اکلوتی پھوپو کی لاڈلی بیٹی تھی۔ ان کی پھوپو چار بھائیوں کی اکیلی بہن تھیں اور سب کی چہیتی تھیں۔ پھوپو نے اپنی پسند سے اپنے کلاس فیلو سکندر حیات سے شادی کی تھی۔ سب ان کی خوشی میں خوش تھے بہت ساری دعاؤں میں رخصت ہو کر سسرال آئی تھیں، مگر وہ من چاہی بیوی تھیں، من چاہی بہو نہ بن سکیں۔

سکندر حیات نے کچھ عرصہ سب کے رویے دیکھے، پھر علیحدہ ہو گئے۔

وہ بہت اچھی فیملی سے تھے۔ خود ان کی جاب بہت اچھی تھی، سو خوشحال زندگی گزر رہی تھی۔ شادی کے سال بعد 'حریم' نے آ کر جیسے ان کی زندگی مکمل کر دی تھی۔ دونوں بہت خوش تھے کہ یکدم تمام خوشیاں ملیا میٹ ہو گئیں۔ حریم کی چوتھی سالگرہ تھی۔ وہ باہر سیلیبریٹ کر کے لوٹ رہے تھے کہ خوفناک ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گئے۔

پھوپو تو اسی وقت خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ حریم ان کی گود میں تھی مگر معجزاتی طور پر وہ بچ گئی، کچھ چوٹیں آئیں تھیں۔ سکندر حیات مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی ٹانگیں اور ریڑھ کی ہڈی شدید متاثر ہوئی تھیں۔ ان کے گھر والے انہیں اپنے گھر لے تو گئے مگر اب وہ محض ان کے لیے ایک بوجھ تھے۔

حریم، معصوم جان ایک تو ویسے ہی ماں کی جدائی سے بے حال تھی۔ دوسرا، دادی، تائی اور چچیاں اس معصوم کو کرم جلی، منحوس اور جانے کن کن القابات سے مخاطب کرتیں، جن کا اس بچی کو معنی و مفہوم تک پتا نہ تھا۔

سکندر حیات اپنی تکلیف تو برداشت کر رہے تھے مگر پھول سی بچی کے ساتھ یہ سلوک ہر لمحے انہیں رلائے رکھتا۔

حریم کے بڑے ماموں اور مامی، عیادت کے لیے آئے تو یہ دیکھ کر ان کے کلیجے پر دھموکہ سا لگا جب تائی نے معصوم بچی کے چہرے پر ایسا تھپڑ مارا کہ پھول سا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مامی کی آنکھیں برس پڑیں۔

انہوں نے سکندر صاحب سے اجازت لی کہ وہ حریم کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ تو خود ان سے یہی کہنا چاہ رہے تھے۔ انہوں نے تشکر سے انہیں دیکھا کہ ان کی سب سے بڑی مشکل حل ہو گئی تھی۔ حریم کی فکر تو انہیں سکون سے مرنے بھی نہ دیتی مگر اب وہ ایسے بے فکر ہوئے کہ ایک ہفتہ ہی جی سکے۔

حریم نہیال میں سب کی لاڈلی بن گئی جیسے کبھی اس کی مما ہوا کرتی تھیں، چاروں ماموں اسے بے حد چاہتے تھے اور نانی کی تو وہ جان تھی۔

وہ شروع سے ہی بڑے ماموں کے پاس رہتی تھی جنہوں نے اپنے بچوں سے بڑھ کر اس کی پرورش کی، اسے محبت دی، اس کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کی۔ آج وہ چار سال سے بیس سال کی ہو چکی تھی، مگر اس کے ددھیال سے کسی نے پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی۔

تیمور اس کے بڑے ماموں کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس سے پانچ سال بڑا۔ ان کا بچپن ساتھ گزرا۔ وہ ہمیشہ حریم کو کانچ کی گڑیا کی طرح سنبھال کر رکھتا تھا۔ بچپن میں کبھی ان کی نہیں بگڑی، مگر جیسے جیسے حریم

بڑی ہوئی، اتنی محبتیں اتنی توجہ ملی تو اسے تیمور کی یہ عادت بُری لگنے لگی۔ وہ اسے یوں رکھتا جیسے وہ گر کر ٹوٹ جائے گی۔ وہ چاہتا تھا حریم صرف اس کی نگاہوں کے سامنے رہے۔ وہ حریم کو ہر چیز پر ٹوکتا، بس یہیں سے ان کی بگڑ گئی۔ تیمور کی اس سے محبت والہانہ تھی، مگر حریم سمجھ نہ سکی۔ یوں ہر گزرتے دن میں ان کے درمیان جھگڑے ہونے لگے۔ تیمور کے مزاج کے حوالے سے حریم نے اسے مغرور، خود پسند اور گھمنڈی جیسے القاب دے ڈے اور تیمور اندر ہی اندر کڑھتا، مزید تنہا ہوتا چلا گیا۔

اصل جھگڑا تب شروع ہوا جب راحیل (جو کہ حریم سکندر کا تایا زاد تھا) نے حریم کے گھر میں 'انٹری' دی۔

سولہ سال جس لڑکی کی خبر تک نہ لی تھی کسی نے، اب اچانک اس کے ددھیال میں اس کی محبت کیسے پھوٹ پڑی تھی؟ اور وہ کم فہم لڑکی، سولہ سال کی تمام چاہتوں، تمام محبتوں کو جیسے فراموش کر بیٹھی۔

راحیل کا آنا ہوا تو دھیرے دھیرے تایا، چچا، دادی، سب کو ہی حریم کی محبت کھینچ لائی۔ چاہتے تو حیدر صدیقی، انہیں یاد دلا سکتے تھے کہ یہ وہی بچی ہے جو منحوس تھی، مگر وہ حریم کے ذہن کو خراب نہیں کرنا چاہتے تھے، سو انہوں نے ملنے سے قطعی منع نہیں کیا تھا۔

☆☆

''امی میں نے راحیل سے کہہ دیا ہے کہ وہ یہاں نہ آیا کرے۔'' ممانی کو وہ امی کہتی تھی۔

''کیوں بچے؟''

''ضروری ہے کہ وہ یہاں آکر اپنی انسلٹ کرائے؟'' اس کے لہجے میں غصہ تھا، عاقب کے ساتھ بیٹھا تیمور جان گیا تھا کہ توپوں کا رخ کس طرف ہے۔

''کون سی انسلٹ ہوگئی اس کی یہاں بھانجی!''

عاقب خوب سمجھتا تھا سو تیمور سے پہلے بول پڑا۔

''تیمور کو دیکھا ہے آپ نے اس کی پیشانی کے بل نہیں جاتے، جب تک وہ رہتا ہے، اور کل تو اس نے انسلٹ بھی کی ہے اس کی۔''

''کیا؟'' وہ تڑپ کر بولا۔

''میں نے صرف اتنا کہا کہ راحیل! حریم کے علاوہ بھی سب ہوتے ہیں سب کے ساتھ بیٹھا کرو۔ اچھا نہیں لگتا کہ وہ بغیر دستک، اس کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔'' تیمور امی کی طرف دیکھ کر وضاحت کر رہا تھا۔ بات اس کی صد فیصد درست تھی، مگر حریم کے سامنے کہہ کر بات بگاڑنے والی ہو جاتی کہ وہ صرف اپنی مرضی کرتی تھی۔

''ان فیکٹ! آپ کی سوچ ہی غلط ہے۔ وہ میرا کزن ہے، اس گھر میں مجھ سے ملنے کے لیے آتا ہے۔''

''حریم تم سمجھنا نہیں چاہتی ہو۔ یا شاید میری ہر بات کی مخالفت کرنا تمہیں اچھا لگتا ہے۔'' وہ تلخ ہوا۔

''تیمور' دھیرج رکھو بیٹا! نادان ہے وہ، آرام سے پیار سے سمجھاؤ گے تو تمہاری بات اسے سمجھ میں آجائے گی۔'' امی نے ہمیشہ کی طرح اسے ٹوکا۔

''میرا پیار اِسے سمجھ کب آتا ہے۔'' وہ منہ میں ہی بڑبڑایا تھا۔ ''اِسے بھی ٹوک دیا کریں بچی نہیں ہے اب یہ۔ ایک کزن کا رشتہ اس قدر اہم ہوگیا اس کے لیے، کہ باقی لوگوں کی بات کی ویلیو نہیں رہی اس کے نزدیک......؟''

''الحمدللہ! میرے لیے تمام رشتے اور محبتیں اہم ہیں۔ سب سے پیار ہے مجھے۔ آپ کی طرح صرف اپنی ذات سے محبت نہیں ہے مجھے۔'' وہ رٹا ہوا جملہ تیمور کا دل جلا گیا۔

اس نے عاقب کو دیکھا جو اس کے اندر کا حال

سمجھ سکتا تھا مگر خاموشی سے اٹھ گیا۔

''حریم بچے! تیمور تم سے بڑا ہے ناں۔ ایسے بات نہیں کرتے۔ وہ آپ کی بھلائی کے لیے کہتا ہے۔ آپ کے خیال، آپ کی محبت میں آپ کو منع کرتا ہے۔'' عاقب نے اسے نرم انداز میں سمجھانا چاہا۔

''محبت اور تیمور؟؟ دو الگ کنارے ہیں ماموں۔''

اِس کی بات پر تاسف سے وہ بھانجی کو دیکھ کر رہ گیا۔ ایک تیمور تھا جو زندگی کا اِک اِک لمحہ، اس کی محبت میں گھل رہا تھا۔

☆☆......

''اُسے اپنے کزن کی انسلٹ کی فکر ہے، ابو کا اترا چہرہ نظر نہیں آتا اور امی کو جو چپ لگ گئی ہے وہ دکھائی نہیں دیتی۔''

تیمور ہر وقت کڑھتا رہتا تھا اور سچ تو یہ تھا آج کل گھر میں ہر شخص پریشان تھا۔ کیوں کہ حریم ایسے بدل جائے گی یہ امید کسی کو نہ تھی۔

''بڑے بھیا بہت اپ سیٹ ہیں تیمور!''

''ہاں تو میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ اس کی وجہ سے ابو دوہری پریشانی میں بتلا ہیں۔ اس کی خوشی دیکھتے ہیں تو...... تمام وقت ہر دکھ سکھ میں ساتھ دینے والے بھائی ناراض اور اگر انہیں منائیں تو محترمہ ہرٹ ہوں گی۔'' آج اسے حریم پر صرف غصہ آرہا تھا۔ کیوں کہ بات صرف اس کی ذات سے وابستہ نہیں تھی، پورے گھر سے جڑی ہوئی تھی۔ اس کے چھوٹے تینوں بہن بھائی، حریم سے نالاں تھے۔ سارے کزنز حیران تھے۔ لیکن جانے حریم کو صرف راحیل ہی کیوں نظر آتا تھا آج کل۔

''تیمور اگر تم چاہو تو یہ ساری پرابلم ختم ہوسکتی ہے۔'' عاقب کا انداز ذومعنی تھا۔

''کیسے......؟؟''

''اب بھی وقت ہے یار۔ میں بھابی اور بھیا سے بات کر لیتا ہوں۔ حریم ان کی بات نہیں ٹالتی۔''

''رشتے احساس سے بنتے ہیں چاچو! دل میں احساس ہو تو شاید لفظ بے معنی ہو جائیں، کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑے جو ہم چاہتے ہوں۔ حریم کے دل وہ احساس نہیں ہے اور ایسا رشتہ، جس میں احساس نہ ہو، مجھے منظور نہیں ہے۔''

''تم بھی ضدی ہو یار......''

''یار آپ بھی مجھے نہیں سمجھ رہے، حالاں کہ یو نو ویری ویل میں ضدی نہیں ہوں۔''

''پھر آخر تم چاہتے کیا ہو؟'' عاقب نے عاجز ہو کر کہا۔

''حریم کی خوشی۔'' اِس کے لب دھیرے سے ہلے۔

''مگر چاچو جو رشتہ اس نے چنا ہے وہ دیکھنے میں سیدھا ہے، مگر آسان نہیں ہے۔''

''میری سمجھ میں تمہاری فلاسفی نہیں آرہی ہے۔''

''میری سمجھ آج کل مجھے خود بھی نہیں آرہی ہے۔ وہ لڑکی جو بچپن سے میرے دل کی مکین ہے، مجھے خود سے زیادہ اس سے محبت ہے، اور اِن دنوں مجھے سب سے زیادہ غصہ بھی اسی پر آتا ہے...... وہ مجھے ہرٹ کرتی تھی میں سہہ لیتا تھا مگر اِس وقت اُس کی وجہ سے میرے والدین، میرے بہن بھائی، میری پوری فیملی تکلیف میں ہے۔''

''کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے، میں اسے جھنجھوڑوں کہ کہاں گئی وہ محبت جس کے دعوے وہ کرتی ہے کہ اسے ہر رشتے سے پیار ہے۔ تمام محبتیں اہم ہیں اس کے لیے تو پھر اب صرف ایک شخص کی وجہ سے......؟''

وہ لب بھینچ کر خاموش ہوگیا۔ عاقب نے اس

کے سر پر ہاتھ رکھا۔

تیمور غلط نہیں تھا بلکہ حریم غلطی پر تھی۔ اس نے واقعی گھر کا ماحول یکدم ٹینس کر دیا تھا۔ عاقب دل میں سوچ رہا تھا کہ حریم کو کیسے سمجھایا جائے؟؟؟

☆☆.............

اُسے اپنی زندگی اِن دنوں اُس خزاں رسیدہ پتے کی مانند لگ رہی تھی جسے ڈر ہو کہ ہوا کے تیز جھونکے سے وہ شاخ سے ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔

حریم جس قدر خوش تھی، تیمور کا دل اتنا ہی اداس تھا اور یہ اداسی اُسے گھر کے ہر فرد کی آنکھوں میں نظر آ رہی تھی۔ عاقب چاچو نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ حسبِ توقع بُرا مان گئی۔

''غلطی انسان ہی کرتے ہیں ماموں! میں مانتی ہوں کہ انہوں نے غلط کیا مما کے ساتھ اور میرے ساتھ بھی لیکن اب وہ شرمندہ ہیں اور غلطی کو سدھارنا چاہتے ہیں تو آپ کو نہیں لگتا کہ انہیں ایک موقع دینا چاہیے؟''

''یہ ٹھیک ہے مانو! (پیار سے اکثر سب اسے مانو کہتے تھے) لیکن ان کا ضرورت سے زیادہ تمہاری طرف متوجہ ہونا۔ او کے! چلو مانا کہ وہ شرمندہ ہیں۔ تو کیا اِن سولہ سالوں میں انہیں اب احساس ہوا کہ وہ غلط تھے......؟''

''راحیل نے انہیں یہ احساس دلایا ہے کہ وہ غلط تھے۔ وہ بابا سے بہت محبت کرتا تھا۔ جب یہ سب ہوا وہ بچہ تھا، مگر اب وہ باشعور ہے اپنی بات سب کو سمجھا سکتا ہے۔''

عاقب اس کی صورت دیکھتا رہ گیا...... شاید تیمور صحیح کہتا ہے کہ اِس وقت حریم کو سمجھانا بے سود ہے۔

حریم ان لوگوں میں سے تھی، جو ٹھوکر کھائے بنا نہیں سمجھ سکتے۔ عاقب تو دل سے چاہتا تھا کہ اس کی بھانجی کو ٹھوکر نہ لگے، اسے کوئی دکھ نہ ملے۔

مگر شاید بھانجی کو اِن دنوں ان کی باتیں بُری لگ رہی تھیں اس لیے وہ چپ چاپ اٹھ گیا۔

تیمور اکثر لیٹ آتا تھا۔ یوں بھی آج کل کسی اہم کیس میں الجھا ہوا تھا وہ۔ مگر رات میں چاچو کے ساتھ واک پر جانا، ہرگز نہ بھولتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ حریم کے جواب نے چاچو کو ہرٹ کیا ہے۔ وہ کئی دن خاموش رہے۔ مگر آج رات کو عشاء کے بعد جب وہ باہر واک کے لیے گئے تو چاچو ضرورت سے زیادہ چپ اور غائب دماغ سے تھے۔

''اپنی پرابلم! آج تو حد ہی کر دی یار! آپ نے، میرے ساتھ ہو کر بھی کہیں اور ہیں۔'' عاقب چلتے چلتے رک گیا۔ تیمور کا چہرہ دیکھا تو جانے کیوں لب کچل گیا۔

''خیر تو ہے؟ ہونے والی چاچی سے جھگڑا ہوا ہے؟'' عاقب نے نفی میں سر ہلایا اور پھر قدم اٹھانے لگا۔ ''آج گرمی بھی شدت کی تھی۔''

''ہوں۔'' عاقب نے پھر یوں ہی جواب دیا، تو وہ کچھ اکھڑ گیا۔

''چھوڑیں یار گھر واپس چلتے ہیں۔ اگر موڈ نہیں تھا تو مت آتے۔ ایسے خاک مزہ آ رہا ہے۔ میں بات کیے جا رہا ہوں اور آپ کی توجہ ہی نہیں ہے۔ ہم ہر بات شیئر کر لیتے ہیں اور آپ اپنی الجھن بھی چھپا رہے ہیں۔'' عاقب کو اندازہ ہو گیا کہ وہ بُرا مان گیا ہے۔

''نہیں پتا ہے آج راحیل کے پیرنٹس آئے تھے۔''

''پہلی بار تو نہیں آئے۔'' اس نے سر جھٹکا۔

''مگر حریم کا رشتہ لے کر پہلی بار ہی آئے تھے آج۔''

حالاں کہ اسے اندازہ تھا ایسا ہونا ہے مگر پھر بھی

جانے کیوں یکدم رک گیا، خالی سی نظروں سے چاچو کو دیکھا۔

''پھر؟''

وہ دونوں ہی تھکن محسوس کرنے لگے تھے۔ سو چلتے چلتے رک گئے اور قریبی بینچ پر بیٹھ گئے۔

''بھیا بہت ٹینشن میں آ گئے ہیں کیوں کہ وہ حریم کے چہرے اور آنکھوں میں چمکتی خوشی دیکھ چکے ہیں۔''

''پھر تو ٹینشن ہی ختم۔''

اس نے جیسے خود سے ہی فیصلہ کر دیا۔ بہت دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

''گھر چلیں......؟''

''ہاں چلو۔'' عاقب اٹھ گیا۔

''ایک بار حریم سے بات کروں۔''

''بے سود ہے۔'' تیمور نے خالی لہجے میں کہہ کر گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

☆......☆......☆

''حریم بچے! تم خوش ہو؟ دیکھو بچے! ہم تمہاری رضا اور خوشی کے بنا کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر تم اس رشتے سے خوش ہو تو......؟''

''امی......آپ خوش نہیں ہیں؟''

کتنا مشکل سوال تھا ناں۔ کتنے لمحے وہ گنگ سی رہ گئیں کہ کیا کہیں۔

''ہمارے لیے تمہاری خوشی ہی سب کچھ ہے۔ تم خوش ہم خوش۔''

''میں نے ہر فیصلے کا اختیار آپ کو دیا ہے۔ مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہوگا۔'' اس نے بہت احترام سے کہا تھا۔

''اور اگر ہم انکار کر دیں تو......؟''

عاقب ماموں نے اچانک ہی آ کر کہا تو وہ شاک سی رہ گئی۔ امی نے پل بھر میں اس کے چہرے پر آنے والے تاریک سائے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

''نہیں نہیں مانو!''

انہوں نے دیور کو سرزنش کی آنکھوں سے۔ پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''ہم وہ ہی کریں گے جو تم چاہو گی۔'' اور وہ کیا چاہتی تھی یہ کون نہیں جانتا تھا......سو فیصلہ ہو چکا۔

اگرچہ حیدر صاحب کے دونوں بھائی اس رشتے سے ناخوش تھے مگر انہوں نے پھر بھی انہیں قائل کر لیا۔ رہا عاقب تو وہ تو ان کے ساتھ ہی تھا، تمام صورت حال سے واقف تھا۔

راحل کے گھر والوں کو 'ہاں' کر دی گئی تھی۔

''نانو'' آپ کی طبیعت ٹھیک ہے آج اداس ہیں آپ۔''

چلو اُسے کسی کی اداسی تو نظر آئی۔ تیمور جو اتفاقاً آج جلدی آ گیا تھا اور سب کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''نہیں میری بچی میں ٹھیک ہوں۔ تو آج بہت خوش ہے ناں اسی لیے مجھے......''

جانے کیوں ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

''کاش تیری مما ہوتیں آج۔''

''دادو پلیز۔''

تیمور سے چھوٹا شہرام دادی کے پاس آ بیٹھا۔

''آپ پلیز۔ ہر وقت نہ سوچا کریں۔ ہم سب اللہ کی رضا کے آگے بے بس ہیں۔''

''کیا ہوا اماں؟''

حیدر مغرب کی نماز ادا کر کے آئے تھے۔ شہرام کو دادی کے آنسو صاف کرتے دیکھا تو فکرمندی سے پوچھنے لگے۔

''نہیں بیٹا بس ایسے ہی آج دل اداس سا ہے۔''

"اللہ کرم کرے گا اماں۔ آپ حریم کے لیے دعا کیا کریں، اللہ پاک اسے خوش رکھے۔"

وہ جیسے ان کی اداسی کی وجہ سمجھ گئے تھے۔ ماں کو تسلی دے کر وہ تیمور کے ساتھ آ بیٹھے۔ جو وہاں موجود ضرور تھا مگر اس کی توجہ صرف اس کے موبائل پر تھی۔

"ہاں میاں ایک کام کہا تھا آپ سے، ہوا؟" وہ ابو کی آواز پر چونک گیا۔

"جی ابو، ہو گیا۔"

اس نے موبائل جلدی سے شرٹ کی پاکٹ میں رکھا تھا۔ انہیں جواب دے کر وہ اپنے کمرے میں گیا اور فائل لا کر انہیں تھما دی۔

ابو نے خاموشی سے پہلے فائل خود دیکھی تھی۔ پھر انہوں نے حریم کو اپنے پاس بلایا۔

"حریم بچے! یہ تمہاری امانت ہے۔ آپ ماشاء اللہ اب بیس برس کی ہو چکی ہو۔ سو اب میری ذمہ داری ختم۔" وہ ہونق سی ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"ماموں یہ کیا ہے؟" اس نے فائل کھول کر نہیں دیکھی تھی۔

"جب آپ کے بابا اِس دنیا سے رخصت ہوئے، آپ بہت چھوٹی تھیں۔ سو انہوں نے اپنے گھر اور دکانوں کا جو آپ کے نام تھیں، مجھے نگراں بنایا تھا، جب تک کہ آپ باشعور نہ ہوں۔

اب الحمدللہ آپ باشعور ہیں، سو میں نے یہ کاغذات مکمل کرا دیے ہیں اور آپ کی امانت آپ کو سونپ دی۔"

"مگر ماموں! میں ان کا کیا کروں؟ آپ پلیز! اپنے پاس رکھیے یہ سب۔ آپ نے میری پرورش کی۔ میری اتنی اچھی تربیت کی، سب کچھ دیا آپ نے مجھے، جو کہ میرے پیرنٹس دے سکتے تھے۔ میرا خیال ہے یہ سب آپ کا حق ہے۔"

"محترمہ حریم سکندر حیات! شاید آپ کو قانون سے ذرا بھی واقفیت نہیں۔ یہ آپ کا حق ہے۔ ہمارے پاس یہ صرف امانت تھی اور یوں بھی ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آپ کا حق ہے، آپ وارث ہیں اس کی۔" اس نے لہجے کو بے حد نرم رکھنا چاہا تھا۔

"آپ کو صرف قانون کا علم ہے، جذبات و احساسات سے ناواقف ہیں آپ، میری خوشی ہے کہ یہ ماموں رکھیں۔"

"حریم ایسا نہیں ہو سکتا بچے! تیمور ٹھیک کہتا ہے اور بیٹا الحمدللہ ہمیں ضرورت کیا ہے؟ رب نے اتنا تو نوازا ہے ہمیں۔" انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

حالاں کہ وہ جانتی تھی کہ ماموں اس سال ریٹائر ہو جائیں گے۔ گھر میں صرف ماموں اور تیمور (وہ بھی اسی سال برسر روزگار ہوا تھا) ہیں جن پر گھر کی ذمہ داری ہے۔ باقی سب ابھی پڑھ رہے ہیں۔ عاقب ماموں کی ساری انکم وہ علیحدہ رکھتے ہیں تاکہ ان کی شادی سے پہلے ہی ان کے لیے علیحدہ گھر بنوا سکیں، باقی دونوں ماموں کی طرح۔

"اگر عائشہ آپ سے یہ کہتی تب بھی آپ منع کرتے؟"

"بے شک کیوں کہ یہ میرا حق نہیں ہے، امانت ہے آپ کی اور مجھے اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔ آپ بچے نا سمجھ ہیں ابھی۔" وہ چپ سی ہو گئی۔

چھوٹی سی تقریب میں اس کی اور راحل کی منگنی کر دی گئی۔ شادی دو ماہ بعد طے پائی تھی۔

فی الحال حیدر صاحب اِس حق میں نہ تھے مگر دوسری طرف جلدی تھی شاید۔ تب انہیں ماننا پڑا اور دو ماہ کا ٹائم لے لیا۔

عاقب انگیجڈ تھے او ان کا خیال تھا حریم کے

ساتھ ساتھ عاقب کا فرض بھی ادا کردیں۔ سوانہوں نے عاقب سے بات کی کہ وہ گھر کی تعمیر شروع کرادیں۔

''میرے لیے اِس گھر میں جگہ تنگ پڑگئی ہے بھابی۔ آپ بھائی کو بتا دیجیے گا کہ مجھے علیحدہ نہیں رہنا۔ ہاں اگر آپ لوگ مجھ سے تنگ ہیں تو بتادیں۔'' بھائی کے سامنے بولنے کی ہمت تھی نہیں سو بھابی کو بتادیا۔

''ایسا نہیں ہے عاقب کل کو اگر تمہاری وائف۔''

''ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔ انشاءاللہ۔''

عاقب کو اندازہ تھا اِس وقت حالات کیسے ہیں اگر گھر بنوائیں گے تو حریم کی شادی کے لیے کثیر رقم کی ضرورت تھی اور بھیا کہاں سے کرتے؟'' سواس نے بھابی سے کہہ کر بات ختم کردی۔

☆☆........

دو ماہ تھے اور تیاریاں زیادہ تھیں۔ امی فکر مند تو تھیں مگر اپنے شوہر کی وجہ سے چپ تھیں کہ وہ پہلے ہی بہت فکر مند تھے۔

پہلے اپنی خوشی میں اس نے شاید غور نہیں کیا تھا، مگر اب وہ غور کررہی تھی کہ سب کے رویے میں ایک احتیاط آگئی ہے۔ شہرام، عائشہ دوسرے ماموں کے سمیر، امبر، حارث سب ہی مصروف رہنے لگے ہیں، پہلے کی طرح نہ اکٹھے ہوتے ہیں نہ ہلا گلا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ تو سب نے بات کرنا بہت کم کردیا تھا۔ عائشہ اور شہرام تو پھر بھی بات کرلیتے تھے مگر ثانیہ، سمیر اور باقی سب تو آتے ہی کم تھے اب اِس طرف۔

امی بھی ہر وقت الجھی الجھی رہتی تھیں۔ عاقب ماموں اور تیمور کی تو دنیا ہی الگ تھی۔ وہ دونوں مغرب کے بعد آتے، کھانا کھا کر پھر واک کے لیے ایسے جاتے کہ گیارہ بجے ہی لوٹتے تھے۔

کہیں راحیل کی وجہ سے!!؟؟

شروع شروع میں سب کزنز نے ری ایکٹ کیا تھا کہ وہ صرف راحیل پر ہی توجہ دیتی ہے، ہمیں بھول گئی وغیرہ وغیرہ مگر پھر انہوں نے کہنا ہی چھوڑ دیا۔ یا شاید وہ اس قدر دور ہوگئی سب سے کہ صرف راحیل ہی اسے سب کچھ لگنے لگا......

منگنی کے بعد نانو نے اسے آنے سے منع کردیا تھا اب ان کا رابطہ فون پر تھا۔ بلکہ سارا دن ہی وہ چیٹ کرتے رہتے تھے۔

دن تیزی سے گزرنے لگے تھے۔

دو دو شادیاں تھیں۔ عاقب کی ڈیٹ فکس ہوئی تو ابو نے حریم کی ڈیٹ بھی فکس کردی۔ آج راحیل کے والدین اسی سلسلے میں آئے تھے۔ ان کے آنے کی وجہ کیا تھی جب یہ سب کو علم ہوا تو یکدم جیسے سب سناٹے میں آگئے تھے۔

تیمور کو تو بہت پہلے ہی خدشہ تھا اور اس کا ذکر وہ چاچو سے بھی کرچکا تھا۔ اس وقت چاچو نے بھی اس کی بات کو سیریس نہیں لیا تھا۔

''کشش خون کی نہیں ہے چاچو، یہ کشش اس گھر کی ہے جو سکندر انکل کا ہے اور وہ حریم کے نام ہے۔''

''تم بھی ناں، ہر چیز کو وکیل کی نظر سے دیکھتے ہو یار! ایک گھر چار، دکانیں اور بس جبکہ ان کے بڑے بھائیوں کی کروڑوں کی پراپرٹی ہے۔''

''جس کے پاس جتنا زیادہ ہوتا ہے، لالچ بھی اتنا ہی بڑھ جاتا ہے۔ سولہ سال بعد حریم میں کیا کشش نظر آئی اُن لوگوں کو......؟''

''اتنا نیگیٹیو نہ سوچو۔'' عاقب نے کہا تھا مگر اِس وقت وہ تیمور کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔

''سکندر کا جو کچھ بھی تھا، ہمارے پاس حریم کی امانت تھا اور اب جبکہ وہ بالغ ہے باشعور ہے تو ہم

نے پہلے ہی اس کی امانت اس کے نام کر دی۔''
''ہمیں آپ کی امانت داری پہ شک نہیں ہے۔ دیکھیں زندگی راحیل اور حریم نے مل کر گزارنی ہے۔ جو کچھ ہمارا ہے، وہ حریم کا ہے اور حریم کا جو بھی ہے اس پر راحیل کا حق ہے۔ یہ رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے مل کر زندگی کے ہر معاملے میں چلنا پڑتا ہے۔''
''صحیح کہا آپ نے۔ اِسی لیے تو ہم چاہتے ہیں کہ شادی سے پہلے وہ گھر اور دکانیں راحیل کے نام ہو جائیں۔ رہے گا تو سب کچھ حریم کا ہی مگر خاندان برادری میں شہرت بڑھ جائے گی۔''
''ایسا ممکن نہیں ہے۔ جو کچھ حریم کا ہے وہ حریم کے نام ہی رہے گا۔''
وہ شاید وکیل تھا اسی لیے عادت سے مجبور ہو کر بول پڑا تھا۔ ابو نے فوراً اسے سرزنش کی تھی۔
''حریم ہمارا خون ہے۔ کیا آپ کو ہم پر اعتبار نہیں ہے؟ ہمارے پاس الحمدللہ سب کچھ ہے، بس بات خاندان میں ہماری ناک کی ہے کہ جس گھر میں راحیل اور حریم نے رہنا ہے وہ اس کی بیوی کے نام ہے۔''
''ہزاروں ایسے گھر میں جو خاتون خانہ کے نام ہیں کیا وہ بھی جھگڑے شروع کر دیں، اور پھر ہمیں حریم کی سیفٹی چاہیے۔ کیوں کہ پہلے ہماری پھوپھو بھی آپ کے خراب رویے کا شکار رہی تھیں۔''
''حیدر بھائی یہ پرانی باتیں ہیں ہم اپنے کیے پر شرمندہ ہیں اس کا اظہار ہم کر چکے ہیں۔'' انہوں نے ابو کو مخاطب کیا تھا۔
ابو اور عاقب چاچو نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔
''میں معذرت چاہتا ہوں۔'' ابو نے نرم لہجے میں کہا تھا۔
''حریم اگر چاہے گی تو ہم آپ کی یہ شرط ماننے کو تیار ہیں۔ ہمیں ایک دو دن دیں تاکہ ہم بچی سے بات کر سکیں۔'' سہولت سے بات کی تھی ابو نے۔
وہ لوگ خوش تو نہیں تھے مگر خاموش ہو گئے۔ گھر میں اب ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔
باقی سب کا خیال تھا کہ جو حریم چاہے گی وہ ہی ہو گا جبکہ وہ سب کے خلاف ایک ہی بات پر اڑ رہا تھا کہ ایسا نہیں ہو گا۔
''ہم کیسے منع کریں گے اگر حریم نے مان لیا تو؟''
''اسے سمجھایے کہ وہ خود اپنے گلے میں پھندہ ڈال رہی ہے۔''
''وہ ان کی اولاد ہے، قانوناً بھی ہم کچھ نہیں کر سکتے۔''
''ابو اگر وہ قابل اعتبار ہوتے تو سولہ سال پہلے سکندر انکل آپ کو یہ ذمہ داری نہ دیتے۔ وہ سب کچھ انہیں سونپ دیتے۔ پلیز سمجھنے کی کوشش کریں۔ حریم کی ضد کی خاطر اس کی ساری زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتے ہم۔'' وہ اٹھ گیا اس بار اس کا ارادہ ڈائریکٹ حریم سے بات کرنے کا تھا۔
''تم نادان نہیں ہو باشعور ہو۔ پلیز فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا۔''
''آپ کو لگتا ہے کہ راحیل لالچی ہے اور وہ صرف اس گھر اور دکانوں کے لیے شادی کر رہا ہے مجھ سے؟''
''اگر ایسا نہیں ہے تو اپنے گھر والوں کو سمجھا سکتا ہے وہ۔ لگ حریم ہم ایک بار چوٹ کھا چکے ہیں۔ پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔ بے شک سب کچھ تمہارا ہے، مگر ہمیں اپنی تسلی اور تمہاری سیفٹی دیکھنی ہے۔ ہم آزمائے ہوئے پر دوبارہ اعتبار کیسے کریں؟ ابو تم سے کبھی یہ نہیں کہیں گے۔ جو تم چاہو گی وہ صرف وہ مانیں گے، مگر پلیز اگر تمہارے دل میں ہم سب کے

لیے محبت اور احساس ہے تو سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا پلیز۔''

''آپ وہم کا شکار ہیں۔ مجھے راحیل پر بھروسہ ہے میں اس سے بات کرلوں گی، وہ بھی ہرگز ایسا نہیں چاہتا ہوگا۔'' اس کے لہجے میں مان تھا۔

''اوکے، آل دی بیسٹ۔'' وہ اٹھ گیا۔

حریم کو تیمور کی بات بُری نہیں لگی تھی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ ماموں اور نانو، اس کے لیے فکر مند ہیں۔ مگر اسے اپنی محبت اور راحیل پر یقین تھا۔

لیکن یہ مان، یہ یقین لمحہ بھر میں چکنا چور ہوا تھا، جب اس نے راحیل کو فون کیا۔

''اگر میرے گھر والے میری محبت میں ایسا چاہتے ہیں تو تم تایا جی کو منا سکتے ہو۔ آخر کار ہم دونوں کا ہی ہے جو کچھ بھی ہے۔''

''مجھے بھی ضرورت نہیں ہے اس کی۔ لیکن اگر امی اور ابو چاہ رہے ہیں تو تم اپنے ماموں سے بات کرلو۔''

''راحیل وہ منع نہیں کریں گے۔''

''وہ مانیں گے بھی نہیں کیوں کہ وہ خود نظریں لگائے بیٹھے ہیں۔ ایسے بنا لالچ کے کسی کی اولاد کون پالتا ہے ابھی تو تمہیں کیش کرنے کا وقت آیا ہے، ان کا۔''

''راحیل پلیز! جسٹ شٹ اپ! میرے ماموں کے بارے میں ایک لفظ بھی غلط نہ کہنا۔ وہ قطعی ایسے نہیں ہیں۔''

''اچھا۔ پھر انہوں نے کیوں منع کیا؟ ان کا بیٹا وکیل ہے اور وہ با آسانی تم سے سب چھین سکتے ہیں۔''

''وہ سب کچھ میرے نام کر چکے ہیں۔ فائل میرے کمرے میں پڑی ہے۔ میں چاہوں تو ابھی تمہارے منہ پر مار سکتی ہوں وہ۔ مگر نہیں۔''

''اوکے پھر سوچ لو۔ یا اپنے ماموں کو چن لو یا اپنی محبت کو۔'' راحیل نے دھمکی کے بعد فون بند کردیا۔

''سوچنا کیا؟؟ میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔''

............☆☆............

''کیا؟؟؟''

شاید کسی کو بھی توقع نہ تھی۔ نانی اماں پہلے بے چینی سے اُسے دیکھنے لگیں۔ مگر جب اس کی کٹورہ سی آنکھوں سے ٹپ ٹپ پانی بہنے لگا تو وہ بے چین ہوگئیں۔

''کوئی بات بھی ہوئی ہے بیٹا؟''

''بس نانو ہر بات ختم ہوچکی آپ بڑے ماموں کو بتا دیجیے گا۔'' ماموں تک یہ بات پہنچی تو وہ اپ سیٹ ہوگئے۔

''اگر بات راحیل کے نام پراپرٹی کرنے کی ہے تو حرج کیا ہے بچے! ہم مان لیتے ہیں ان کی بات، مگر آپ یوں......''

''بات اس مان کی ہے ماموں! جو ٹوٹ گیا ہے۔ اُس مان کی ہے جو میں کسی حال میں بھی توڑنا نہیں چاہتی۔ میں انکار کرچکی ہوں اور اگر وہ لوگ کوئی ایشو بناتے ہیں تو میں خود ان سے بات کرلوں گی۔''

''اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی ہم ہیں ناں۔''

عاقب نے کہا تھا...... تیمور کے لیے دیکھا جائے تو یہ گڈ نیوز تھی مگر جانے کیوں وہ خوش نہ ہوسکا۔

شاید اس کی وجہ حریم کے چہرے کا ملال تھا، اس کی آنکھوں میں کرچیاں تھیں ٹوٹے خوابوں کی، وہ اسے اپنے من میں چبھتی محسوس ہورہی تھیں۔

''آپ جیت گئے میرا مان ہار گیا۔''

دو دن گزرنے کے بعد بھی، حریم کے یہ الفاظ ہر لمحے اسے گونجتے محسوس ہوتے تھے۔ اس کا مقصد حریم کو ہرانا نہیں تھا، وہ تو صرف اس کا تحفظ چاہتا تھا۔ یوں ہوگا، اس کے تصور میں بھی نہ تھا۔

بات ختم ہوگئی، راحیل کے گھر انکار پہنچا دیا گیا تھا۔

ان کے لیے بھی یہ خبر جھٹکا تھی، کیوں کو انہوں نے تو حریم کو اچھا خاصا محبت کے جال میں پھنسایا تھا، پھر چُوک کہاں ہوئی تھی؟ شاید وہ بھول گئے تھے کہ...... حریم کی تربیت جہاں ہوئی تھی، اُس محبت، ان جذبوں کا رنگ اتنا گہرا تھا کہ اُن لوگوں کی جھوٹی محبت، اس رنگ کو پھیکا نہ کرسکی۔ واویلا تو کیا انہوں نے مگر جب حریم نے ہی صاف جواب دے دیا تو دھمکیاں دے کر وہ چلے گئے تھے۔

قصہ ختم ہوا مگر ساتھ ہی حریم سکندر کی مسکراہٹ بھی ختم ہوگئی۔ اس کی ہر وقت کی چہک، ضدیں، شور، ہنگامہ ہر چیز ختم ہوگئی۔ اسے دکھ اس بات کا نہیں تھا کہ راحیل نے دھوکہ دیا۔ افسوس اس بات کا تھا کہ وہ کیسے بھٹک گئی تھی؟ اس نے خالص محبتوں کو نظر انداز کرکے راحیل پر اعتبار کیا کیوں؟ نادم تھی وہ اپنی غلطی پر اور تیمور حیدر کو اندر ہی اندر یہ گھن کھا رہا تھا کہ اس کی ضد کی وجہ سے یہ سب ہوا۔

حریم، راحیل کو چاہتی تھی۔ کاش وہ بے وجہ ان کے درمیان میں اپنی وکالت نہ لاتا۔ جیسے ہو رہا تھا ہونے دیتا۔

کم از کم حریم تو یوں بکھر کر نہ رہتی۔ اس کے چہرے کی سنجیدگی اور آنکھوں کا ملال اسے بے کل کرتا رہتا۔

''اُس کا مان میرے باعث ٹوٹا، جب سب کو اعتراض نہ تھا تو مجھے کیا ضرورت تھی بیچ میں بولنے کی۔''

اب تو حریم کے نزدیک اس رشتے کے ختم ہونے کا ذمہ دار میں ہوں۔ کاش! میں اسے یقین دلا سکتا کہ میں صرف اس کی بھلائی چاہتا تھا!!

اس طرح اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی مسکراہٹ چھیننا میرا مقصد نہیں تھا۔

دن رات یہ سوچیں اسے کاٹتی رہتی تھیں اور وہ اِن دو ماہ میں آدھا رہ گیا تھا سوچ سوچ کر۔

عاقب کی شادی یوں تو دھوم دھام سے ہوئی تھی، مگر حریم کی خاموشی نے جیسے اُسے اپنے چہیتے چاچو کی خوشی میں بھی خوش ہونے نہیں دیا تھا۔

دھیرے دھیرے حریم پلٹ رہی تھی، مگر پہلے والی بات نہ تھی۔

اس کے چھوٹے ماموں کی خواہش تھی کہ وہ اس کو سمیر کی دلہن بنائیں، یہ بات اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔

مگر اب اس نے یہ فیصلہ بڑے ماموں پر چھوڑ دیا تھا کیوں کہ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ اس کے لیے جو فیصلہ کریں گے، وہ ہی بہترین ہوگا۔

اب جب راحیل کی جھوٹی محبت کا رنگ اترا تو اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر غلط تھی۔ ماموں کی خاموشی اور امی کی ہر وقت کی الجھن شہرام اور عائشہ کی یکدم بے جا مصروفیت اور باقی کزنز نے بھی آنا ترک کر دیا تھا...... گویا سب صرف اس کی خوشی میں خوش تھے، حقیقتاً کوئی بھی خوش نہ تھا، نانو کا بے بات رونا، ہر وقت ممتا کو یاد کرنا وہ سب میری خوشی کے لیے چپ تھے۔ اور میں جو اتنی ضدی اور خودسر تھی وہ بھی تو انہی محبتوں کے دم پر تھی اور ان لوگوں نے میرا وہ مان رکھا۔

غلط ہوتے ہوئے بھی نہ کہا کہ کہیں میں انہیں غلط نہ سمجھ لوں، شاید حالات ہی اتنے نازک تھے اور اگر واقعی اُس وقت اُسے کوئی کچھ کہتا تو یقین نہ

کرتی۔

تبھی وقت نے اسے خود یقین دلایا، او گاڈ! کتنا بڑا نقصان کرنے لگی تھی وہ خود اپنے ہاتھوں سے۔

ایک راحیل کے بنا جینا بہت آسان ہے مگر اتنی ساری محبتیں...... یہ محبتیں ہی تو اس کی آکسیجن ہیں بھلا اِن کے بنا وہ جی سکتی ہے، کبھی نہیں۔

اب اگر ماموں میرے لیے سمیر کو بھی چنتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مجھے صرف اپنی یہ محبتیں درکار ہیں اور مجھے یقین ہے اب کبھی یہ مجھ سے الگ نہیں ہوں گی۔ وہ مطمئن تھی۔ مگر دوسری طرف یہ اطمینان قطعی غیر یقینی تھا، عاقب تیمور کو سمجھا سمجھا کر عاجز آچکا تھا۔

''قسمت بار بار موقعہ نہیں دیتی تیمور! اللہ پاک نے تمہیں ایک موقع اور دیا ہے فار گاڈ سیک! اب تو یہ چپ توڑ دو۔''

''اس کی نظر میں پہلے ہی میں ذمہ دار ہوں، اس کی منگنی ختم ہونے کا، اور اگر اب میں نے یہ ذکر بھی چھیڑا تو اس کا یقین پختہ ہو جائے گا۔''

وہ چائے کے مگ پر نگاہیں جمائے بول رہا تھا۔ عاقب کا بس چلتا تو اس کا سر پھاڑ دیتا۔

رات کے اِس دوسرے پہر کیوں وہ خوامخواہ بھینس کے آگے بین بجا رہا تھا؟

''حالت دیکھی تم نے تیمور اپنی! گھل گھل کے آدھے رہ گئے ہو اگر اب بھی یہ موقع گنوا دیا تو مر جاؤ گے تم۔''

''مر تو چکا ہوں چاچو! محبت مار ہی تو دیتی ہے انسان کو۔ چاچو! مجھے تو اس کے علاوہ کوئی اور نظر ہی نہیں آتا۔ مجھے لگتا ہے چاچو! جب تک وہ گھر میں ہے ناں میری سانسیں چل رہی ہیں، جس دن وہ اِس گھر سے گئی، میں ایک پل بھی زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔''

عاقب اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ اِس دور میں ایسی محبت واقعی عجوبہ تھی۔ مگر وہ گواہ تھا کہ تیمور حیدر واقعی حریم کو تمام تر شدتوں سے چاہتا ہے۔

''پھر بھی چپ ہے تُو؟ بڑے بھیا اس کی شادی سمیر سے کرنے کو تیار بیٹھے ہیں یار!''

''وہ خوش ہے اس پر؟'' تیمور نے سرخ ہوتی نگاہیں عاقب پر مرکوز کیں۔

''میں نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرے نزدیک تمہاری خوشی اہم ہے اور تمہاری خوشی کا نام 'حریم' ہے۔''

''میں بہت گلٹی فیل کر رہا ہوں چاچو! اس کی محبت میں، میں نے جو کیا اس سے اس کی زندگی کی ساری خوشیاں روٹھ گئی ہیں۔ اس کے دل میں تو پہلے ہی میرے لیے نفرت تھی اب اور زیادہ بڑھ گئی ہو گی۔ اگر میں اِس وقت آپ کی بات مان بھی لوں تو کیا گارنٹی ہے کہ وہ خوش ہو گی۔ میں ڈرتا ہوں چاچو! کہیں اس کی نفرت میں اضافہ نہ ہو جائے۔ میں اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''اس کی خوشی کے لیے ایک بار پھر محبت قربان کرنے کو تیار ہے تو۔''

''محبت میں کرتا ہوں، وہ تو نہیں کرتی ناں۔''

''میں حریم سے بات کروں اسے تیری ساری شدتوں کا بتا دوں پھر تو مان جائے گا تو؟''

عاقب بول رہا تھا مگر جواب میں اس نے نگاہ بھی نہ اٹھائی تھی مگ سے اٹھتی بھاپ کو دیکھتا رہا۔

''میں نہیں جانتا میرے مقدر میں کیا ہے؟ بس یوں لگتا کہ میں جی نہیں پاؤں گا اگر۔'' وہ یکدم لب بھینچ خاموش ہو گیا۔

عاقب سب کچھ بھول کر اسے ساتھ لگا کر تسلی دینے لگا تھا، اور وہ...... یعنی حریم سکندر!!

اس کے قدموں تلے جیسے زمین ہی نہ تھی یہ تمام

باتیں سن کر!! وہ اچانک ہی کچن میں آئی تھی۔ مگر اندر سے ماموں اور تیمور کی آواز سن کر رک گئی پلٹنے لگی تو راحیل کے ذکر پر رک گئی۔ یہ علم نہ تھا کہ ایسا انکشاف ہوگا۔

اس وقت کچن میں عاقب اور تیمور کی موجودگی روٹین میں شامل تھی۔ ورات کو جب واک کر کے لوٹتے تو خود ہی چائے بناتے تھے اور کچن میں ہی پیتے تھے۔ اور باتیں تو ان دونوں کی ختم ہوتی نہیں تھیں۔ سب کے ساتھ ناپ تول کر بولنے والے، یہ دونوں ایک دوسرے سے جانے کون سے جہاں کی باتیں کرتے تھے، جو ختم نہ ہوتیں تھیں۔

تیمور حیدر؟؟ مجھ سے؟ وہ منہ پر بے یقینی سے ہاتھ دھرے کتنے لمحے کھڑی رہی، پھر کمرے میں آ گئی، مگر اب بھی جیسے شاک میں تھی۔ جس شخص کو خاندان بھر میں اس نے خود پسند، گھمنڈی اور اپنی ذات سے پیار کرنے والا کہہ کر بدنام کیا ہوا تھا۔

''وہ اسے اتنی شدتوں سے چاہتا تھا!'' اگر آج بھی وہ کمرے سے نہ نکلتی تو شاید عمر بھر انجان رہتی۔

☆☆

''میری خواہش ہے مانو! کہ تُو عمر بھر میری نظروں کے سامنے رہے۔''

وہ آج صبح سے نانو کے کمرے میں تھی۔ جانے کیوں اس کا دل بہت اداس ہو رہا تھا؟

''نانو میں کچھ دن کے لیے بھٹک گئی تھی۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے نانو! مگر یہ تو طے ہے نا کہ میں خود آپ سب کے بنا نہیں رہ سکتی۔'' اس کی آنکھیں بھر آئیں تھیں۔ نانو نے اس کی پیشانی چومی وہ ان کی گود میں لیٹی ہوئی تھی۔

''غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے، اور پھر شکر ہے، اس ذات کا کہ ابھی بہت دیر نہیں ہوئی تھی۔''

''جی نانو، اُس ذات پاک کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ واقعی اگر دیر ہو جاتی تو شاید میں عمر بھر پچھتاتی۔ اللہ پاک نے میری غلطی کی تلافی سے جو آگہی کا در مجھ پر کھولا ہے، میں تا عمر اس سے محروم رہتی نانو۔''

نانو نے کچھ الجھ کر اسے دیکھا۔ انہیں اس کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں مگر انہیں اپنی بات کرنی تھی اس سے۔ اپنی بات سمجھانی تھی۔

''مانو تجھ سے ایک بات کرنی ہے۔ تُو ناراض تو نہیں ہوگی ناں؟'' اپنی نواسی کی جذباتی اور جلد بھڑک جانے والی عادت سے وہ خائف تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا پھر مسکرا کے نفی میں سر ہلا دیا۔

''حیدر کی بھی یہی خواہش ہے کہ تو ہماری نظروں کے سامنے رہے۔ صفدر تو دو سال سے کہہ رہا تھا، سمیر کے لیے، مگر ہم چاہتے تھے، جس میں تیری رضا ہو وہ ہی کریں۔ پھر وہ موا راحیل ٹپک پڑا۔ تو یہ بات دب گئی۔ لیکن اب چونکہ وہ قصہ ہی ختم ہو چکا تو تمہارے بڑے ماموں نے مجھے تم سے بات کرنے کو کہا ہے۔ لیکن حریم بچے! اب بھی زبردستی کوئی نہیں۔ تم اگر منع کر دو گی، ہم برا نہیں مانیں گے۔''

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ نانو کی بات بھی مکمل نہ ہونے دیتی مگر چونکہ ٹھوکر لگ چکی تھی۔ سو بہت تحمل سے ان کی پوری بات سنی تھی اس نے۔

''میں خود آپ لوگوں سے دور ہونا نہیں چاہتی نانو!'' وہ اٹھ بیٹھی تھی۔ ''مگر!!'' کہتے کہتے وہ چپ سی ہوئی۔

''مگر کیا بچے؟''

وہ پریشان ہوئیں۔ کہیں پھر کوئی بھوت سوار نہ ہو گیا ہو؟ حریم نے لمحہ بھر کو جھکا سر اٹھایا تھا۔

''نانو۔ جب عمر بھر ساتھ ہی رکھا ہے تو کیا اِس گھر میں میری جگہ نہیں ہے؟ مجھے اِسی گھر میں رہنے

دیں۔"

اپنی بات کمپلیٹ کر کے اس نے نانو کے ری ایکشن نہیں دیکھے تھے، خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔ اور نانو شاید اس کی بات کی تہہ تک نہ پہنچ پائی تھیں۔ تبھی تو شام میں بہو سے ذکر کر رہی تھیں۔

"وہ تو کہتی ہے کہ اگر رکھنا ہی ہے تو کیا اِس گھر میں میرے لیے جگہ نہیں ہے۔"

"احمق ہے میری بچی۔ بھلا یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ جم جم آئے رہے، ہمیں کیا اعتراض۔" وہ بولے جا رہی تھیں۔ مگر امی کم فہم نہ تھیں۔ لمحہ لگا تھا۔ انہیں حریم کی بات کی تہہ تک جانے میں۔ ان کے لب مسکرا اٹھے۔

"اِس سے بڑھ کر اعلیٰ بات کیا ہوگی اماں! اگر وہ عمر بھر اِسی گھر میں رہے۔" بہو کی بات پر انہوں نے حیرت سے انہیں دیکھا جن کی آنکھیں ہی نہیں لب بھی مسکرا رہے تھے۔ ساس پین میں پانی لیے وہ سوچ رہا تھا کہ چائے بنائے یا نہیں۔ تیمور حیدر کے بغیر چائے پینے کا مزہ خاک آتا اور عاقب جانتا تھا، آج وہ چائے نہیں پیئے گا بلکہ ساری رات خود کو دھویں میں جھونکے گا، سگریٹ پی کر۔

اسے تیمور کی یہ خود اذیتی پسند نہیں تھی، مگر وہ جانتا کہ غصے میں وہ یہ ہی کرتا ہے۔ باقی سب کی طرح چیخ چلا کر اظہار نہیں کرتا تھا وہ۔ سب کچھ چھوڑ کر کچن سے باہر نکلا تو حریم مل گئی۔ "چائے بنانے لگے ہیں ماموں!" "نہیں بھانجی آج من نہیں ہے۔"

"میں بنا دوں؟"

حریم شاذ و نادر ہی ایسے موڈ میں ہوتی تھی، اس نے دل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔ "اوکے بنا دو۔" وہ پلٹ کر کچن میں ہی آ بیٹھا۔ "تیمور کی بھی بنانی ہے۔"

"نہیں۔"

عاقب نے انکار کیا تو وہ حیران سی مڑ کر ماموں کو دیکھنے لگی۔

"خیر ہے ماموں۔ آپ دونوں میں ناراضگی ہے کیا؟؟"

"وہ تو خود سے ہی ناراض رہتا ہے۔ دوسروں سے ناراض ہو کر کیا کرے گا۔" عجیب سا لہجہ تھا ان کا۔ وہ جانتی تھی، عاقب کو اپنے سارے بھتیجے، بھتیجیوں سے بہت پیار تھا۔ مگر جو محبت انہیں تیمور حیدر سے تھی وہ الگ ہی تھی۔ وہ بیسٹ فرینڈز تھے۔ عمر کے تمام فرق کے باوجود ان کی دوستی بہت گہری تھی۔ حریم نے پھر ان سے کچھ نہ پوچھا خاموشی سے چائے بنا کر ان کے سامنے رکھ دی۔

"بیٹھو مانو!"

مگ تھام کر عاقب نے کہا تو وہ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ کافی دیر وہ مگ سے نکلنے والی بھاپ کو دیکھتا رہا۔

"تمہیں راحیل سے محبت ہے مانو!"

"مجھے راحیل سے صرف نفرت ہے ماموں! اور خود پر افسوس ہے کہ میں نے اُسے سمجھنے میں غلطی کر دی۔"

اس کا جواب اتنا مکمل تھا کہ عاقب چپ سا رہ گیا۔

"بھیا جو چاہتے ہیں تم جانتی ہو، اماں نے تم سے بات تو کی ہوگی۔"

"جی ماموں اور جو میں چاہتی ہوں یہ بھی انہیں بتا چکی ہوں۔" اس بار پھر اس کا جواب جامع تھا۔ عاقب سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کچھ بتانا مناسب ہے یا نہیں۔

"آپ سے کچھ پوچھوں؟" اس بار سوال حریم نے کیا۔ "ہاں پوچھو۔" چائے کا سِپ لیتے ہوئے وہ متانت سے بولا۔

"امی دودو شادی کا ذکر کر رہی تھیں۔"

''تو!!'' عاقب نے اسے دیکھا پھر شاید وہ سمجھ گیا۔

''ہاں، وہ بھیا چاہتے ہیں تمہارے فرض کے ساتھ ساتھ تیمور کی بھی۔ بٹ ایسا مشکل ہے۔''

''کیوں ماموں؟''

''پتا نہیں بھانجی!!'' اس نے توجہ چائے کی طرف مرکوز کر دی۔

حریم بھی بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی ان سے پوچھ نہ سکی تھی۔

☆☆.........

''میرا مزاج نہیں ملتا اس سے۔ اور میرا ابھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ آپ پلیز ابو کو سمجھائیں ناں۔''

عاقب نے اس کا انکار ان تک پہنچا دیا تھا۔ تبھی امی نے اسے کمرے میں بلایا تھا۔

''گھر کی بچی ہے۔ گھر میں رہے گی تو اچھا ہے ناں۔ اور اگر ابھی تم نہیں چاہتے تو ہم صفدر کو سال دو سال کا کہہ دیں گے۔''

''میری وجہ سے پابند نہ کریں اُسے۔ اور یوں بھی اگر شادی کی بھی تو ثانیہ سے نہیں کروں گا۔''

''پھر کس سے کرو گے؟''

حریم کیا چاہتی تھی، یہ وہ جان گئی تھیں، مگر اس میں تیمور کی رضا بھی لازم تھی۔ کیوں کہ گھر میں سب کو علم تھا کہ اِن دونوں کی بالکل نہیں بنتی۔ انہیں خدشہ تھا کہیں تیمور راضی نہ ہو۔

''امی پلیز! ابھی مجھے اس ٹاپک پر بات ہی نہیں کرنی۔'' وہ بے چینی سے پہلو بدل کر گویا ہوا تھا۔

''امی کھانا لگا دوں؟'' یکدم ہی وہ اندر آئی تھی۔

''جی بچے...... آپ کھانا لگاؤ میں آتی ہوں۔''

''جی اچھا۔'' وہ تبھی واپس مڑ گئی امی نے اُسے جاتے دیکھا۔

''سچ کہوں تو خواہش تو یہ ہے کہ حریم کو ہی اِس گھر میں رکھ لوں۔ اس کے جانے کا سوچتی ہوں تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔''

وہ امی کی بات پر تڑپ کر انہیں دیکھنے لگا تھا۔

''کاش ایسا ہو جائے امی۔''

اس کے اندر کوئی چیخا تھا، مگر لب اب بھی سلے ہوئے تھے۔

''اگر ثانیہ کے علاوہ کوئی اور ہو تو تمہیں پھر بھی اعتراض ہوگا۔'' آنکھوں میں امید بھر کے انہوں نے بیٹے کو دیکھا تھا۔

''کوئی اور بھی ہے جو آپ نے تلاش کر کے رکھی ہوئی ہے؟''

''تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو اِسی گھر میں ہے ہمیشہ سے۔''

کم فہم نہیں تھا جو امی کا اشارہ نہ سمجھتا۔

''آپ۔''

''امی وہ ہنگامہ کر دے گی گھر میں۔ پلیز پھر سے ذکر بھی مت کیجیے گا۔''

اس نے امی کی خواہش جان کر کہا حالاں کہ دل شدتوں سے خود یہ ہی چاہ رہا تھا۔

''نہیں کرے گی کیوں کہ اس نے خود کہا ہے کہ وہ اِسی گھر میں رہنا چاہتی ہے عمر بھر۔'' وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو گی امی!''

بھلا یہ یقین کرنے والی بات کب تھی۔ وہ خود بھی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم صرف یہ بتاؤ تمہیں تو اعتراض نہیں۔'' امی نے کہا۔

بے کلی سے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کیسے ہو سکتا تھا یہ!!

''سوچ کر بتاؤں گا۔''

وہ سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ اٹھ گیا، مگر بے یقینی حد سے سوا تھی۔ وہ عاقب چاچو سے خفا نہ ہوتا تو ان سے بات کرتا، مگر اب کیا کرے۔

بظاہر وہ سب کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا مگر کھانا اُس کے حلق سے اتر کب رہا تھا۔

اور عاقب یہ شدت سے نوٹ کر رہا تھا اتنا تو اسے علم ہو گیا تھا کہ بھابی کے کمرے میں حاضری تھی اس کی۔ مگر بات کیا ہوئی؟ جو یہ اتنا اپ سیٹ ہو گیا۔ بے کلی اس قدر!!

وہ کھانے کے بعد باہر نکل گیا...... عاقب کے ساتھ وہ نہیں جاتا تھا سو عاقب نے جانا ہی چھوڑ دیا۔

اکیلے ٹہل کر جب وہ گھر لوٹا تو سوا بارہ بج چکے تھے، ٹائم کا اندازہ ہی نہ ہوا۔

وہ چائے بنانے کی غرض سے کچن میں آیا تو حریم پہلے ہی کچن میں موجود تھی۔

''ماموں کے لیے چائے بنا رہی ہوں۔ آپ کی بھی بنا دوں۔''

''ہوں۔''

وہ سر ہلا کر وہیں بیٹھ کر حریم کی پشت کو تکنے لگا۔

کیا واقعی امی جو کہہ رہی ہیں وہ سچ ہے؟؟

حریم سکندر یہ کہہ سکی ہے؟ وہ لڑکی جس کی نظر میں، میں خود پسند اور گھمنڈی ہوں، وہ عمر بھر میرے ساتھ رہ سکتی ہے؟

''امی نے مجھے جو کہا، کیا وہ سچ ہے۔'' حالاں کہ وہ کہنا نہیں چاہتا تھا مگر لب جانے کیسے ہلے تھے۔ حریم نے پلٹ کر اُسے دیکھا تو وہ جانا کہ! لب دغا کر گئے۔

''آپ کو یقین نہیں آیا؟'' اس کی آنکھوں سے ٹپکتی بے یقینی وہ دیکھ چکی تھی۔

''مجھے بھی نہیں آیا تھا۔ اسی طرح بے یقینی سی تھی جب مجھے علم ہوا تھا کہ کوئی شخص اتنی شدتوں سے مجھے چاہتا ہے۔'' یقیناً تیمور کے لیے یہ دھماکہ تھا، جبکہ وہ مطمئن سی چائے بنا رہی تھی۔

''تم......''

وہ جیسے گنگ سا رہ گیا تھا۔ حریم نے چائے مگ میں انڈیلی تھی اور مگ لا کر اس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔ خود کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

تیمور اب تک بے یقین سا اُسے دیکھ رہا تھا۔

''آئی ایم سوری تیمور! آج تک آپ کے بارے میں میں نے اتنا غلط کہا۔ آپ کو بارہا ہرٹ کیا۔ اپنے تمام الفاظ اور سابقہ رویئے کے لیے میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔''

یہ حریم سکندر ہی تھی ناں۔ اتنا نرم لہجہ اتنا مہذب انداز وہ بھی اس کے یعنی تیمور حیدر کے ساتھ......؟

''آئی نو آپ کے لیے یہ سب ناقابل یقین ہے۔ بٹ دس از ٹرو میں واقعی شرمندہ ہوں۔''

''راحیل کے لیے......''

''اس کے لیے بھی آپ کی شکر گزار ہوں۔''

اس نے تیمور کے لبوں سے نکلنے والی بات کاٹ کر کہا۔

''میں شاید نادانی اور جذبات میں کوئی غلط فیصلہ کر دیتی اگر آپ اس دن آ کر مجھے نہ سمجھاتے۔ تو راحیل کو آزمانے کا مجھے یہ موقع نہ ملتا۔ میں اس پر اندھا مان کرنے لگی تھی۔ بٹ تھینکس ٹو یو کہ صحیح وقت پر آپ نے مجھے احساس دلایا اُس وقت بھی میں آپ کو غلط ثابت کرنا چاہتی تھی مگر وقت نے مجھے ہی غلط ثابت کر دیا۔''

''تو کیا تم مجھے مجرم نہیں سمجھتیں کہ میری وجہ سے تم اور راحیل جدا ہو گئے۔ تم اتنا چاہتی تھیں اُسے۔''

''میری چاہت غلط تھی وہ شاید میرا جذباتی پن تھا۔''

''تمہیں لگتا ہے حریم! کہ محبت، وہ بھی پہلی محبت، انسان اتنی جلدی بھول سکتا ہے۔''

اتنا تو یقین تھا اُسے کہ وہ اسے نہیں چاہتی۔

''محبت ہو یا نفرت اگر شدید ہو تو واقعی بھولنا مشکل ہے مگر مجھے راحیل کے نہ ملنے کا کوئی افسوس نہیں ہے۔'' اس نے پل بھر کو نگاہیں اٹھا کر تیمور حیدر کو دیکھا تھا۔

''میں جانتی ہوں آپ کے لیے یقین کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ میرا رویہ ہی اس قدر بُرا رہا ہے آپ کے ساتھ......''

''غلطی انسانوں سے ہوتی ہے حریم سکندر......! خود کو اِس احساس سے آزاد کردو۔ تمہارا رویہ کچھ دیر کے لیے مجھے بُرا لگتا ضرور تھا، مگر تمہاری محبت کا احساس اس قدر گہرا ہے میرے دل میں کہ تمہارے لیے کبھی بھی بُرا خیال نہ آسکا۔ بلکہ یہ خیال غالب آجاتا تھا کہ شاید میری محبت میں کچھ کمی ہے جو تمہیں احساس نہ دلا سکا۔''

''آپ سے ایک بات پوچھوں؟''

''ضرور''

وہ اب خاصا ریلیکس ہو کر چائے پی رہا تھا۔

''آپ کے لیے اتنا آسان تھا مجھے پانا۔ پھر بھی آپ خاموش رہے۔ اگر اب بھی میں امی سے نہ کہتی تو۔ شاید آپ نے عمر بھر نہ کہنا تھا۔''

''میں تمہیں تمہاری رضا کے بنا حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور اگر میں اُس وقت یہ ذکر بھی کرتا تو تمہارے دل میں میرے لیے محض نفرت ہی بڑھتی تھی۔ کیوں کہ اس وقت تم پر کسی بھی احساس کا اثر نہیں ہونا تھا۔ سو میں پیچھے ہٹ گیا۔''

''اور اب۔''

''مجھے لگتا تھا کہ تم مجھے ذمہ دار سمجھتی ہو۔ اس سب کا۔ اس لیے۔''

''آپ کا مزاج مجھے پسند نہیں تھا مگر ہم ہمیشہ ساتھ رہے ہیں، اتنا تو میں جانتی تھی آپ غلط نہیں چاہ سکتے میرے لیے۔''

''اِس اعتبار کے لیے تھینکس۔'' وہ ہلکے سے مسکرایا۔ ذہن و دل پہ جما برسوں کا غبار جو ہٹ گیا تھا۔ وہ خوش تھا بہت خوش۔

''آپ بھی مجھے شکریہ کا موقع دیں۔'' اس کی بات پر تیمور نے دیکھا تو ہلکے سے مسکرا کر وہ سر جھکا گئی۔

''آپ نے امی سے سوچنے کا ٹائم لیا ہے۔''

''ہاں اور۔''

''جواب بھی میں امی کو ہی دوں گا۔''

''آپ نے مجھے معاف کردیا ناں۔''

''فار گاڈ سیک حریم! بار بار کیوں دہرا رہی ہو۔ میرے دل میں تمہارے لیے صرف محبت ہے اور بس۔ اور میں اس رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے میری سن لی۔ ورنہ شاید۔'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''ثانیہ کو قبول کرنا پڑتا۔''

''یہ تو طے تھا حریم سکندر کہ اگر تم نہیں۔ تو کوئی بھی نہیں۔'' وہ ذرا سا اس کی طرف جھک کر گہرے سنجیدہ لہجے میں بولا تھا۔

''اگر ثانیہ کو اپنانا ہوتا۔ تو اتنا خوار نہ ہوتا۔''

''اگر آپ کو پتہ چل جائے ناں کہ ثانیہ!!''

''مجھے کتنا چاہتی ہے۔''

اس نے حریم کی بات مکمل کی تو وہ حیران ہوئی۔

''ثانیہ کی آنکھوں میں پہلے ہی اپنا عکس نظر آگیا تھا مجھے اور تب سے میرا دل کڑھتا تھا کہ میری آنکھوں میں اپنا عکس تمہیں دکھائی کیوں نہیں دیتا؟ بہت تڑپا ہوں حریم سکندر! میں تمہارے لیے۔'' اس کا لہجہ بہت خوبصورت ہو گیا تھا۔

یہ احساس کہ کوئی ہمیں چاہتا ہے اور وہ بھی اتنی شدت سے کس قدر حسین ہوتا ہے ناں......

وہ بھی ان لمحوں میں خوش تھی اور شکر گزار تھی اس رب کی جس نے صحیح وقت پر اسے راہ دکھائی تھی۔

☆☆......☆☆

''شازم احمد۔تم نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے اتنا گرا دیا اور اتنی بلندی پر لے جا کر گرا دیا کہ آج میری کرچیاں بھی ہاتھ نہیں آتیں کہ میں خود کو جوڑ ہی لوں۔تم اپنی زاویہ کو ہی نہ سمجھ سکے، چند ماہ میں مجھ پہ اتنا بڑا بہتان لگا دیا تو کیسے پوری عمر تم جیسے بندے......

آگہی کا کرب لیے، ایک منفرد افسانہ

تُو کہ آج قاتل ہے
پھر بھی راحتِ دل ہے!!
زہر کی ندی ہے تُو
پھر بھی قیمتی ہے تُو!!!
پست حوصلے والے
تیرا ساتھ کیا دیں گے!!
زندگی اِدھر آ جا
ہم تجھے گذاریں گے!!
اب کے سال پونم میں
جب تُو آئے گی ملنے!!

آصف شاہد کی مدھر آواز، کمرے میں ملجگا سا اندھیرا، سردیوں کی اداس سی شام، لان میں پیلے گرتے ہوئے پتے، ٹنڈ منڈ شاخوں پر پاؤں پھیلائے سوتی خزاں۔ ماحول کی اداسی اور تنہائی کا تاثر بہت گھنیرا ہو رہا تھا۔شازم بیڈ پر آڑا ترچھا آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا ہوا سونے کا ناٹک کر رہا تھا مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی!!

''کیسے کر سکتی ہو تم ایسے زاویہ، تم نے کیسے ایک پل میں بنا سوچے سمجھے مجھے ٹھکرا دیا۔تم نے کیسے وہ لمحات بھلا دئے جو میری رگِ جاں میں پیوست ہیں۔ کتنی آسانی سے تم نے فیصلہ سنا دیا۔''

شازم نے درد بھرے لہجے میں خود کلامی کی۔

''جب رات کا اولین تارہ اپنی پلکیں جھپکائے گا تو کیا تمہیں میری یاد نہیں ستائے گی، پھر کیا تمہیں اپنے الفاظ کی زہرناکی کا اندازہ نہیں ہوگا، جانے کیسے تم نے اتنا بڑا فیصلہ اتنی آسانی سے سنا دیا، کیسے رفاقتوں کا بندھن تار تار کر دیا، ایک پل کو تو سوچا ہوتا زاویہ کہ کوئی ہے جو تمہیں خود سے بھی پہلے سوچتا ہے، کیوں زاویہ، کیوں کیا تم نے یہ سب کچھ۔''

میرے بجنا
تجھ بن زندگی کا
ہر اک لمحہ ادھورا ہے
بس اک تیرا دکھ ہے
جو پورا ہے!!!

خیالات کی بازگشت سے شازم کا دماغ جیسے پھٹنے کو ہو گیا۔

☆......☆......☆

''زاویہ، زاویہ، کہاں ہو بھئی۔''

فروا کی آواز اُسے خیالات کے بحرِ بے کراں سے کھینچ کر باہر لے آئی، اس نے جلدی سے آنکھوں کے نم گوشے صاف کیے اور چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ بکھیری۔

''اوہو، یہاں بیٹھی ہیں مہارانی صاحبہ، ہاں جی، تمہارے مرض کا علاج گوشہ تنہائی ہی کر سکتا ہے، لاعلاج مرض۔''

فروا نے شوخی سے کہا۔

دیکھی جو میری نبض تو اک لمحہ سوچ کر

نہیں کرتا، زندگی ڈھونا آسان کام نہیں، زندگی کبھی اندھیری رات میں ہاتھ چھڑوائے گی نا، تو لگ پتا جائے گا، ساری شوخیاں ہوا ہوں جائیں گی۔''

زاویہ نے بے زاری سے کہا۔

''زاویہ بہت کچھ ہو جاتا ہے زندگی میں، مگر معاف کر دینے سے سب مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ اور آدھے معاملات میں تو وجہ پوئنٹ آف ویو نہ سمجھ سکنا ہوتی ہے، ہم مناظر کو اپنی مرضی کے گلاسز لگا کر دیکھتے ہیں تو پورا موسم ہی بدل جاتا ہے۔''

کاغذ لیا اور عشق کا بیمار لکھ دیا

قربان کیوں نہ جاؤں میں ایسے حکیم پر

نسخے میں جس نے شربتِ دیدار لکھ دیا

فروا نے لہک لہک کر پڑھا

''نہ کرو فروا۔ ہر وقت شوخیاں اچھی نہیں لگتیں، تمہیں پتا بھی ہے کہ اب مجھ پر یہ سب اثر

زاویہ کی کیفیت دیکھ کر فروا یکدم سنجیدہ ہوگئی

''چھوڑو یار، زندگی ہے ہی مشکل کام، کبھی اِسے خوش رکھو، کبھی اُسے خوش رکھو، کہیں یہ نہ ناراض ہو جائے، کہیں وہ نہ روٹھ جائے۔ ہر بندہ حاکم۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ یار اس ساری کشمکش میں بندہ کی اپنی خوشی کہاں گئی؟ اس کی بھی کوئی قدر و قیمت ہے کہ

نہیں، دوسروں کو خوش کرتے رہو۔ خود خاک ہو جاؤ، مٹی ہو جاؤ، قدموں میں بچھ جاؤ، رُل جاؤ، اپنی ہستی مٹا دو، پھر بھی ایک حرفِ ستائش تک آپ کی جھولی میں ڈالنا پسند نہیں کرتا یہ زمانہ۔ مجھ سے نہیں کھنچتا یہ بوجھ فروا۔''

جانے کب کا غبار جمع تھا جو ایک لاوے کی صورت زاویہ کی آنکھوں سے بہہ نکلا۔

''پتا ہے فروا کہ زندگی میں سب سے بڑا دکھ کیا ہوتا ہے۔ جس ہستی کے نام بندہ اپنا آپ کر دے، جس سے بڑھ کر آپ کے لیے کوئی بھی نہ ہو۔ وہ سرِ محفل آپ کو بدکردار کہہ دے۔''

زاویہ سسک پڑی۔

فروا نے آگے بڑھ کر زاویہ کو بانہوں میں لے کر خود سے لگا لیا اور اس کی کمر تھپکنے لگی۔

''یار زندگی کیوں اتنا خراج لیتی ہے۔ سانس لینا بھی محال کر دیتی ہے بعض اوقات تو۔ کوئی ہمارے اندر نہیں جھانکتا، ہمیں نہیں سمجھتا۔ انا کی دیواروں سے ہوا، روشنی اور عقل کیسے اندر جائے؟ بھلے انا والے گھٹا ٹوپ اندھیروں کو روشنی سمجھ کے جی لیں مگر اوروں کو تو مصلوب نہ کریں۔''

زاویہ اب سسک رہی تھی اور فروا اسے تھپک رہی تھی اور خود اس کی آنکھیں بھی بھیگ چلی تھیں، بالکونی کے اس تنہا گوشے میں بس سسکیاں گونج رہی تھیں۔

☆......☆......☆

زاویہ احمد ایک نرم خو اور دھیمے مزاج کی لڑکی تھی، آرٹسٹک مائنڈڈ، زندگی پر غور کرنے والی، زندگی کو سمجھنے والی، اپنی ذات پر بلا کا اعتماد رکھنے والی۔ تھوڑی سی لبرل، کیونکہ اس کی تمام سکولنگ مخلوط تشاہدی اداروں میں ہوئی تھی، اس وجہ سے اس میں بلا کا اعتماد بھی تھا اور وہ مثبت انداز میں لڑکوں کے ساتھ گھلنے ملنے میں ہرج بھی نہیں سمجھتی تھی۔

شخصیت کے لحاظ سے بھی وہ لاکھوں میں ایک تھی۔ سروقد، شرابی روشن آنکھیں، ستواں ناک، تراشے ہوئے لب اور خاموش طبع اندازا سے منفرد بناتے تھے۔ اس کے والد احمد حسن کا اپنا کنسٹرکشن کا بزنس تھا، معقول آمدنی تھی گلستانِ جوہر کے ایک رہائشی کمپلیکس کے تین کمروں کے فلیٹ میں زندگی اپنے ڈھب سے رواں دواں تھی، زاویہ ان کی اکلوتی اولاد تھی، اس کا میلانِ طبع دیکھتے ہوئے احمد حسن نے اسے این۔ای۔ڈی انجینئرنگ یونیورسٹی میں آرکیٹیکچر میں داخلہ دلوا دیا تھا، ویسے تو احمد حسن اپنی آمدنی کے لحاظ سے انڈس ویلی کو بھی افورڈ کر سکتا تھا مگر گلستانِ جوہر سے این ای ڈی آنا جانا ذرا آسان تھا، اس وجہ سے احمد حسن نے زاویہ سے مشاورت کرنے کے بعد این ای ڈی کو ہی ترجیح دی۔ زاویہ کے این ای ڈی کے انتخاب کی ایک اور خاص وجہ اس کا ماموں زاد شازم بھی تھا جو وہاں مکینکل انجینئرنگ کے دوسرے سال میں تھا، دونوں کی نسبت بچپن سے ہی طے تھی، زاویہ نے جب شعور کی حدوں کو چھوا تو اس نے شازم کا نام ایک خاص حوالے سے اپنے نام کے ساتھ سنا، وہ جو سپنے بننے کی عمر ہوتی ہے، اس میں زاویہ نے صرف شازم کے بارے میں سوچا۔ شازم بھی زاویہ کو ٹوٹ کے چاہتا تھا۔ دونوں فطری جھجک کے باعث ابھی ایک دوسرے سے کھل کر کچھ بھی نہیں کہہ پائے تھے مگر جب بھی کسی خاندانی تقریب میں دونوں موجود ہوتے تو نگاہیں ایک دوسرے کو ڈھونڈتی تھیں، زاویہ کے چہرے پر دھنک رنگ بکھر جاتے، اس کی کزنز مل کر اسے شازم کے نام سے چھیڑتیں تو اسے اچھا لگتا تھا، دل چاہتا تھا کہ سارا زمانہ اسے شازم کے نام سے جانے۔ ایسے میں اس کی پہلی چوائس این ای ڈی ہی ہو سکتی تھی۔!!!

☆......☆......☆

''زاویہ، ایک بات کہوں، میری بات سمجھنے کی کوشش کرنا پلیز۔''

شازم نے کیفے ٹیریا کے ایک الگ تھلگ گوشے میں کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا، اس کے چہرے پر گھمبیرتا چھائی تھی۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں شازم۔ اور یہ اجازت کا تکلف کیوں جناب، آپ کہیں، تمام حقوق حاصل ہیں آپ کو۔''

زاویہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''زاویہ، عورت کانچ کا نازک آبگینہ ہوتی ہے جبکہ چاروں طرف پتھریلے اور سنگلاخ راستے ہیں۔ پتھر کی نگاہیں، پتھر کے دل، پتھریلے جذبے، پتھر کے لوگ، پتھر کے زمانے کے اصول۔ ایسے میں عورت کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک ایک قدم پھونک پھونک کے رکھے۔''

''شازم کیا بات ہے، آج تو فلسفہ بول رہے ہیں آپ۔ خیریت تو ہے۔'' زاویہ نے شوخی سے کہا

''شاید۔'' شازم نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

''زاویہ۔ عورت جب گھر کی دہلیز سے قدم باہر نکالتی ہے تو تمہارے خیال میں اس کا رویہ، برتاؤ کیسا ہونا چاہیے؟''

شازم نے استفہامیہ نظروں سے زاویہ کیطرف دیکھا۔

''بھئی اس میں کیا مشکل بات ہے۔ ظاہر ہے آپ کا رویہ خوش اخلاقی پر مبنی ہونا چاہیئے، اسی سے آپ کے طور طریقوں، آپ کی تربیت، آپ کے خاندان کا پتا چلتا ہے۔''

زاویہ نے کندھے اچکاتے ہوئے الجھے انداز میں کہا۔

''نہیں۔ تم غلطی پر ہو زاویہ۔ بلکہ تم نہیں، آج کی ہر پڑھی لکھی لڑکی غلطی پر ہے۔ عورت جب گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتی ہے تو اس کا رویہ انتہائی خشک، روکھا ہونا چاہیئے۔''

شازم نے زاویہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''ارے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''

زاویہ بوکھلاسی گئی۔

''لوگ کیا سوچیں گے ہمارے بارے میں۔ ہمیں جاہل، ال مینرڈ، دقیانوسی کہیں گے۔ ہماری فیملی پر پینڈو کی چھاپ لگے جائے گی۔''

''لوگوں کو خوش کرنے کی کوشش میں، ماڈرن، تشادم یافتہ کہلوانے کی کوشش میں خود کو عام اور سستا کر لینا۔ کیا یہ بہت بڑی قیمت نہیں ہے زاویہ احمد۔''

شازم کا لہجہ انتہائی چبھتا ہوا ہو گیا تھا۔

''کیا مطلب شازم۔ پلیز آپ کو جو کہنا ہے صاف صاف کہیں۔ آپ میری ذات پر بات کر رہے ہیں نا۔''

زاویہ کا لہجہ تپ گیا۔

''ہاں میں تمہیں ہی کہہ رہا ہوں۔ میرے لیے تو تم ہی دنیا ہو۔ مجھے کسی اور سے کیا غرض۔ کوئی کیسے بھی آئے، کسی سے بھی بات کرے۔ تم یونیورسٹی آئی ہو تو یہ فلسفہ مجھ پہ آشکار ہوا ہے۔ صرف تمہاری وجہ سے۔''

''کیا کیا ہے میں نے۔ تم نے کیا دیکھا ہے شازم۔ تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔''

زاویہ نے شازم کی بات کاٹتے ہوئے انتہائی سرد انداز میں کہا۔

''واہ۔ کیا شانِ بے نیازی ہے۔ تم لڑکوں کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہو۔ کبھی تم لوگ کیفے ٹیریا، کبھی لائبیریری، کبھی بینچوں پر پائے جاتے ہو۔ تم لوگوں کے قہقہے یونیورسٹی میں گونجتے ہیں۔ تم ان کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسی مذاق کرتی ہو۔ کبھی سنو کہ وہ سب جب مل بیٹھتے ہیں تو تم لڑکیوں کے بارے میں کیسی زبان استعمال کرتے ہیں، شرط لگاتے ہیں تم لڑکیوں پہ وہ، بانٹ رکھی ہیں سب نے اپنی اپنی، جیسے بیوپاری منڈی میں جانوروں کو جانچتا، پرکھتا، تولتا ہے، ایسے تم لوگوں کو نظروں سے نوچتے ہیں یہ

تمہارے مودب گروپ فیلو۔ تم لیب انچارج کو سمائل دیتی ہو، کیفے ٹیریا کے ویٹر سے ہنس کر بات کرتی ہو اور وہ ٹکے ٹکے کے لوگ تمہاری لحاتی خوشدلانہ مسکراہٹ پر کیسے کیسے فسانے تراش کر لوگوں کو سناتے ہیں۔ چٹخارے کی پلیٹ بنا رکھا ہے ان تمام لوگوں نے تم لڑکیوں کو۔ اور تم مجھے کہہ رہی ہو کہ میں تم پہ الزام لگا رہا ہوں۔ زاویہ احمد تم خود عام بننے جارہی ہو۔ سنبھل جاؤ، ابھی وقت ہے۔''

شازم بولنے پر آیا تو اس نے بنا لحاظ کیے سب کچھ کہہ دیا، اس کا چہرہ غصے سے تپ رہا تھا۔

''شٹ اپ شازم۔ سٹاپ اٹ پلیز، سٹاپ اٹ۔''

زاویہ کی آواز غصے سے پھٹ گئی۔

''تمہیں میری بات سننا ہوگی زاویہ۔ یاد رکھو کہ عزت صرف اپنا مرد ہی دیتا ہے، والد، بھائی یا پھر وہ کہ جس نے عمر بھر ساتھ رہنے کا سوچ رکھا ہو۔ تم خود سوچو کہ کوئی عزت کیوں دے گا آخر۔ اور وہ بھی اس معاشرے میں جس میں لوگ بیوی تو لپٹی لپٹائی، با پردہ پسند کرتے ہیں اور لبرل لڑکیوں کو صرف ٹائم پاس کا مقام دیتے ہیں۔ اس معاشرے میں تم کس برتے پر عزت کی توقع رکھ رہی ہو زاویہ۔''

شازم کا لہجہ جذبات اور جوش سے تپ رہا تھا۔

''تم اپنے رشتے اور میرے عزت کرنے، میری محبت کا غلط فائدہ اٹھا رہے ہو۔ یہ حق تو میں نے کسی کو نہیں دیا کہ کوئی بھی مجھے دو کوڑی کا بنا دے۔ جنہیں تم میرے ساتھ نتھی کر رہے ہو وہ کوئی اور نہیں میرے کلاس فیلو ہیں، میرے گروپ فیلو ہیں، ہم سٹڈی میں مدد کرتے ہیں ایک دوسرے کی۔ وہ عزت کرتے ہیں میری، نظریں جھکا کے بات کرتے ہیں مجھ سے۔ اور دوسروں سے اخلاق سے بات کرنا میری تشاہدم نے سکھایا ہے مجھے۔ اور تم۔ شازم رضا۔ کبھی مت ملنا مجھ سے۔ آئی ہیٹ یو۔''

زاویہ سے جملہ مکمل نہیں ہو رہا تھا، آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں۔ اور پھر وہ ایک دم سے اُٹھی اور دوڑتی ہوئی کیفے ٹیریا سے نکل گئی۔ سب ہی لڑکے لڑکیاں حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے، شازم گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

☆......☆......☆

زاویہ شدید بیمار ہوگئی، ڈاکٹر ڈپریشن بتاتے تھے مگر وجہ نظر نہیں آ رہی تھی، اس پر بے ہوشی کے طویل دورے پڑتے، ذرا ہوش میں آتی تو چیخنے لگتی، نیورو سرجنز اور سائیکا لوجسٹس کے ساتھ مستقل مشاورت چل رہی تھی، سب کی متفقہ رائے یہی تھی کہ زاویہ وقت کے ساتھ ساتھ بہتر ہو جائے گی۔ شازم کو پتا لگا تو دوڑا دوڑا پھوپھو کے گھر پہنچ گیا، ایک مہینہ اس نے زاویہ کے بیڈ کے پاس بیٹھ کر گزارا۔ جب بھی زاویہ کی آنکھ کھلتی، اسے بے حال، نیند بھری آنکھوں بکھرے بالوں کے ساتھ اپنی طرف دیکھتے پاتی اور آنکھیں بند کر کے دوبارہ دنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتی۔ وہ نیند میں بڑبڑاتی، کبھی چیخنے لگتی، نیند ہی میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے۔ ہر آنکھ کھلنے پر وہی آشنا چہرہ اسے نظر آتا، جسے وہ اب نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

''تم یہاں سے دفع کیوں نہیں ہو جاتے۔ کوئی رشتہ نہیں ہے میرا تمہارے ساتھ۔ مجھے نفرت ہے تم سے۔ چلے جاؤ یہاں سے، مت آنا میری زندگی اور میرے راستے میں دوبارہ۔''

زاویہ کے چیخنے کی آواز سن کر احمد حسن دوڑتے ہوئے ساتھ کے کمرے سے آئے تو زاویہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

''پلیز شازم بیٹا۔ میں زاویہ کی زندگی پر کوئی کمپرومائز نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر زاویہ بھی خود چاہے تو۔ ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔''

احمد حسن نے جملہ ادھورا چھوڑا شازم تھکے قدموں سے باہر نکل گیا

☆......☆......☆

زاویہ چھ ماہ بعد یونیورسٹی آئی تو جیسے کسی نے اسے نچوڑ دیا تھا، ہلدی جیسا رنگ اور ویران آنکھوں

والی اس لڑکی میں زاویہ احمد والی کوئی رمق باقی نہ رہی تھی۔ گھر میں بھی چپ چاپ اپنے کمرے میں بند رہتی تھی، لے دے کر ایک بچپن کی دوست فروا تھی جو آ جاتی تو وہ کچھ نہ کچھ اس کا کتھارسس کر دیتی تھی۔ احمد حسن نے اس کی صحت یابی کے بعد اسے یونیورسٹی بھیجنا ہی مناسب سمجھا کہ چلو ذرا ماحول بدلے گا تو ذہن بھی بدلے گا، شازم کوشش کرتا کہ زاویہ کا سامنا نہ ہو۔ روکھے دن اور پھیکی شاموں کے ساتھ زندگی چل رہی تھی۔

زاویہ اب اکثر سوچوں میں ہی گم رہتی، چلتے ہوئے بھی نیندسی کیفیت ہوتی اس کی۔ شازم کے جملے اس کے دل و دماغ میں ہتھوڑوں کی طرح بجتے رہتے، کلاسز سے دل گھبراجاتا تو وہ لائبریری چلی آتی اور کتابوں میں کھو جاتی۔ اپنے گروپ کے لڑکوں کے ساتھ بھی اب وہ کم ہی بیٹھتی تھی، زندگی اس کے لیے ایک ایسا امتحان بن گئی تھی جو نہ چاہتے ہوئے بھی دینا پڑتا ہے۔

''شازم احمد۔ تم نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے اتنا گرا دیا اور اتنی بلندی پر لے جا کر گرا دیا کہ آج میری کرچیاں بھی ہاتھ نہیں آتیں کہ میں خود کو جوڑ ہی لوں۔ تم اپنی زاویہ کو ہی نہ سمجھ سکے، چند ماہ میں مجھ پہ اتنا بڑا بہتان لگا دیا تو کیسے پوری عمر تم جیسے بندے کے ساتھ بتائی جا سکتی تھی۔ دم گھٹتا ہے میرا، تمہارے الفاظ روز مجھے راکھ کر کے ہوا میں اڑا دیتے ہیں۔ میں روز امی ابو کے لیے خود کو جوڑتی ہوں اور روز بکھرتی ہوں۔ میرا پندار، میری زخمی انا، میری خودداری، میرا خود پر یقین مجھے لوٹا دو۔ کتنے جھٹکے سے تم نے مجھے خود سے الگ کیا ہے کہ کچھ بھی تو سلامت نہیں رہا۔''

چلو تم چھوڑ دو مجھ کو

میں واپس لوٹ جاتی ہوں

تمہیں منزل مبارک ہو

نیا ساتھی مبارک ہو

مگر پھر اے مرے ہمدم

مجھے اتنا تو بتلا دو

کہ واپس کس طرف جاؤں؟؟؟

کہاں سے ساتھ لائے تھے

مجھے اتنا تو سمجھا دو

اگر ایسا نہیں ممکن

تو مجھ کو اس طرح توڑ دو

کہ میں یکسر بکھر جاؤں

بھٹکنے سے تو بہتر ہے

تمہارے پاس مر جاؤں۔!!

تمہارے پاس مر جاؤں۔!!

زاویہ احمد کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔

☆......☆......☆

''یار یہ زاویہ آج کل لفٹ نہیں کروا رہی، کیا پتا کہاں رہتی ہے، اتنی مشکل سے لائن پر لائے تھے۔'' مدثر نے کتاب کے صفحے پلٹتے ہوئے کہا۔

''اور کیا یار، تمہاری قسم، میں تو جی۔ جی کر کے اور نظریں جھکا جھکا کر مرنے کو ہو گیا تھا، پر ہے کہاں آج کل بیوٹی۔''

عاشر نے قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''ارے یار دفع کرو، خود ہی لوٹ آئے گی، لڑکوں کے بنا گزارہ کہاں ہے آج کل کی لڑکیوں کا، ویلیو بڑھانے کے لیے غائب ہوئی ہوگی، پلٹ کے آنا تو ہمارے ہی پاس ہے، اتنی شریف زادی ہوتی تو لڑکوں سے چپک کے بیٹھنے، ہنسنے مسکرانے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔ ورنہ پھر تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی۔''

شاہد نے مدثر کی کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''شاہد، خبردار جو زاویہ پر کوئی نظر رکھی تو، سمجھ رہا ہوں تمہارا یہ اندازِ دلبرانہ، زاویہ صرف میری ہے یار۔''

عاشر نے شاہد کی طرف انگلی کرتے ہوئے ٹوکا۔

''ارے غلطی ہو گئی پرنس، بھابھی ہے ہماری تو وہ، اب خوش، ارے تیرے ہی دم سے تو گروپ میں رنگینی ہے، تو اسائنمنٹ اور نوٹس بنا بنا کر نہ دے تو

کون پھنسے اس پنجرے میں۔ اڑتی چڑیا پنجرے میں بند کرلی۔ ہو میں نے اک لڑکی پسند کرلی۔''

شاہد نے لہک لہک کے پڑھا تو ایک زور دار قہقہہ بلند ہوا۔

''عاشر یار، ایک بات تو ماننی پڑے گی۔ لڑکیاں تو بہت ہیں مگر یار جو فگر زاویہ کا ہے نہ۔ قسم سے جان نکال لیتی ہے۔ جسم ہے کہ مقناطیس۔ نظریں ہٹنا بھول جائیں۔''

مدثر نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اوباشانہ لہجے میں کہا۔

''او چھوڑ یار زاویہ کو۔ وہ تو گھڑے کی مچھلی ہے، جب چاہیں گے ہاتھ ڈال لیں گے، تو حمنیٰ کا بتا، کیا بنا۔ دیکھ شرط لگائی تھی تو نے۔ ایک ہفتے میں گھیر کے گروپ میں نہ لایا تو سب کو ٹریٹ دینا ہوگی۔''

شاہد نے عاشر کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے میرے بے صبرے یار۔ اسے بھی جلد پھنسا ہی سمجھو۔ ہم نے تو اس خوش اخلاقی اور شائستگی کی چھری سے عبایا اور حجاب والیوں کو ذبح کرڈالا، یہ حمنیٰ تو ٹھہری جینز شرٹ، برگر اور سینڈوچ والی ماما زگرل۔ یہ تو آئی سمجھو۔''

عاشر نے فضا میں دبوچنے والے انداز میں مٹھی بند کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یار ویسے ہم ہیں خوش قسمت۔ خدا شکر خورے کو شکر دے ہی دیتا ہے، ہمیں تو پڑوس کی پریم گلی بھی نہیں جانا پڑتا، یہیں سپلائی پوری ہوجاتی ہے۔''

شاہد نے مسکراتے ہوئے کراچی یونیورسٹی کی طرف اشارہ کیا۔

''صاحب جی ملک شیک۔''

کیفے ٹیریا کے ویٹر نے ڈسپوزل گلاس نما کپ سرو کرتے ہوئے مودبانہ انداز میں کہا

ویسے تو لائبریری میں خورد ونوش منع تھا مگر وہ تنظیمی لڑکے تھے، یونیورسٹی کو انہوں نے ذاتی جاگیر بنایا ہوا تھا، اسی وجہ سے سب ہی ان سے گھبراتے تھے۔

''بشیر سنا۔ کیا چل رہا ہے آج کل۔''

عاشر ملازموں سے بن گن لیتا رہتا تھا، اس سے اندر کی کئی باتیں علم میں آجاتی تھیں۔

''سر جی کیا بتاؤں۔ بہت پریشان کیا ہوا ہے زاویہ بی بی نے مجھے۔''

بشیر نامی ویٹر نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کھسیا کر کہا۔

''زاویہ نے۔ اور تمہیں پریشان کیا ہوا ہے۔ کمال ہے جی۔ کمال ہی ہوگیا یہ تو، ابے بھونڈ و شکل دیکھی ہے اپنی۔''

مدثر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''صاحب جی۔ آپ کو تو پتا ہے کہ مجھے لفٹ تو وہ شروع سے کرواتی ہیں۔ ہمیشہ ہنس کر ملتی ہیں، حال احوال بھی پوچھ لیتی ہیں، نرم گوشہ ہے ان کے اندر میرے لیے۔ آج کل جانے کیوں اپ سیٹ ہیں۔ کل کیفے ٹیریا میں کوئی نہ تھا، ادھر ایک ویران گوشے میں تنہا بیٹھی تھیں، میں کولڈ ڈرنک دینے گیا تو مجھے ساتھ والی کرسی پر بٹھا لیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں، میرے کندھے پر سر رکھ کے۔ ایمان سے۔ بڑی مشکل سے میں نے تھپک تھپک کے چپ کرایا۔ مولا قسم۔ سارے ویٹر جل کر کوئلہ ہوئے پھر رہے ہیں مجھ سے۔''

بشیر نے اپنی بات شروع کی تو نان سٹاپ شروع ہوگیا۔

''ابے چل دفع ہو۔ چل کے نہا اور دانت مانجھ کر آیا کر۔ بڑا آیا تو سلمان خان۔'' عاشر نے بشیر کو لتاڑتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

زندگی تلاشتی زاویہ کی آخری پناہ گاہ ان دنوں لائبریری تھی کیونکہ یہ جگہ اکثر ویران ہی ہوتی تھی، وہ لائبریری میں داخل ہوئی تو اس کے کانوں میں مدثر کی آواز پڑی، اس کے پاؤں من بھر کے اور جسم سن ہوگیا، وہ بے اختیار ایک الماری کی اوٹ میں ہوگئی۔

جیسے جیسے اس کے نام نہاد گروپ فیلوز کی گفتگو آگے بڑھتی گئی وہ پتھر ہوتی گئی، اس لمحے اس کا جی چاہا کہ جیسے زمین پھٹے اور اسے اپنی آغوش میں لے لے۔

"اتنی تضحیک۔ اتنی تذلیل۔ اتنا عامیانہ پن۔"

زاویہ کو اپنا آپ کسی سرکس، کسی موت کے کنویں کے سٹیج پر ناچنے والی رقاصہ جیسا لگا کہ جسے ہر تماش بین اپنی ذاتی جاگیر سمجھتا ہے، قابلِ حصول گردانتا ہے، جس کی طرف فحش اشارے کرنا سات سال کا بچہ بھی اپنا حق سمجھتا ہے اور ستر سالہ بابا بھی۔ جس کے لیے کچھ بھی کہہ دو، کوئی ہرج نہیں، کوئی ڈر نہیں۔

"مگر یہ تو یونیورسٹی تھی، پڑھے لکھے، نفیس، سلجھے لوگوں، اشاہذ دماغ پیکروں کا جھرمٹ، جہاں سے قوموں کے سورج ابھرنا تھے۔ یہ کوئی سرکس تو نہیں، یہ کسی طوائف کا چوبارہ بھی نہیں۔ پھر یہاں تماش بین کہاں سے آگئے۔ یہاں نظریں کتابوں، آئیڈیاز کو سراہنے کی بجائے جسموں کو کیوں نوچتی ہیں، یہاں صنفِ نازک سے قدیم یونان، روم جیسا سلوک کیوں رکھا جاتا ہے۔"

زاویہ کا دماغ پھٹنے کو ہوگیا، اس نے بے اختیار الماری کو پکڑ کر خود کو گرنے سے روکا۔

"اگر یہاں آنے والی لڑکی خوش گمانی رکھتی ہے کہ یہ جگہ باہر کی دنیا سے مختلف اور اچھی ہے، یہاں تو سارے اپنے ہیں۔ تو اسے اتنی کڑی سزا تو نہیں ملنی چاہیے اپنی خوش گمانی کی۔"

زاویہ کے ذہن میں ویٹر بشیر کے جملے آئے تو بے اختیار اسے شازم کی باتیں یاد آگئیں۔

"کبھی سنو کہ وہ سب جب مل بیٹھتے ہیں تو تم لڑکیوں کے بارے میں کیسی زبان استعمال کرتے ہیں، شرط لگاتے ہیں تم لڑکیوں پہ وہ، بانٹ رکھی ہیں سب نے اپنی اپنی، جیسے بیوپاری منڈی میں جانوروں کو جانچتا، پرکھتا، تولتا ہے، ایسے تم لوگوں کو نظروں سے نوچتے ہیں یہ تمہارے مودب گروپ فیلو۔ تم لیب انچارج کو سمائل دیتی ہو، کیفے ٹیریا کے ویٹر سے ہنس کر بات کرتی ہو۔ اور تم مجھے کہہ رہی ہو کہ میں تم پہ الزام لگا رہا ہوں۔ زاویہ احمد تم خود عام بننے جارہی ہو۔ سنبھل جاؤ، ابھی وقت ہے۔"

"مجھ سے کہاں غلطی ہو گئی۔ اف مرے خدایا، مجھے معاف کردے۔ کہاں بھول ہوگئی مجھ سے۔ زاویہ احمد ایسی تو نہ تھی کہ کوئی بھی اتنا عام اور سستا کردے اسے۔ کہاں سے زندگی کا صفحہ مڑ گیا مجھ سے۔"

زاویہ کے گھٹنے لائبیریری کے قالین پر جا ٹکے اور سر الماری کی سائیڈ سے لگ گیا۔

"تم غلطی پر ہو زاویہ۔ بلکہ تم نہیں، آج کی ہر پڑھی لکھی لڑکی غلطی پر ہے۔ عورت جب گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتی ہے تو اس کا رویہ انتہائی خشک، روکھا بلکہ بدتمیزی کے قریب ہونا چاہیئے۔"

ایک جانی پہچانی آواز، آشنا جملے اس کے ذہن میں گونجے۔

"ٹھیک کہتے تھے تم شازم۔ میں کتنی نادان تھی، کتنی بے وقوف رہی ہوں میں۔ مجھے معاف کردو شازم۔ میں ہی خود کو حق بجانب سمجھتی رہی اس تمام عرصے۔ مجھے پتا چل گیا ہے کہ تحفظ اور عزت بس اپنا مرد ہی دے سکتا ہے۔" زاویہ کراہی اچانک جیسے روشنی کا جھماکا ہوتا ہے، کہیں سے آگہی کی کرن اس کے دل میں اتری، بے اختیار اس کے اندر سورہ احزاب کی آیت 32 گونجنے لگی۔

"اے نبی ﷺ کی بیویو!! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم پرہیز گاری اختیار کرو تو نرم لہجے میں بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہو وہ کوئی برا خیال کرے، اور ہاں قاعدے کے مطابق کلام کرو۔"

زاویہ وہیں بیٹھے بیٹھے سجدے میں گر گئی، دور کہیں سے موذن کی آواز فضاؤں میں گونجی جو نمازِ ظہر کے لیے پکار رہا تھا۔

"اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ حی علی الصلوۃ۔ حی علی الفلاح۔"

☆☆......☆☆

افسانہ

نسیم سحر

تمہارا ساتھ چاہیے

''جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ ہمارے دور کے عزیز ہیں اور بہت عرصے سے تو ہم ملے بھی نہیں۔ میں نے تو یاسر نواز کو آڈیشن دیا تھا۔ انہوں نے اوکے کر دیا۔ بس جب سے آپ کے سامنے ہوں۔'' سحاب نے اطمینان سے جھوٹ بولا۔ باری جو......

زندگی سے مکالمہ کرتا ایک افسانہ

''ناظرین! آج ہم آپ کی ملاقات ایک نئی اُبھرتی ہوئی اداکارہ سے کرا رہے ہیں۔ جنہوں نے صرف دو سال کے عرصے میں بہت کامیابی حاصل کی اور جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت باصلاحیت بھی ہیں۔ تو آیئے ملتے ہیں سحاب سے۔'' ٹی وی شو کی میزبان نے روایتی انداز میں تعارف کراتے ہوئے سحاب کو آنے کی دعوت دی۔ میرون کڑھائی والا خوبصورت فراک پہنے ایک سائیڈ پر دوپٹا اور ایک سائیڈ پر اپنے کالے لمبے سلکی بالوں کو ڈالے جیسے ہی سحاب آئی خوب تالیاں بجنے لگیں۔ اس نے ہاتھ ہلا کر ناظرین کو ''ویو'' کیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

''جی سحاب کیسا لگ رہا ہے یہ سب اتنا نام، شہرت؟'' میزبان نے سوال شروع کیا۔

''جی اچھا لگ رہا ہے۔'' سحاب نے مختصر جواب دیا۔

''کیا آپ اتنی جلدی یہ سب Expect کر رہی تھیں۔ میرا مطلب ہے بعض دفعہ تو سالوں لگ جاتے ہیں اپنی پہچان بنانے میں۔ پھر بھی بعض فنکار کلک نہیں کر پاتے، مگر آپ نے تو آتے ہی ایسا جادو جگایا کہ راتوں رات اسٹار بن گئیں۔ ہر طرف آپ کا ہی شہرہ ہے۔'' میزبان نے دوسرا سوال پوچھا۔

''جی اللہ کا کرم ہے جس کو چاہے جتنا دے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

''سحاب آپ بہت سادہ مزاج ہیں لگتا ہے آپ کو شوبز کا رنگ ابھی نہیں چڑھا؟'' میزبان کو شاید مزا نہیں آ رہا تھا وہ وہی چلبلی اور بولڈ فنکارہ کی طرح جواب اور حرکتیں سحاب سے Expect کر رہی تھی۔ جیسی آج کل کی دوسری فنکارائیں ہیں۔ انہیں اپنا پروگرام بھی تو ہٹ کرانا ہوتا ہے۔ تیکھے، کٹیلے جواب و ادائیں، بولڈ سا ڈریس پروگرام کی ریٹنگ کو ایک دم بڑھا دیتے ہیں۔ میزبان کو پہلا جھٹکا سحاب کے لباس سے لگا تھا۔ اُس نے نہ صرف فل آستین کا فراک پہنا تھا بلکہ دوپٹا بھی لیا ہوا تھا اور اب باتیں بھی سیدھی سادھی کر رہی تھی۔

''سحاب آج کل تو اداکارائیں اپنا اسٹیٹس، حلیہ اور اسٹائل ایک ڈرامہ یا سیریل ہٹ ہونے کے بعد ہی بدل لیتی ہیں لیکن لگتا ہے کہ ابھی آپ پر شوبز کا ذرا سا بھی رنگ نہیں چڑھا ہے۔''

''جی نہیں۔'' سحاب ہنس پڑی۔ ''میں اگر دس سال بھی رہی شوبز میں تو بھی ایسی ہی رہوں گی مجھے اپنی

تربیت پر فخر ہے۔ اصل میں انسان کے گھر کا ماحول اگر صحیح ہو تو وہ ہر حال اور ماحول میں خود کو درست رکھتا ہے۔'' میزبان اس کے جواب سے ذرا جزبز ہوئی۔

''اچھا یہ بتائیں آپ کو اس فیلڈ میں آنے کا شوق کیسے ہوا؟ کیا بچپن سے تھا؟'' شو دیکھتا باری الرٹ ہوگیا کہ اب کیا جواب دے گی۔

''نہیں بچپن سے تو نہیں تھا۔'' سحاب نے بال پیچھے کیے۔ ''بس ڈرامے دیکھ دیکھ کے لگا کہ میں بھی ایکٹنگ کر سکتی ہوں اور خود کو منوانے کا خیال آیا تو اِس فیلڈ میں آ گئی۔''

''آپ کے گھر والوں نے تو کوئی اعتراض نہیں کیا؟''

''جی نہیں میرے گھر والوں کو مجھ پر اعتماد ہے۔''

''اچھا کچھ اپنے ڈراموں کے متعلق بتائیں۔''

''جی ابھی میرے دو سیریل تو آن ایئر ہیں اور دو پہ ریکارڈنگز چل رہی ہیں۔ وہ بھی جلد ہی آپ لوگ دیکھ سکیں گے۔

''اچھا یہ بتائیں کس اداکار کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟'' باری پھر متوجہ ہوا۔

''کسی کے ساتھ بھی نہیں۔'' سحاب نے اطمینان سے جواب دیا۔

باری نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی یہ اُس کی جھنجلاہٹ کا اظہار تھا۔ رضا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ مگر خاموش تھا یہ سحاب کا پہلا انٹرویو تھا وہ عموماً انٹرویو سے احتراز برت رہی تھی۔ مگر شوبز میں تو یہ لازمی ہوتا ہے اس لیے سحاب کو حامی بھرنی پڑی اور اب وہ میزبان کے روایتی سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

''اچھا سحاب یہ بتائیں کہ ابھی تو آپ نئی ہیں اور شاید آپ کا لمبے عرصے تک رہنے کا ارادہ بھی ہے تو شادی وغیرہ کا کیا پلان ہے مطلب آپ ینگ ہیں، اسمارٹ ہیں، خوبصورت ہیں۔ یقیناً بہت سے لوگ

خواہش مند ہوں گے تو......"

"جی نہیں ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ابھی تو مجھے بہت آگے جانا ہے۔"

اچھا آپ اس فیلڈ میں کس کے توسط سے آئیں ہیں۔" میزبان نے اگلا سوال کیا۔

"سنا ہے مشہور اداکار باری آپ کے کزن ہوتے ہیں؟"

"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں وہ ہمارے دور کے عزیز ہیں اور بہت عرصے سے تو ہم ملے بھی نہیں۔ میں نے تو یاسر نواز کو آڈیشن دیا تھا۔ انہوں نے اوکے کر دیا بس جب سے آپ کے سامنے ہوں۔" سحاب نے اطمینان سے جھوٹ بولا۔

باری جو اُس کے کسی خوبصورت سے جواب کا منتظر تھا۔ اُس نے بے حد تپ کر ٹی وی آف کر دیا اور پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ رضا نے اُس کے خراب موڈ کو اگنور کرتے ہوئے دوبارہ ٹی وی آن کر دیا تھا کہ اُسے تو سحاب کا پورا انٹرویو دیکھنا تھا۔

☆......☆......☆

ارے یہ ہمارے گھر میں میراثی کہاں سے پیدا ہو گیا۔" تائی اماں نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو چچی سمیت سب ہی ہنس پڑے۔

"پتا نہیں کس پر چلا گیا۔ خاندان میں تو دور دور تک کوئی ناچنے گانے والا نہیں۔"

"ارے بھابی رہنے دیں بچہ ہے بڑا ہو گا تو خود ہی چھوڑ دے گا اور ویسے بھی ناچنا گانا تھوڑی ہے، وہ تو اداکاری کرتا ہے۔" چچی نے بھتیجے کی حمایت لی۔

"لو اور سنو!" تائی نے سب کو باری باری دیکھا۔ "یہ سب ایک ہی تو چیزیں ہیں ناچنا، گانا اداکاری کرنا۔"

"نہیں اماں اداکار جو ہوتا ہے نا وہ ڈرامے میں اداکاری کرتا ہے اور جو ناچ......" ثمن کی بات ادھوری رہ گئی وہ جو اماں کو سمجھانے چلی تھی اماں نے وہیں لتاڑ دیا۔

"بس چپ کر بھائی کی حمایتی مجھے سبق پڑھا رہی ہے، خبردار جو آئندہ کسی نے اُس کی حمایت کی۔" تائی نے سب کو خبردار کیا اور سب نے خاموشی میں ہی عافیت پائی۔

☆......☆......☆

جمیل احمد اور شکیل احمد دونوں بھائی تھے اور ایک ڈبل اسٹوری گھر میں اوپر نیچے مقیم تھے جمیل احمد بڑے تھے ان کے تین بچے تھے۔ بڑا بیٹا باری پھر ثمن اور آخر میں حمزہ، شکیل احمد کے بھی تین بچے تھے۔ بڑی سحاب، پھر رحاب اور آخر میں بھائی روحیل، سب عرصے سے مل کر رہ رہے تھے۔ شکیل احمد اوپر کے پورشن میں تھے مگر ان کے بچے سارا دن نیچے ہی تایا کے گھر میں کھیلتے کودتے رہتے۔ باری کو بچپن سے ہی اداکاری کا شوق تھا وہ اکثر شیشے کے سامنے کھڑے ہو کہ مختلف اداکاروں کی نقلیں کرتا رہتا اور اسکول میں بھی ایسے پروگراموں میں خوب حصہ لیتا۔ گھر میں بھی وہ پیچھے لان کی طرف سب کو جمع کر کے اُن کو نقل اُتار کر دکھاتا اور سارے بچے خوب تالیاں بجاتے۔ تائی اماں کو اس کی یہ حرکتیں ایک آنکھ نہ بھاتیں۔

"ارے یہ بھانڈ کیوں میرا بیٹا بن گیا۔ اِدھر آ کم بخت ابھی نکالتی ہوں تیرے اندر سے محمد علی اور شاہد کو۔" تائی چپل لے کر کھٹاک سے باری پر پھینک دیتیں جسے وہ کیچ کر کے وہیں لان میں پھینک کے گھر سے بھاگ جانا اور پیچھے تائی کلس کر رہ جاتیں۔ پھر جب تائی کا غصہ ٹھنڈا ہوتا تو سحاب چپکے سے باری کو بتا دیتی اور وہ گھر آ جاتا اور آ کے سیدھا ماں کے گلے میں جھول جاتا تو تائی بھی مسکرا دیتیں۔

"میرے بغیر تم کچھ بھی نہیں اگر میں تائی کو نہ مناؤں تو وہ تمہیں کبھی معاف نہ کریں۔" وہ باری سے کہتی۔

"ہونہہ بھول ہے تمہاری وہ میری ماں ہیں صرف وقتی غصہ ہوتا ہے اُن کا۔" باری کھٹ سے جواب دیتا۔

"جی نہیں تمہاری ہر غلطی پر پردہ ڈالتی ہوں اگر تائی کو بتا دوں تو تمہیں کھڑے کھڑے نکال دیں۔" سحاب نے جتایا۔

"یہ خوش فہمی دل سے نکال دو سوچ ہے تمہاری۔" باری اُس کے سر پر چپت لگاتا باہر نکل گیا۔ یہ سچ تھا وہ باری کی ہر غلطی کو تائی سے چھپا لیتی وہ اسکول میں پیریڈ مس کر دیتا۔

دوستوں کے ساتھ گھومتا، مگر وہ تائی کو نہ بتاتی، بلکہ تائی کو منا بھی لیتی تھی۔ اس کو تو باری ہمیشہ سے ہی اچھا لگتا تھا۔ مگر باری کو تو اُس سے چڑ تھی ہونہہ چمچی کہیں کی۔

☆......☆......☆

اسکول سے نکل کر کالج اور پھر یونیورسٹی پہنچنے تک باری کافی منجھ چکا تھا۔ یہ اداکاری کا شوق اُس کے ساتھ ہی پروان چڑھا تھا۔ گھر میں بغیر بتائے وہ اسٹیج بھی کرنے لگا۔ خوش شکل تھا، اسمارٹ تھا اس لیے ٹی وی یہ پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ پھر جب اس کا پہلا ڈرامہ ٹی وی پہ آیا تو تائی ناراض ہوگئیں۔ مگر جب رشتہ داروں نے فون کر کر کے تعریفیں کیں اور مبارک دی تو تائی مان گئیں اور اُن کو منانے میں سحاب کا ہی ہاتھ تھا۔

''دیکھیں تو سہی آپ کا بیٹا کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔'' اس نے اُن کا رُخ ٹی وی کی طرف کیا تو اُن کو بے ساختہ ہی بیٹے پہ پیار آ گیا۔

''ارے بھئی اب زمانہ بدل گیا ہے پہلے جو پیشے برے سمجھے جاتے تھے آج کل لوگ انہی میں پیسہ، نام اور عزت کما رہے ہیں۔ پھر جوان اولاد کو کیسے روکا جا سکتا ہے۔ یہ آج کل کی پڑھی لکھی نسل ہے۔ ہمیں اِن کے ساتھ ہی چلنا ہے۔'' تایا نے بھی تائی کو سمجھایا تو انہیں بھی قائل ہونا پڑا تھا۔ سحاب نے چپکے سے باری کو فون کر کے بتا دیا۔

''آ جاؤ تائی مان گئیں۔'' باری جو ماں کے ڈر سے دوست کے گھر بیٹھا ہوا تھا۔ فون سنتے ہی گھر کی طرف چلا اور آتے ہی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''آئی ایم سوری اماں۔'' تائی نے اُس کے سر کو سہلایا اور مسکرا دیں۔

''مجھے بتا تو دیتا۔'' اور باری نے اماں کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔

☆......☆......☆

باری جو بچپن میں ہی سحاب کو اہمیت نہ دیتا تھا اب اسٹار بن کر تو بالکل ہی بیگانہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ اِس کو اِس مقام تک پہنچانے میں سحاب کی مورل سپورٹ ہی سب سے زیادہ رہی تھی۔ مگر اس نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ بچپن کی بات اور تھی اب تو سب بڑے ہو گئے تھے۔ سحاب اور ثمن BS کر رہی تھیں۔ رحاب کالج میں تھی اور حمزہ اور روحیل اسکول میں تھے۔ سحاب اب بھی باری کا خیال رکھتی تھی۔ مگر اب وہ نہ جانے کیوں سحاب سے چڑنے لگا تھا۔

''ارے میری فائل کہاں گئی۔'' وہ مختلف درازیں دیکھ رہا تھا۔

''پتا نہیں صاحب جی۔'' رشیدہ نے ڈسٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

''صفائی تو تم ہی کرتی ہو نا۔'' اس نے ماسی کی کلاس لینا شروع کی۔

''کہاں رکھی ہے بتاؤ وہ ایگری منٹ کی فائل ہے مجھے ابھی لے کر جانا ہے۔''

''جی صاحب وہ آپ کے کمرے کی صفائی تو میں کرتی ہوں پر وہ چیزیں وغیرہ سحاب بی بی ہی دیکھتی ہیں۔'' ماسی نے ڈرتے ڈرتے اُس کی جانب دیکھا۔

''جاؤ بلا کے لاؤ اُسے۔'' باری نے غصے سے کہا۔ ماسی نے فوراً دوڑ لگائی۔

''ہاں کیا ہوا؟'' لائٹ پنک ٹراؤزر سوٹ میں سحاب آتی نظر آئی وہ شاید نہا کے آئی تھی۔ لمبے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔

''تمہیں کتنی بار کہا ہے میری چیزوں کو نہ چھیڑا کرو تم کیوں گھستی ہو میرے کمرے میں آخر؟'' باری کا غصہ عروج پر تھا۔

''میں اگر سنبھال کے نہ رکھوں نا تو تمہیں کبھی زندگی میں نہ ملیں چیزیں جیسے تم کمرے کا حشر کر کے جاتے ہو لگتا ہے یہاں دنگل ہوا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے الماری سے فائل نکالی اور اُس کے ہاتھ پر پٹخی۔

''یہ لو ذرا آنکھیں کھول کے دیکھ لیا کرو۔''

''ہونہہ!'' باری نے فائل لی اور کمرے سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

"BS کے بعد تمہارا کیا پروگرام ہے آگے کیا کرو گی؟" فریال نے سحاب سے پوچھا۔ وہ دونوں اس وقت اپنے ڈپارٹمنٹ کے باہر بیٹھی ہوئی تھیں۔

"اوں پتا نہیں ابھی کچھ سوچا نہیں۔" سحاب نے لاپروائی سے چنے پھانکتے ہوئے کہا۔

"شادی وادی کا تو ارادہ نہیں جناب کا۔" فریال نے شوخی سے اُسے چھیڑا۔

"شاید۔" سحاب ہنس پڑی۔

"اوہو۔" فریال نے آنکھیں مٹکائیں۔

"ہاں بھئی جب اتنا ہینڈسم بندہ گھر میں موجود ہے تو پھر کیا ضرورت ہے نوکری شوکری کی۔ اچھا یہ بتاؤ اس نے تمہیں کچھ کہا بھی؟" فریال کے لہجے میں تجسس تھا۔

"کیا؟" سحاب کا سوال تھا۔

"ارے بھئی کوئی ڈائیلاگ وغیرہ مطلب بھئی اداکار بندہ ہے تو رومانس بھی ایسے ہی کرے گا نا۔"

"نہیں ایسا کچھ نہیں۔" سحاب کو دو دن پہلے کی بات یاد آئی۔

"ارے کیوں کچھ نہیں بھئی ایک ہی گھر میں رہتے ہو اور پھر بھی کچھ نہیں ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔" فریال کو حیرت تھی۔

"پتا نہیں یار۔" سحاب نے نظریں چرائیں۔

"چلو یار بھی کبھی کچھ لوگ اپنے احساسات اپنے دل کے اندر بھی چھپا کر رکھتے ہیں۔ شاید باری بھی ایسا ہی ہے۔" فریال نے اُسے تسلی دی۔ تبھی سحاب کو یاد آیا کہ مس فرزانہ کا پیریڈ شروع ہونے والا ہے۔ وہ کتابیں سمیٹتے ہوئے کھڑی ہو گئی جبکہ فریال نے بھی اُس کی پیروی کی تھی۔

باری اب ٹھیک ٹھاک کما رہا تھا۔ شہرت و دولت اُس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اُس کے ڈرامے کافی کامیاب جا رہے تھے اور وہ رشتہ دار جن سے کافی کافی عرصہ ملاقات نہیں ہوتی تھی اب اکثر و بیشتر آنے لگے تھے۔ ان میں سے کچھ جن کی جوان لڑکیاں تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح تائی اماں کی نظروں میں اُن کی بیٹی سما جائے اور تو اور ایک محلے کی رشتہ کرانے والی بھی خوب آنے لگی تھی اور جب آتی لڑکیوں کی تصویریں تائی اماں کے آگے ڈھیر کر دیتی۔

"آپ جس پر ہاتھ رکھیں گی وہی آپ کی بہو بنے گی۔" اُس دن ایک رشتہ دار خاتون آئی بیٹھی تھیں۔ جب رشتہ کرانے والی نے اماں کے آگے تصویر رکھی۔

"ہاں بھئی ماشاءاللہ باری تو اب خوب کما رہا ہے۔ پھر کب کر رہی ہو اُس کی شادی۔" صفیہ بیگم نے اماں سے کہا۔

"میری مانو تو جلد کر دو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ڈرامے والی پھنسا لے۔"

"ہاں سوچ تو میں بھی رہی ہوں اس بار وہ گھر آئے تو اُس سے بات کروں کوئی رسم ہی ہو جائے تا کہ سب کو پتا چل جائے ورنہ تو جب دیکھو کوئی نہ کوئی رشتہ بتانے چلا آتا ہے۔" اماں نے رشتہ کرانے والی کو تصویر واپس کرتے ہوئے کہا۔

"اے تو کیا لڑکی دیکھ رکھی ہے تم نے؟" صفیہ خالہ حیران تھیں۔

"دیکھنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو بچپن سے گھر میں ہے۔" تائی اماں ہنس کر بولیں۔

"کون؟" صفیہ خالہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

"ارے سحاب اور کون؟" تائی نے جواب دیا اور چچی کے سینے میں رُکی ہوئی سانس بحال ہو گئی۔ ویسے اُن کو پہلے ہی یقین تھا کہ سحاب ہی باری کی دلہن بنے گی کہ وہ اپنی تائی کی لاڈلی بھی تو بہت تھی۔

وہ سحاب سے بہت پیار کرتی تھیں اب جبکہ انہوں نے خود ہی سب کے سامنے کہہ دیا تھا تو پھر تو شبے کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ چائے لاتی سحاب نے جب یہ سُنا تو اُس کے لبوں پر بھی شرمیلی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"وہ بچپن سے باری کے ساتھ کھیلی ہے اُس کو سحاب سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔" تائی نے حتمی رائے

دی صفیہ خالہ کی مایوسی دیدنی تھی۔ پھر اُن سے زیادہ بیٹھا نہ گیا اُن کے جاتے ہی تائی اور چچی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرادیں۔

☆......☆......☆

کچھ دنوں سے شوبز کے لوگوں میں چہ مگوئیاں ہورہی تھیں۔ باری اور ایک ماڈل کے درمیان افیئر کی۔ وہ دونوں اکثر ساتھ نظر آنے لگے تھے۔ ماڈل نئی تو نہیں تھی مگر وہ بیچ میں کچھ دنوں کے لیے منظر سے ہٹ گئی تھی اور اب دوبارہ سے شوبز کی دنیا میں آگئی تھی۔ باری کو وہ اچھی لگی تھی۔ اسمارٹ اور اسٹائلش، بات ایسے کرتی کہ سننے والا (اگر باری جیسا ہو) متاثر ہوجاتا۔ وہ بھی باری سے متاثر لگتی تھی اس لیے باری کے پہلی دفعہ ہاتھ بڑھانے پر اُس نے فوراً اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ باری کی وجہ سے اُسے دو کمرشل بھی مل گئے تھے۔ اب وہ دونوں اکثر ساتھ نظر آنے لگے۔ باری اُس کے حوالے سے سنجیدہ ہونے لگا تھا کیونکہ گھر میں اماں بھی اُس کی شادی کے لیے سوچنے لگی تھیں۔

ابھی اُن دونوں کی الگ الگ شوٹ چل رہی تھیں۔ باری کا ارادہ تھا اُن سے فارغ ہوکے وہ اماں سے اِرج کے حوالے سے بات کرے گا۔ اُسے یقین تھا کہ اماں انکار نہیں کریں گی اِرج ہے ہی اتنی پیاری، اُس کے تصور میں اِرج کا حسین سراپا گھوم گیا۔

☆......☆......☆

باری شوٹ سے کچھ دنوں کی فراغت پر گھر آیا ہوا تھا۔ وہ جب بھی باہر سے آتا تو سب کے لیے ہی کچھ نہ کچھ لے کر آتا۔ گھر میں ہوتا تو سب بہن بھائیوں کو قصے سناتا، شوٹنگ کی باتیں بتاتا۔

''اُف بھائی آپ کو کتنا مزہ آتا ہوگا نا اتنی ساری جگہوں پر گھوم لیتے ہیں وہ بھی مفت میں۔'' یہ رحاب تھی جسے گھومنے کا بہت شوق تھا۔ باری مسکرا دیا۔ وہ سب اُسے گھیرے بیٹھے تھے۔

''بھائی اب کے آپ شوٹ پر باہر جائیں نا تو مجھے بھی ساتھ لے جایئے گا۔'' حمزہ نے اپنے مطلب کی بات کی۔

''جی نہیں ایسے ہی فالتو لوگوں کو تھوڑا لے جاتے ہیں۔'' ثمن نے چڑایا۔

''ارے بھئی کیوں تنگ کررہے ہو جاؤ اپنے اپنے کام کرو مجھے باری سے بات کرنا ہے۔'' تائی اماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو سب ایک ایک کرکے نکل گئے۔ اماں بیڈ پر بیٹھ گئیں تو باری اُن کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

''اماں آپ کا بے حد شکریہ آپ میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔ میری ضرورت کی ہر چیز کمرے میں موجود ہوتی ہے۔'' باری اماں کے ہاتھ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''ارے بیٹا میں کہاں رکھتی ہوں یہ سب تو سحاب کرتی ہے۔'' اماں نے اُس کی غلط فہمی دور کی۔

''سحاب مگر کیوں؟'' باری چونکا۔

''لو بیٹا اِس میں حیرانی کی کیا بات ہے وہ تو بچپن سے ہی تمہارا خیال رکھتی آرہی ہے۔'' اماں نے یاد دلایا۔

''بلکہ پورے گھر کو وہی دیکھتی ہے سچ میں بڑی محنتی اور پیاری بچی ہے۔''

''ہاں وہ ٹھیک ہے بچپن کی بات اور تھی اب اچھا نہیں لگتا۔'' باری نے کچھ روٹھے پن سے کہا تو تائی اماں نے ٹھٹک کر اُسے دیکھا۔

''کیا اچھا نہیں لگتا بھئی آخر اُس نے ہی سنبھالنا ہے یہ سب۔'' انہوں نے دل ہی دل میں پریشان ہوکر جیسے اُسے جتایا۔

''مگر کیوں اماں؟'' باری نے سوال کیا۔

''کیا کیوں؟ کیسی بات کررہے ہو باری میں نے سوچا ہے کہ ابھی تم گھر میں ہو موقع اچھا ہے کوئی رسم کرلیتے ہیں۔ ورنہ تو پھر تم چلے جاؤ گے۔ کافی دنوں سے گھر میں کوئی خوشی بھی تو نہیں کی۔'' تائی نے اپنا پروگرام

بنایا۔ باری گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

''رسم؟'' کس کی رسم، کس کے ساتھ؟ اماں آپ کیا کہہ رہی ہیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔''

''تمہاری اور سحاب کی۔'' اُس سے زیادہ اماں حیران تھیں۔

'واٹ۔'' باری اچھل پڑا۔ اماں میں اُس سے شادی کروں گا جس کو بات کرنے کی تمیز نہیں۔ کوئی مینرز نہیں۔ اماں یہ آپ نے کیسے سوچا۔''

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا BS کر رہی ہے۔ خوبصورت ہے سلیقہ مند ہے۔ پورے خاندان میں سب سراہتے ہیں اسے اور تم اُسے گنوار کہہ رہے ہو۔'' اماں کو رنج ہوا۔ مگر اماں میں ایسی لڑکی سے شادی کروں گا جو میرے ساتھ Move کر سکے۔'' باری نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''کیا کر سکے؟ اماں کو سمجھ نہیں آیا۔''

''اماں جو میرے ساتھ باہر چل سکے۔'' باری نے وضاحت دی۔

''ہاں تو کیا وہ لنگڑی ہے جو ساتھ چل نہیں سکتی۔ پڑھی لکھی ہے جیسے چاہو گے بن جائے گی۔'' اماں نے حتمی بات کی۔

''نہیں اماں میں سحاب سے شادی نہیں کر سکتا۔'' باہر سے گزرتے سحاب کے قدم اپنے نام پہ رُک گئے وہ کھانے کے لیے بلانے آئی تھی۔ باری تو شروع سے ہی ضدی تھا اُس نے بھی دوٹوک بات کی۔

''تم کسی اور کو پسند کرتے ہو؟'' اماں نے مشکوک انداز میں سوال کیا۔

''ہاں ایک لڑکی ہے میں سوچ ہی رہا تھا آپ سے بات کروں آپ نے خود ہی ذکر نکال دیا۔ لیکن ابھی تو میں مصروف ہوں۔ اگلے ڈرامے کی شوٹ کے لیے شاید باہر جانا پڑے تو پھر واپسی پہ ملواؤں گا۔'' باری نے اپنا پروگرام اتنے اطمینان سے اماں کو بتایا گویا وہ اپنے کسی ڈرامے کی بات کر رہا ہو۔ وہ ویسا ہی تھا ضدی اور ہٹ دھرم۔ اماں ڈوبتے دل سے بس اُسے دیکھتی رہ گئیں جبکہ سحاب کو اپنے چار سو ایک بہت عجیب سا اندھیرا ابھرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

''ہوں تو یہ تم ہو باری مجھے تو اندازہ ہی نہ تھا کہ تمہارے دل میں میرے لیے جگہ ہی نہیں میں جس بیزاری کو تمہاری چھیڑ چھاڑ سمجھا کرتی تھی۔ وہ تو واقعی میرے لیے تمہارا سرد اور خشک رویہ تھا۔'' وہ مسلسل خود کلامی کیے جا رہی تھی۔ بیڈ سے ٹیک لگائے بچپن سے لے کر آج تک کے رویے میں تو اُسے باری کی محبت تو ڈھونڈنے سے ہی نہیں مل رہی تھی، اُس نے ایک طویل سانس لی۔

''او کے مسٹر باری دیکھتے ہیں۔ کون کس کے ساتھ چل سکتا ہے۔'' اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔

☆......☆......☆

''کیا ہوا؟ کہاں لیے جا رہی ہو۔'' فریال اُس کے ساتھ تقریباً بھاگتے ہوئے بولی۔ وہ جو کلاس ختم ہوتے ہی اُس کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی جانب تیز تیز چل رہی تھی۔ کچھ نہ بولی۔

''آخر ہوا کیا ہے؟ بس چپ کرو ابھی خود ہی پتا چل جائے گا۔'' اُس نے ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور دونوں بیٹھ کر روانہ ہو گئیں۔ Lron Lion کا دفتر دیکھ کر فریال ہکا بکا رہ گئی۔

''یہاں، مگر کیوں؟'' فریال کا سوال تھا وہ پھر بھی کچھ نہ بولی۔

''ایسی احمقانہ حرکتوں سے باز رہو۔'' فریال نے بہت اُلجھ کر اُسے سمجھایا۔ مگر وہ ہنوز خاموش تھی۔ ''اُس کو سزا دینے کے چکر میں تم خود کو کیوں پریشانی میں ڈال رہی ہو۔ تمہیں پتا ہے نا یہ کیسی دنیا ہے یہاں تمہارے ہمارے جیسی شریف لڑکیاں نہیں چل سکتیں۔'' فریال نے پھر اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بے فکر رہو مجھے اپنی حفاظت کرنا آتی ہے۔'' اُس نے پہلی بار زبان کھولی اور پھر آڈیشن دینے اندر چلی گئی۔

☆......☆......☆

بیٹا میں جانتا ہوں کہ تم ایک مضبوط اور بہادر لڑکی ہو اور ویسے بھی آج کل ٹی وی پر اچھے گھرانے کی لڑکیاں

آ رہی ہیں۔ لیکن پھر بھی تمہیں تائی اماں کی اجازت لینی ہوگی۔ ابو نے اجازت دیتے ہوئے، اُسے جب تائی اماں سے بات کرنے کو کہا تو وہ تلخی سے مسکرادی۔ جانتی تھی کہ وہ کبھی منع نہیں کریں گی۔ انہوں نے ابھی باری کے انکار کا کسی سے ذکر نہیں کیا تھا لیکن انہیں پتا تھا کہ سحاب یہ بات جان چکی ہے۔ باری اپنی شوٹنگز کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔

''بیٹا تم بھی۔'' تائی نے بے بسی سے اُسے دیکھا۔

''ہاں تائی اماں آپ جانتی ہیں نا لوہے کو لوہے کے ذریعے ہی کاٹا جاتا ہے۔'' اُس نے اُن کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''آپ بے فکر رہیں۔'' اُس کی آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔

''ٹھیک ہے بیٹا خوش رہو۔'' تائی اماں نے نم آنکھوں سے اُسے گلے لگا کر گویا اجازت دے دی۔

قسمت نے ساتھ دیا۔ آڈیشن کے بعد ہی اُسے دو ڈراموں میں چھوٹے کردار میں کاسٹ کرلیا گیا۔ اِن ڈراموں میں اُس کی پرفارمنس دیکھ کر اُسے ایک سیریل کی آفر ہوگئی اور ساتھ ہی کمرشل بھی ملنے لگے پھر تو وہ Over Night اسٹار بن گئی۔ ایک نیا تروتازہ چہرہ جلد ہی عوام میں مقبول ہوگیا۔ وہ ہر آفر قبول نہیں کررہی تھی۔ بس دیکھ بھال کے اور اچھے ڈائریکٹرز کے ساتھ کام کرنے لگی۔ اُس نے اپنی روٹین بنالی تھی وہ صرف شام کے 6 بجے تک کام کرتی تھی اور اِس کے علاوہ غیر ضروری طور پر کہیں بھی اپنا وقت نہ گزارتی۔ نہ ہی کسی پارٹیاں وغیرہ اٹینڈ کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ اِس سے فالتو باتیں کرتے ہوئے سو بار سوچتے تھے۔

☆......☆......☆

باری سال بھر سے باہر تھا۔ ایک سیریل کی پوری شوٹنگ باہر ہی ہورہی تھی اور اس کے علاوہ کچھ دوسرے ڈراموں کے بھی چند سین جو باہر شوٹ ہونے تھے وہ بھی ساتھ ہی مکمل کروا رہا تھا اور دوستوں کے ساتھ گھومنے کا بھی پروگرام بن گیا تھا۔ اب جو واپس آیا تو ماحول ہی کچھ اور تھا شوبز میں ایک نئی اداکارہ کے چرچے تھے۔ وہ جس پارٹی میں گیا وہاں 'سحاب' کی خوبصورتی اور اُس کی صلاحیتوں کے ذکر ہی ہورہے تھے۔ سحاب کے نام سے وہ چونکا تو تھا مگر پھر کندھے اُچکا دیے کہ بھلا وہ کیسے ہوسکتی ہے۔ اُس نے دل ہی دل میں اُس کا تصور کیا۔ مگر جب ٹی وی پہ دیکھا تو حیران ہی رہ گیا۔

''اماں یہ سب کیا ہے؟'' وہ گھر آتے ہی بگڑا۔

''کیا ہے۔'' اماں نے اُلٹا اُس سے سوال کردیا۔

''یہ۔'' اُس نے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا جہاں سحاب کا کمرشل آرہا تھا۔

''ارے یہ اپنی سحاب ہے پہچانا نہیں۔'' تائی اماں نے خوشی سے کہا۔ سحاب کی امی بھی بیٹھی تھیں انہیں باری کا انداز برا تو لگا مگر جب تائی خود دفاع کے لیے موجود تھیں تو انہیں کچھ کہنے کی بھلا ضرورت ہی کیا تھی۔

''اماں میری دفعہ تو آپ نے بہت بُرا بھلا کہا تھا بلکہ مجھے مارا بھی تھا اور اب......؟ اب کیا ہوا؟'' باری حیران تھا۔

''تیرے لیے بھی تو اُسی نے راہ ہموار کی تھی نا۔ تو اب اُسے کیسے منع کردیتی بچی کا شوق ہے کرنے دیا۔'' تائی کا اطمینان قابلِ دید تھا۔

''مگر اماں مجھے یہ پسند نہیں۔'' باری نے آہستہ سے کہا۔

تُو کون ہوتا ہے پسند کرنا یا نہ کرنے والا، اللہ سلامت رکھے اُس کے ماں باپ کو وہ ہم ہیں اُسے کسی اور کی اجازت کی ضرورت نہیں ہمیں اپنی بچی پر پورا اعتماد ہے کیوں ثمینہ۔'' انہوں نے چچی کو دیکھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کچھ خفگی سے باری کو دیکھا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

☆......☆......☆

ایک ہی فیلڈ میں رہتے ہوئے اُس کی ملاقات سحاب سے بہت کم ہوتی تھی۔ دونوں ہی اپنی اپنی شوٹنگو

میں بزی رہتے تھے اور اتفاقاً جو کبھی آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو وہ مسکرا کے نکل جاتی۔ اتنی سیدھی سادھی لڑکی اتنی اسٹائلش بھی ہوسکتی ہے۔ باری حیران تھا۔

''ہونہہ، مجھے کیا اتنا میک اپ تو کسی گدھی پر بھی کیا جائے تو وہ بھی اچھی لگے گی۔'' اُس نے جھنجلا کے سوچا وہ عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ شاید اُسے اتنی تیزی سے آگے بڑھتے دیکھ کر وہ پریشان ہوگیا تھا۔ وہ یہ بھی توقع کررہا تھا کہ وہ اس سے کسی نہ کسی حوالے سے ضرور مدد مانگے گی کیونکہ وہ شوبز میں نئی تھی۔ ڈائریکٹرو پروڈیوسرز سے بات کرنا۔ کس نئے پروجیکٹ کو سائن کرنا ہے، کس کو نہیں، کچھ اداکاری کے اسرار ورموز لیکن انہیں بھئی وہ تو لگتا تھا کہ پیدائشی فنکارہ ہے۔ ایک دو مرتبہ کے سمجھانے پر ہی سمجھ لیتی اور صرف اچھے ڈائریکٹرز (جن کا نام وشہرت اچھی تھی) کے ساتھ ہی کام کررہی تھی۔ شوبز کے حلقوں میں اُس کی شہرت اچھی تھی۔ لوگ اُس کا نام عزت سے لیتے تھے اور اس کی یہ ریپوٹیشن جیسے باری کے دل کو ایک اطمینان سا دے رہی تھی لیکن کیوں؟ وہ خود بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

☆......☆......☆

باری کی جس ماڈل سے دوستی تھی سحاب بھی اُس کو دیکھ چکی تھی اور اُس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات بھی اِس کو حاصل ہوگئی تھی۔ اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ پہلے بھی اُس کا ایک اسکینڈل بنا تھا جس کو اخبار نے خوب اُچھالا تھا تو بھی وہ کچھ عرصے کے لیے منظر سے غائب ہوگئی تھی اور اب بات دب جانے پر دوبارہ آ گئی تھی۔ شوبز کی دنیا میں تو یہ چلتا رہتا ہے۔ اِس لیے یہ کوئی اچھنبے کی بات نہ تھی۔ آتے ہی اُسے باری جیسا ابھرا ہوا اداکار کا ساتھ مل گیا جو سپر ہٹ جا رہا تھا۔ باری کے توسط سے وہ مختلف کمرشلز بھی کرنے لگی۔ باری کو وہ استعمال کررہی تھی دوبارہ سے اپنی جگہ بنانے کے لیے اور باری اُسے محبت سمجھ رہا تھا۔ سحاب سمجھ چکی تھی کہ وہ لڑکی باری سے کبھی شادی نہیں کرے گی۔ مگر یہ بات باری کو کب سمجھ میں آتی ہے، سحاب اُس وقت کا انتظار کررہی تھی۔

☆......☆......☆

سحاب کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جارہی تھی اور باری سے اُس کا رویہ ہنوز بہت سرد سا تھا۔ تب باری نے سوچا کہ آج وہ اِرج سے بات کرکے جلدی ہی شادی کرلے گا کہ سحاب کو جلانے کا اِس سے اچھا طریقہ کوئی اور نہ تھا۔ اسی ارادے سے وہ اُس دن اِرج کے گھر چلا آیا۔ جہاں وہ پہلے بھی آچکا تھا یہاں اِرج اکیلی رہتی تھی۔ بقول اُس کے والدین باہر ملک میں تھے۔ وہ جب وہاں پہنچا تو اندر سے قہقہے کی آواز سُن کر رُک گیا۔

''اوکم آن میرا شادی وادی کا کوئی ارادہ نہیں، ابھی تو میں لائف انجوائے کروں گی اور بڑی اسکرین میرا خواب ہے۔'' اِرج کی آواز سنائی دی۔

''مگر وہ بیچارہ تو تمہارے عشق میں ڈوب چکا ہے۔'' یہ ماہین تھی اِرج کی دوست جس سے وہ باری کو ملوا چکی تھی۔ جواب میں اِرج کا قہقہہ بلند ہوا۔

''احمق ہے وہ سمجھتا ہے کہ میں اُس کی بیک ورڈ فیملی میں رہوں گی نا بابا یار یہ خاندانی قسم کے لڑکے نا قسم سے بیویوں کے ساتھ عجیب سا برتاؤ کرتے ہیں اور بھئی میں تو آزاد فضاؤں میں اُڑنا چاہتی ہوں۔'' اِرج کا جواب باری کو اچھی طرح سمجھا گیا تھا کہ وہ بیوقوف بن چکا ہے۔ پہلے اس کا دل چاہا کہ اِرج کو کھری کھری سُنا دے پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ تیز تیز قدموں سے واپس پلٹ گیا۔

☆......☆......☆

چند دنوں سے باری کچھ اُلجھا اُلجھا تھا۔ جسے اماں نے محسوس کرلیا۔

''کیا بات ہے بیٹا کچھ پریشان ہو، کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' اماں رات کو کھانے کے بعد اُس کے کمرے میں آ گئیں آج کل وہ جلدی گھر آرہا تھا۔

''نہیں اماں کچھ نہیں ٹھیک ہوں بس کام کی تھکن ہے۔'' باری نے جماہی لی۔

''اس لیے تو کہہ رہی ہوں بیٹا شادی کرلے زندگی

میں آرام وسکون کے لیے ساتھی کا ہونا بہت ضروری ہے وہ تُو نے کہا تھا نا کہ کوئی لڑکی ہے تو بیٹا مجھے ملوا اُس سے تا کہ بات کو آگے بڑھاؤں۔'' اماں نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ہاں اماں ٹھیک ہے آپ کوئی گھریلو سی لڑکی دیکھ لیں۔ میں تیار ہوں۔'' اُس نے تو آہستہ سے کہا مگر اماں بے ساختہ چیخ پڑیں۔

''کیا؟ گھریلو، مگر تجھے تو گھریلو لڑکیاں پسند نہیں تھیں اور اُس کا کیا ہوا جس سے تو ملوانے والا تھا۔'' اماں نے بھی آج اُس کو زچ کرنا تھا۔

''نہیں اماں وہ بس! آپ چھوڑیں نا۔ آپ بس خود کوئی دیکھ لیں۔'' باری سے کوئی جواب نہیں بن رہا تھا۔

☆......☆......☆

''سحاب! اماں نے بھائی کے لیے رشتہ دیکھ لیا۔'' ثمن نے اُسے اطلاع دی وہ جو ابھی آئی تھی اور مرر کے سامنے کھڑی ہو کے میک اپ اُتار رہی تھی۔ کوئی نوٹس لیے بغیر اپنے کام میں لگی رہی۔

''صفیہ خالہ کی بیٹی انجم سے۔'' ثمن نے بات پوری کی۔

''کیا ہوا تمہیں بُرا نہیں لگا؟''

''مجھے کیوں بُرا لگے گا۔'' سحاب حیران ہوئی۔

''واقعی۔'' ثمن نے کُریدا۔

''نہیں بھئی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ اپنے کام میں لگی رہی۔ ثمن اُسے گھورتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

''مسٹر باری آپ کا دماغ ابھی درست نہیں ہوا ہے۔ تھوڑا وقت اور لگے گا۔'' وہ مرر میں خود کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

☆......☆......☆

''صفیہ تو بہت خوش تھی۔ اماں آج ہی فیصل آباد سے واپس آئی تھیں۔ انجم سے باری کی بات پکی کر کے۔'' چچی کا منہ بنا ہوا تھا باقی سب بھی خاصے اَپ سیٹ لگ رہے تھے۔ ثمن کو ویسے ہی سحاب پر غصہ آ رہا تھا کیونکہ سحاب نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔

Enough Is Enough

دیوں کو بام پر رکھنے سے پہلے
ہوا سے دستخط لینے پڑیں گے
کہ اب تا حشر یہ جلتے رہیں گے

شاعرہ: طلعت اخلاق احمد

''اماں میں ایک دفعہ انجم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' بالآخر باری نے خاموشی توڑی۔ اماں نے خاموشی سے نمبر پکڑا دیا۔

☆......☆......☆

''ارے ماشاء اللہ باری میاں آئے ہیں، آؤ آؤ بیٹا۔'' صفیہ خالہ کی تو خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ ایک سو بیس گز کا سنگل اسٹوری گھر خالہ کے متوسط ہونے کی گواہی دے رہا تھا لیکن صاف ستھرا تھا۔ صحن میں ڈھیر سارے پودے گھر والوں کے ذوق کی گواہی تھے۔ باری صحن سے ہوتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا جسے بہت سادگی سے ڈیکوریٹ کیا ہوا تھا۔

خالہ کے دو بیٹے تھے بڑا بیٹا کسی فرم میں ملازمت کر رہا تھا اور چھوٹا جو ابھی میٹرک میں تھا اور بیچ میں انجم تھی۔ جس نے انٹر کیا تھا اور اب BS میں داخلہ لے رہی تھی۔ جبکہ خالو کا انتقال ہو چکا تھا۔ خالہ بہت محبت سے ملیں۔ پھر انہوں نے انجم کو آواز دی جو چائے لے کر فوراً آ گئی۔ چائے پی کر خالہ کھانے کا انتظام کرنے کچن میں چلی گئیں۔ انہیں معلوم تھا باری انجم سے ملنے اور بات کرنے آیا ہے۔ آخر زندگی بھر کا معاملہ تھا اور وہ ایسے ہی تو نہیں بغیر دیکھے راضی ہو جاتا۔ انجم شوخ میرون کلر کے خاصے ماڈرن لباس میں تھی اور اُس کے بال بھی کٹے ہوئے تھے۔ لمبے لمبے ناخن کیوٹکس سے مزین تھے اور ہلکا میک اپ بھی کیا ہوا تھا وہ اچھی تو لگ رہی تھی۔ مگر باری کو اُسے دیکھ کر کافی حیرت کا احساس ہوا۔ خالہ تو یہ ظاہر کرتی تھیں کہ جیسے وہ گھر میں بھی برقع پہن کر رہتی ہے۔

''تم نے میرے ڈرامے تو ضرور دیکھے ہوں گے؟'' باری کو پہلا سوال یہی سوجھا۔
''جی، جی کیوں نہیں میں تو بہت شوق سے آپ کے ڈرامے دیکھتی ہوں۔'' وہ فوراً بولی۔
''اچھا آگے پڑھنے کا ارادہ ہے نا۔'' باری نے دوسرا سوال پوچھا۔
''امی تو کہتی ہیں پر میرا دل نہیں لگتا۔ آپ کو بتاؤں مجھے بھی بہت شوق ہے ڈراموں میں کام کرنے کا۔ جب مجھے پتا لگا کہ آپ سے میری شادی ہو رہی ہے، بس اُف کیا بتاؤں۔ آپ مجھے بھی کام دلوائیں گے اپنے ساتھ۔'' وہ جوش سے بولی۔
''میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔'' باری کھڑا ہو گیا۔
''ارے بیٹھیں نا ابھی تو......''
اس کی بات ادھوری رہ گئی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر جا چکا تھا۔

☆......☆......☆

گھر میں کافی خاموشی ہو گئی تھی۔ سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ باری کے انکار کا سب کو معلوم ہو گیا تھا۔ مگر کسی نے کوئی سوال نہ کیا۔ تائی اماں بھی چپ تھیں۔ باری عجیب چڑچڑا سا ہو گیا تھا۔ بات بات پر اُلجھ جاتا۔ آج کل سحاب بھی گھر پر ہی نظر آ رہی تھی۔ مگر زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی۔ خاص کر جب باری گھر میں ہوتا تھا۔ اس دن شام کو باری گھر آیا تو ڈرائنگ روم میں کچھ مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اُن کو دیکھ کر پیچھے کی سائیڈ سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رات کو کھانے پر بھی وہ نہیں نکلا۔ پھر جب رات کو اُس کو کافی کی طلب ہوئی تو اپنے کمرے سے نکل کے کچن کی طرف جا ہی رہا تھا جب لاؤنج میں اماں اور چچی جان بیٹھی نظر آئیں۔
''اِس وقت۔'' وہ حیران ہوا پھر وہ عبدل کو کافی کا کہہ کر لاؤنج میں ہی آ گیا۔
''کیا اماں آپ لوگ اِس وقت یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ خیریت؟'' وہ کہتا ہوا اماں کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''ارے بیٹا سحاب کا ایک بہت اچھا رشتہ آیا ہے۔'' چچی خوشی سے بولیں۔
''شام کو ہی آئے تھے وہ لوگ، ماشاء اللہ ہر طرح سے بہترین رشتہ ہے اور وہ لوگ جلدی کر رہے ہیں تو بس ہم یہی بات کر رہے تھے کہ سب اتنی جلدی کیسے ہوگا۔'' چچی کی تو خوشی سے آواز کھنک رہی تھی۔ باری ایک دم خاموش ہو گیا۔ اماں بھی ذرا خاموش ہی تھیں۔ باری بنا کچھ کہے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆......☆......☆

دو دن سے وہ گھر پر تھا۔ مگر کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اماں کو تشویش ہوئی تو وہ اس کے کمرے میں جا پہنچی۔ وہ خاموشی سے لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔
''کیا ہوا بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اماں نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا دو دن سے تو کام پر بھی نہیں جا رہا۔'' وہ خاموش رہا۔
''باری کیا اُلجھن ہے؟'' اماں نے اُس کی خاموشی کچھ کچھ سمجھ رہی تھیں۔
''کچھ نہیں اماں۔'' مختصر جواب دے کر وہ پھر چپ ہو گیا اماں نے کھوجتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا پھر بولیں۔
''سحاب کی شادی سے پریشان ہو؟''
''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔
''مجھ سے تو جھوٹ بول رہا ہے خود سے بھی کب تک جھوٹ بولے گا؟'' اُس کے خاموش رہنے پر اماں پھر بولیں۔
''کیا کروں اماں؟'' وہ اُٹھ بیٹھا، ایک ذرا سی حماقت کی اتنی بڑی سزا۔
''کیا! ذرا سی حماقت؟'' اماں نے گھورا۔
''تمہاری اتنی سی حماقت کی سزا سب بھگت رہے ہیں۔''
''اب کیا ہوگا۔'' اس نے بہت بے بسی سے ماں کو دیکھا۔
''کچھ نہیں، وہ ہے ہی اتنی اچھی کہ اُسے کوئی انکار

کر ہی نہیں سکتا تھا جہاں جائے گی گھر آباد کرے گی یہ تو ہم ہی بدنصیب تھے کہ گھر میں ہیرا چھوڑ کر باہر پتھر تلاش کر رہے تھے۔'' اماں نے طنز کیا۔

''تم نے اپنی دونوں پسند کو دیکھ لیا نا کہ وہ تم سے نہیں تمہاری حیثیت پر فدا تھیں۔''

''اماں اب تو بتائیں نا کیا کروں۔'' وہ اُسی لجاجت سے بولا۔

''کچھ نہیں کر اب کیا ہوسکتا ہے۔ ثمینہ نے ہاں کر دی ہے یہ کوئی مذاق نہیں ہے تم نے میرے ساتھ ساتھ سب کو مایوس کیا تھا۔ بچپن سے ساتھ کھیلے تھے۔ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم سحاب کو منع کرو گے ارے وہ تو تم پر جان چھڑکتی تھی ہر ہر موقع پر اُس نے تمہارا ساتھ دیا۔ تمہاری خاطر اُس نے اپنی مرضی اور فطرت کیخلاف اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کی اور ڈراموں میں کام کیا اور تم نے کیا کیا۔'' اماں تھوڑی دیر رُکیں۔

''تم نے ایک نہیں دو مرتبہ اُس پر کسی دوسرے کو فوقیت دی۔ شکیل اور ثمینہ کو بھی انتہائی دکھ ہوا تھا اُن کی لاڈوں پلی بیٹی کو تم نے منع کیا سوچو انہیں کتنا دکھ ہوا ہوگا۔'' اماں نے آج دل کی بھڑاس نکال ہی لی۔ باری شرمندہ سر جھکائے سب سُن رہا تھا۔

''اماں پلیز کچھ کریں نا میں نہیں رہ سکتا اُس کے بغیر۔'' اُس نے ماں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''بیٹا لڑکیوں کے دل بہت نازک ہوتے ہیں۔ آخر تم نے ایسا کیوں کیا؟'' اماں بھی آج سارے حساب لینے پر تلی ہوئی تھیں۔ اُس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ پھر گویا ہوئیں۔

''میرا خیال ہے گھر کی مرغی دال برابر والا معاملہ تھا۔ تم نے اُس کے ظاہری حلیے کو اہمیت دی حالانکہ وہ ذہین تھی۔ ہر کلاس میں فرسٹ آئی تھی۔ سگھڑ تھی۔ گھر کا کام وہ یوں چٹکیوں میں کر لیا کرتی تھی اور پھر جب شوبز میں گئی تو دیکھ لو کیسے عزت سے اور اتنے کم عرصے میں اُس نے نام بنایا۔'' اماں جب شروع ہو جاتیں تو پھر انہیں روکنا خاصا مشکل ہوتا تھا۔

''اماں اب بتائیں نا کیا کروں وہ پھر جھنجلا کر بولا۔''

''ہم تو کچھ نہیں کر سکتے اب جا کے خود ہی اُس سے بات کر لے اگر وہ مان جائے۔'' اماں نے اُسے راستہ دکھایا تھا۔

☆......☆......☆

لان میں ایزی چیئر پر بیٹھی وہ سحاب ہی تھی۔ اُس کے لمبے کالے سلکی بال کرسی کی پشت سے نیچے لٹک رہے تھے۔

''اوں ہوں۔'' باری گلا کھنکارنے لگا۔ مگر وہ ویسے ہی بیٹھی رہی۔

''سحاب۔'' اُس نے مخاطب کیا اور سامنے آ گیا۔ اُس نے نظریں اٹھائیں۔

''اُف کیا نہیں تھا اُن آنکھوں میں، غصہ، اُداسی، شکوہ، تنفر، باری گڑبڑا گیا ایک لمحے کو پھر ذرا سنبھل کے بولا۔

''کیسی ہو؟'' جواب میں اُس کی حیران آنکھیں دیکھ کر باری پھر سٹپٹا گیا۔ یہ وہی سحاب تھی جس پر وہ بچپن سے رعب جماتا آیا تھا۔ جس کو اُس نے کبھی نظر بھر کے نہ دیکھا۔ نہ اہمیت دی اور آج اُسے دیکھ کر باری کی بولتی بند ہو رہی تھی۔ وہ اتنے اعتماد سے اُس کے سامنے کھڑی تھی کہ باری کی ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ اُس سے کچھ کہہ سکے۔

''کچھ کہنے آئے تھے؟'' بالآخر سحاب نے ہی اُس کی مشکل آسان کی۔

''آئی ایم سوری سحاب میں نے تمہیں بہت ہرٹ کیا۔'' وہ دل سے شرمندہ کھڑا تھا۔

''واؤ مسٹر باری کہیں آپ یہ کسی ڈرامے کی ریہرسل تو نہیں کر رہے ہیں۔'' اُس نے تپانے والا جواب دیا۔

''کہاں آپ اور کہاں معافی وہ بھی مجھ سے، میں تو ایک عام سی لڑکی ہوں نا، رائٹ۔'' اس نے ادا سے بال جھٹکے۔

''نہیں تم عام نہیں، بہت خاص ہو۔'' وہ فوراً بولا۔

''اچھا یہ انکشاف آپ پر کب ہوا؟'' اگلا سوال آیا۔

''سحاب پلیز بھول جاؤ سب، میں شرمندہ ہوں۔''

وہ شرمندہ سے لہجے میں بولا۔
''آپ کے لیے کتنا آسان ہے نا یہ سب، جب دل چاہے ریجیکٹ کر دیا۔ جب دل چاہے قبول کر لیا۔ لیکن مائنڈ اٹ۔'' اُس نے تنبیہی انداز میں انگلی اٹھائی۔
''اب یہ حق مجھے حاصل ہے اور آئی ایم سوری مجھے آپ سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' اُس نے یہ کہہ کر رُخ پھیر لیا۔ وہ گھوم کے سامنے آ گیا۔
''سحاب دیکھو ایسا مت کرو میں نہیں رہ سکوں گا تمہارے بغیر۔''
''یہ اچانک کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' میرا خیال ہے ہم اسی گھر میں ساتھ رہ کر بڑے ہوئے ہیں پہلے تو میں آپ کو کبھی نظر نہیں آئی اور اب جبکہ آپ کی جان چھوٹنے والی ہے تو کیا ہو گیا ہے آنکھیں کھولیں مسٹر باری میں وہی سحاب ہوں، جاہل، اَن میرڈ۔'' اُس نے باری کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔
''ٹھیک ہے تم جو چاہو کہو میں سننے کو تیار ہوں لیکن شادی تو تمہاری مجھ سے ہی ہو گی۔'' اُس کے لہجے میں ضد کے ساتھ ساتھ رعب بھی شامل ہو گیا تھا۔
''ہونہہ خوش فہمی ہے جناب کو۔'' سحاب نے بال پیچھے کیے جو ہوا سے لہرا کے چہرے پر آ گئے تھے۔
''اور تمہیں غلط فہمی ہے کہ تم کسی اور سے شادی کر کے چل دو گی اور میں تمہیں آسانی سے کسی اور کا ہونے دوں گا۔'' باری نے زور سے اُس کی کلائی پکڑی۔ سحاب نے کلائی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔
''ہاں تو کیا کرو گے؟'' وہ وہی پرانی والی سحاب لگ رہی تھی۔
''وہ سالا تو جان سے جائے گا ہی لیکن تمہاری بھی خیر نہیں ہو گی۔'' باری نے دھمکایا۔
''کیا؟ کیا کہا؟'' وہ چیخی۔
''ہوش میں تو ہو۔''
''ہاں ابھی تو ہوش آیا ہے شکر ہے بروقت آ گیا ورنہ میں اپنی زندگی کو کھو دیتا۔''
''سحاب تم بچپن سے ساتھ رہیں شاید اسی لیے میں نے تمہیں اہمیت نہ دی۔ تم دوسری چیزوں کی طرح میرے لیے لازمی تھیں مگر شاید میں ضرورت اور محبت میں فرق محسوس نہ کر پایا۔ خوامخواہ اِدھر اُدھر بھٹکا جبکہ میری اصل منزل تو میرے پاس ہی موجود تھی۔'' باری کے منہ سے اپنے لیے یہ الفاظ سننا اُس کی سب سے بڑی خواہش تھی۔
''مگر اب تو وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔'' اُس نے بھی تو ابھی اُس کو تنگ کرنا تھا۔
''کل وہ لوگ تاریخ لینے آ رہے ہیں۔''
''آنے دو زندہ واپس نہیں جائیں گے۔'' باری کو پھر غصہ آیا۔
''میرے ہوتے ہوئے کسی نے سوچا بھی تو اُس کی خیر نہیں۔''
''بڑے ڈائیلاگ بولے جا رہے ہیں۔'' سحاب نے مذاق اُڑایا۔
''یہ ڈائیلاگ نہیں دل کی آواز ہیں۔''
''پہلے کیوں نہیں سنی دل کی آواز۔''
''اب بس کر دو کتنا سوری کراؤ گی آخر کو ہونے والا شوہر ہوں۔''
''ہوں ہوں منہ دھو کے رکھو ابھی شوہر بنے تو نہیں ہو۔'' وہ منہ چڑاتی بھاگ کر سیڑھی پر چڑھی۔
باری نے بھی بھاگ کر اُس کے لمبے بال پکڑ لیے۔
''یاد رکھنا پھر گن گن کے بدلے لوں گا۔'' وہ اُس کو خود سے قریب کرتے ہوئے بولا۔
''وہ...... تائی اماں......'' سحاب نے اپنے بال چھڑاتے ہوئے باری کی پشت پر دیکھا۔ باری نے گھبرا کے بال چھوڑ دیے اور پیچھے مڑ کے دیکھا کوئی نہ تھا لیکن سحاب کا بے ساختہ قہقہہ باری کو بھی ہنسنے پر مجبور کر گیا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

عائشہ خان

چمکیلا بکل

اس کی تو خوشی کی انتہا نہ رہی...... پورے تین سو روپے۔ واہ بکل ڈھائی سو کا آئے گا۔ مطلب کہ پچاس روپے کی کچھ اور چیزیں بھی آ سکتی ہیں۔ وہ دل ہی دل میں حساب لگانے لگی۔ ''تو چل نا بھرا...... میرے ساتھ؟'' وہ ڈرتے ڈرتے محتاط انداز میں......

کبھی کبھی قدرت اس طرح حقیقت فاش کرتی ہے کہ......

شادو کی بے تحاشا ضد کے باوجود اماں نے اس کی پسند کا بکل نہ لے کے دیا۔ پورے دو ماہ سے وہ ضد کر رہی تھی۔ عید کی شاپنگ کے دوران اسے وہ چمکیلا بکل نظر آیا تھا جسے دیکھ کر شادو کا دل مچل گیا تھا مگر وہ اماں ہی کیا جو فضول خرچی پر دھیان نہ دیں۔ بقول اماں کے یہ فضول خرچی ہی تھی جب کہ دیکھا جائے تو اس کی یہ خواہش کوئی ایسی ناجائز بھی نہ تھی سال میں ایک بار تو موقع ملتا تھا اپنی پسند سے کچھ خریدیں، وہ بھی دبئی والے ماموں کی بدولت کہ وہ ہر عید، بقر عید پر چند ہزار اپنی غریب بہن کو منی آرڈر کر دیتے تھے اماں کے کل تین بہن بھائی تھے۔ ایک اماں خود، دبئی والے ماموں، اور ایک خالہ جو کہ انتقال کر گئیں تھیں اور بقول ان کہ یہ مصیبت (خالہ کی بیٹی رجو) کو ہمارے گلے میں باندھ گئی تھیں۔

☆......☆......☆

شکل وصورت میں تو رجو، شادو سے زیادہ خوبصورت تھی۔ شادو کا بھائی شیدا نکما مت کماؤ۔ یا تو سارا دن چارپائیاں توڑتا رہتا یا پھر کھاپی کر محلے کی لڑکیوں کو تنگ کرنے نکل جاتا۔ محلے میں بھی اس کی (ریپوٹیشن) کچھ اچھی خاصی خراب تھی۔ محلے کی دکانوں کے آگے بنے تھلے پر بیٹھ جاتا تا کہ آتی جاتی خواتین کو خوب تاڑ تاڑ کر اپنی آنکھیں سینکے۔ گھر میں بھی اس کا یہی حال تھا کہ بے چاری رجو کا جینا حرام کیا ہوا تھا چھچھورے فلمین گانے گاتے ہوئے

کچھ ایسی معنی خیز نظروں سے اس کو دیکھتا کہ بے چاری ادھر ادھر چھپتی پھرتی خالہ سے شکایت کرنے بے کار تھا۔ وہ ٹھہریں پہلے ہی بیزار، دو چار باتیں اور رجو کے حصے میں آ جاتیں، طعنوں تشنوں سمیت۔

دیکھا جائے تو شیدا نے آوارہ پن اور نکھٹو ہونے میں اماں کا سو فیصد ہاتھ تھا۔ اس سے شہزادے کی طرح برتاؤ کرتیں۔ جس سے اس کا دماغ اور ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ لے دے کے ایک خالو تھے جن کی محنت مزدوری سے یہ گھر چل رہا تھا۔ یا بقرعید پر ماموں کا منی آرڈر۔

☆......☆......☆

روز روز کی اس چمکیلے بکل ایک بحث سے رجو بھی عاجز آ گئی تھی۔ آخر کیا ہے اس بکل میں جو تو اتنا پیچھے پڑی ہے؟ رجو نے پوچھا۔

تو خود دیکھے گی تو دیکھتے رہ جائے گی۔ قسم سے رجو اتنا خوبصورت ہے۔

شادو نے تصوراتی آنکھ سے بکل اپنے بالوں میں لگا دیکھ کر ایک جذب سے کہا رجو نے اس کے شوق کی دیوانگی کو بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔

☆......☆......☆

وہ باہر سے آیا تھا اور شادو کی جانب ہاتھ بڑھا کر بولا۔

لے یہ پیسے لے لے۔ شادو نے خوشی آمیز حیرت سے ان پیسوں کو دیکھا۔ "یہ میرے ہیں انہیں میں لے لوں۔" پیسے مٹھی میں دباتے ہوئے انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ پیسے مجھے دیئے؟ میں لے لوں!

اس کی ناقص عقل میں بات نہ سمائی۔

اپنی پسند کا چمکیلا بکل لے آ...... شیدا تیلی منہ میں گھما رہا تھا۔

اس کی تو خوشی کی انتہاء نہ رہی...... پورے تین سو روپے واہ بکل ڈھائی سو کا آئے گا۔ مطلب کے پچاس روپے کی کچھ اور چیزیں بھی آ سکتی ہیں وہ دل ہی دل میں حساب لگانے لگی۔ تو چل نا بھرا...... میرے ساتھ؟ وہ ڈرتے ڈرتے محتاط انداز میں ملتجی ہو کر بولی۔ شیدا انکار کرنا چاہتا تھا مگر بہن کا خوشی سے چمکتا دمکتا چہرہ دیکھ کر چلنے پر راضی ہو گیا۔ چل تو بھی کیا یاد کرے گی۔

اچھا میں اماں کو بتا کر آتی ہوں وہ خوشی خوشی دوڑی اندر آئی۔

☆......☆......☆

دن ڈھلے وہ لوگ گھر میں داخل ہوئے تھکن کے باوجود شادو مسرور تھی۔ وہ خوشی خوشی اماں ابا کو بکل دکھاتے، رجو کے پاس آ گئی جہاں وہ اپنی قمیض پر کڑھائی کر رہی تھی۔

وہ شیدے کی تعریفوں میں رطب اللسان تھی میرا بھرا دلا کے لایا ہے۔ میرا بھرا اس دنیا کا سب سے اچھا بھرا ہے۔ آج تو وہ زمین آسمان کے قلابے ملانے میں مصروف تھی۔

ہوں۔ رجو نے دل ہی دل میں سوچا تیرا بھائی ہے ناں...... اگر اس کے اصل کرتوت جو تجھ سے پوشیدہ ہیں تجھے معلوم ہو جائیں ناں تو یہ رٹو طوطے کی طرح جو تو پٹر پٹر بول رہی ہے ناں......"

"یہ دیکھو ناں۔" شادو نے اسے خیالوں کی دنیا سے باہر نکالا۔

ہائے شادو...... یہ بکل تو بہت خوبصورت ہے ......شادو تو میری بہن ہے ناں ایک بات مانے گی؟ وہ خوشامدی لہجے میں بولی۔

ہاں ہاں بول...... آج میں اتنی خوش ہوں تو جو بولے گی مانوں گی۔ شادو نے اجازت دی۔

وہ بات یہ ہے ......کل ہے ناں ...... میری سہیلی کی بہن کی برتھ ڈے ٹو ہے۔ تو میں یہ بکل لگا کے چلی جاؤں۔ پہلے وہ اٹک اٹک کہ پھر وہ تیز گام کی سی تیزی سے بول کے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

سچ بالکل خراب نہ کروں گی نہ گم کروں گی......

دیکھ دیکھ یہ میرا جوڑا۔ یہ بکل اس میں میچ ہو رہا ہے وہ لجاعت سے گویا ہوئی تو شادو و مان گئی مگر ہدایت نامہ دینا نہ بھولی دیکھ اماں کو پتا نہ چلے اور نہ گم کرنا نہ توڑنا.....ٹھیک ہے۔ رجو خوش ہو گئی۔

ابا روز صبح جو اپنے کام پر جاتا تو رات کو ہی لوٹتا۔ اس کا ایک ہی رونا تھا یہ جوان لڑکا کب تک چارپائی توڑتا رہے گا، اس کو شرم نہیں آتی میں کب تک اپنی ہڈیوں کو توڑتا رہوں گا، جوان لڑکی گھر میں بیٹھی ہے کل کو اسے بھی بیاہنا ہے...... کہاں سے جہیز کی رقم لاؤں گا!

اس کی کمائی آئے گی تو کوئی بی سی ہی ڈال دو...... اماں بھی ابا کے عتاب سے بچنے کو شیدے کو ایک دو باتیں سنا دیتیں..... کیوں کہ بقول ابا کے تو نے ہی اس لڑکے کو لاڈ پیار میں بگاڑا ہے۔ اور یہ بات سولہ آنے سچ تھی میں روز ایسی دہائیاں سن کر منہ تکیے پر رکھ کر کسی طرح اپنی نیند جاری رکھتا ماں پھر ماں کے زیادہ بڑبڑانے پر ڈھیٹ سنکر باہر کی راہ لیتا۔

☆.....☆.....☆

صبح دیر ہو جائے گی..... ابا جلدی جلدی ناشتہ کرتے ہوئے بولا۔

کیوں اماں نے استفار کیا۔

کام (جیادہ) زیادہ ہے وہ ناشتہ کر چکا تھا جوتے پہنتے ہوئے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد کسی کی فوتگی کی خبر سن کر اماں وہاں چلی گئیں گھر میں صرف رجو اور شادو رہ گئی تھیں۔ رجو اپنی سہیلی کی سالگرہ میں جانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔

دن چڑھے جب وہ اوپر سے سو کر اٹھا تو گھر میں خاموشی محسوس کر کے بولا۔

کیا ہوا اتنی خاموشی کیوں ہے؟

شادو جو جلدی جلدی اس کے لیے پراٹھا پکا رہی تھی۔

"ابا کام پہ اماں نسرین خالہ کے سسرال گئی ہیں فوتگی ہو گئی ہے۔"

اس نے کن اکھیوں سے رجو کے بند دروازے کی جانب سرسری سا دیکھ کر پوچھا۔

سن یہ رجو کہاں ہے؟

وہ کمرے میں ہے شادو نے اس کے سامنے ناشتہ رکھتے ہوئے جواب دیا۔

☆.....☆.....☆

مغرب کے ٹائم گھر میں وہ داخل ہوا تو ہو کا عالم تھا۔ بجلی بھی گئی ہوئی تھی۔...... وہ وہیں بنے چھجے کے نیچے پڑے پلنگ پر لیٹ گیا۔ کمرے سے کھٹکے کی آواز آئی اور کسی کے قدموں کی چاپ سنی وہ کروٹ بدل کر مڑا تو وہ اسے باہر جاتی دکھائی دی، اندھیرے میں کچھ سمجھ نہیں آیا پر اسے وہ بالوں میں لگا چمکیلا بکل دکھائی دے گیا...... اوہ...... اس کا مطلب شادو پڑوس میں گئی ہے اور رجو اپنے کمرے میں اکیلی ہے اس کے ذہن نے شاطرانہ منصوبہ تیار کیا۔

وہ جلدی اٹھا باہر دروازے کی کنڈی لگائی اور کمرے میں داخل ہوا اور وہ نجانے الماری میں کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کے کمرے کے دروازے کی کنڈی لگائی اور اپنے ناپاک عزائم کے لیے آگے بڑھا۔

بجلی نہ ہونے کے باعث کمرے میں کافی اندھیرا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا اس سے پہلے کہ وہ چیختی اس نے اپنا بھاری ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا تاکہ وہ چیخنا چلانا نہ کرے۔

ہوں..... آج کیسے بچے گی! ہمیشہ بچ جاتی تھی ناں.....! وہ کمینی ہنسی ہنسا اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بولتا ایک جھٹکے سے لائٹ آ گئی اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں..... کیوں کہ وہاں رجو نہیں شادو کھڑی تھی۔ اس کی بہن۔

☆.....☆.....☆

افسانہ

کاشی چوہان

روح دیکھی ہے کبھی

بچپن کی باتیں بھلا ذہن کیسے بھول سکتا ہے۔ ساحرہ اُس پر قطعی اعتماد نہیں کرتی تھی اور پیار، پیار تو ایک پہیلی تھا۔ جسے کوئی بھی اب تک بُوجھ نہ پایا تھا۔ یادیں حصار میں لے لیں......

محبت کی ایک اَن کہی، افسانے کی صورت

آج کتنے دن بعد اسے دیکھا تھا اور شاید اس سے ملنا تھا اسی لیے جس سمت جانا نہیں تھا، قدم خود بخود مجھے اُس اَور لے گئے تھے۔

تیز دھوپ ہو یا برف سی سردی...... اُس کا سرخ چھاتا ہمیشہ ہی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ سر پر پرپل اسکارف ہمیشہ کی طرح چمک رہا تھا۔

اس کا سرخ چھاتا اور پرپل اسکارف جیسے اس کے ٹریڈ مارک بن گئے تھے اور وہ دور ہی سے پہچانی جاتی تھی۔

مجھے اسے دیکھ کر بے چینی سی ہونے لگی تھی اور اسے اس طرح مجھے ستا کر مزا آتا تھا۔ وہ مجھ دیکھ کر ہولے سے مسکرائی اور بس گالوں پر ڈمپل پڑ گئے۔ میری بے چینی ہوا ہوگئی۔ وہ میرے پاس اور پاس اور بالکل پاس آگئی تھی۔

''ہیلو، کیا حال ہیں۔'' مسکراتے ڈمپل کے ساتھ احوال پوچھا گیا تھا۔ جواب میں مَیں بھی مسکرایا۔

''چلو، تمہیں چائے پلاتی ہوں۔'' اس کے مسکراتے ڈمپل اور گہرے ہوگئے تھے اور میں کسی قوت کے زیرِ اثر اس کے ساتھ ہولیا۔ اس کی کسی بات سے ''اب'' تو انکار ممکن ہی نہ تھا۔

اس کے گھر کے پاس پہنچ کر میرے قدم سست ہوگئے تھے، مگر وہ اسی شان سے چل رہی تھی۔

☆......☆

''ممی...... دیکھو کون آیا ہے؟'' اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور اس کی اندر سے آتی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔

''کون آیا، بے بی۔'' آنٹی کی آواز آئی تھی اور اب وہ کچن سے ڈرائنگ روم ہی کی طرف آرہی تھیں۔

''اوہ مائی گاڈ! توم...... اتنا دن کے بعد...... کِدر تھا توم ینگ مین۔'' اُن کا محبت میں لپٹا سوال میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور ان کے آگے سر کو جھکا دیا اور پھر آنٹی نے میری پیشانی چوم لی۔

''بیٹھ جاؤ...... سِٹ ڈاؤن مین، اتا اتا دن بعد توم آتا تو ہم کو اچھا بالکل نہیں لگتا...... آیا کرو توم...... توم آتا تو اَم کو اچھا لگتا۔'' آنٹی اپنے انداز میں باتوں میں مصروف تھیں اور میں...... میں تو بس اُسے ہی سوچ رہا تھا۔ ڈھونڈ رہا تھا...... کدھر چلی گئی تھی۔ یقیناً اب اس نے چائے اور کوکیز کے ساتھ ہی آنا تھا۔

☆......☆

کبھی روح کو محسوس کیا ہے؟
جاگتے جیتے ہوئے دودھیا کہرے سے لپٹ کر سانس لیتے ہوئے اُس کہرے کو محسوس کیا ہے؟
اور پھر وہ دودھیا کہرے میں لپٹی پھر سے میرے سامنے تھی۔ بالکل روح کی طرح کی تھیں وہ دونوں ماں بیٹی۔
بچپن سے ہم لوگ ایک محلے میں رہے تھے۔
بچپن...... جس میں کوئی مذہب اور زبان...... دوستی کے آڑے نہیں آتی۔

''کیوں جاتا ہے تو ان کے گھر کمبخت غیر مذہب ہیں۔''
''اے میں کہتی ہوں اس خبیث کے...... پیر میں بیڑیاں ڈالو...... دین خراب کرے گا اپنا۔''
''ہاتھ دھو...... پیر دھو...... وضو کر، گھسا رہتا ہے اُن کے گھر۔ کتے، بلیاں بھی ساتھ کھلاتے ہیں۔ چُوما چاٹی الگ کرتے ہیں، نجس جانوروں کے ساتھ۔''
دادی اماں تو سمجھاتے سمجھاتے خود روح ہو گئیں، لیکن میرا ساحرہ کے گھر جانا نہیں چھُوٹا اور نہ ہی دوستی، کہ

دوستی اگر بچی ہو تو بھلا کب ہار مانتی ہے، مگر مجھے ایسا لگتا تھا کہ ہم دونوں کے درمیان صرف دوستی ہی نہیں اور بھی کچھ ہے۔ ساحرہ ہمیشہ ہی مجھے اہمیت دیتی تھی۔ میری ہر بات بغیر کہے ہی جان لیتی تھی۔ ہمارا تعلق دل سے جڑا تھا اور پھر جیسے یہ تعلق دل سے نکل کر روح میں سما گیا۔

بچپن گزر گیا......اور جوانی نے آہستہ روی سے ہمیں اپنے حصار میں لے لیا۔ آنٹی سعیہ ہمیشہ ہی مجھے ”Man“ کہہ کر مخاطب کرتی تھیں یہی وجہ تھی کہ بچپن سے ہی ساحرہ کے گرد ایک مرد کا آہنی لفظ باندھ کر انہیں ساحرہ کے ساتھ ایک Safety محسوس ہوتی تھی۔ کبھی انہوں نے ہماری دوستی پر اعتراض نہ کیا تھا اور......اور نہ ہی کبھی میری امی نے کوئی اعتراض کیا تھا۔

ابو جان تو دیارِ غیر میں تھے......بس ہمارا ناتا ان سے ڈرافٹ تک ہی محدود تھا۔ باپ کے ہوتے ہوئے بھی میں بغیر باپ کے زندگی گزار رہا تھا...... کبھی کبھی بہت شدت سے اس کمی کا احساس ہوتا مگر خیر......میرے لیے سعد علی ولد زاہد علی ہی کافی تھا۔ یہی نام میرا اچھا تھا......اور پہچان بھی۔

ساحرہ......اس کی نیلی آنکھیں، جب مجھے پوری آنکھوں سے وہ دیکھتی اور گلابی دہکتے گالوں پر ڈمپل پڑتے تو بس......کوئی جادو سا چھا جاتا تھا اور میں ایک ٹرانس میں آ جاتا تھا......اور وقت ساکت ہو جاتا تھا۔

☆......☆

”چائے پیو نا...... بالکل ٹھنڈی ہو گئی......“

ساحرہ نے میرے سامنے دوسرا گرم کپ رکھتے ہوئے کہا اور ٹھنڈا کپ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا آیا تھا۔ میرے سامنے رکھا ٹھنڈا کپ ہمیشہ وہ خود ہی پیتی تھی اور میں اس کی آنکھوں سے جانے کتنے جاموں کے ذائقوں سے سیراب ہوتا تھا اور پھر میں نے بھی بھاپ نکلتے کپ سے منہ لگا دیا۔

”توم چائے پیو اَم ابھی آتا...... تو مارے واسطے Pizza بنائے گا۔“ آنٹی ہم دونوں کو چھوڑ کر کچن میں چلی گئیں۔

چودھویں رات کے برفاب سے اس چاند کو جب
ڈھیر سے سائے پکڑنے کے لیے بھاگتے ہیں
تم نے ساحل پہ کھڑے ہو کے کبھی
ماں کی گیناتی ہوئی کوکھ کو محسوس کیا ہے؟

اور واقعی......بس کچھ محسوس کر کے بھی خود کو سپاٹ کر لینا۔ احساسات سے عاری کر لینا بھی تو کمال ہی ہوتا ہے نا اور ایسے کمال کرنا میری فطرت تھی۔ اب بھی......کنوئیں کے سامنے سے پیاسا لوٹنا۔ آگ ہوتے ہوئے بھی تپش محسوس نہ کرنا...... زندہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کی نفی......اور بھلا کیا کرنا آتا تھا مجھے۔

”برائن آیا تھا کل۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح رازداری سے مجھے یوں بتایا جیسے میں اس کی کوئی رازدار سہیلی ہوں۔ بلکہ اس کی سہیلی ہی تو تھا میں۔ جس سے وہ ہر بات بلا جھجک کہہ دیا کرتی تھی۔ میں نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔

”بٹ یُو نو......میں کیسے......تم خود بتاؤ بھلاؤ کیسے آئی ٹرسٹ ہم۔ سعد علی......ہی اِز آ بیڈ مین......آئی ڈونٹ لائک ہم......بٹ ہی فورس می......“ نیلی آنکھوں میں ہلکی سی نمی نمایاں تھی، لیکن لہجے کا اعتماد برقرار تھا۔ وہ مسلسل اپنی نازک انگلیاں مروڑ رہی تھی اور میں......میں بس اُسے تکتا ہی جا رہا تھا۔

دل تو چاہا کہہ دوں اُسے کہ......تم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میری طرف چلی آؤ......مگر، میں بھلا کیسے کچھ کہتا۔

”ڈونٹ وری......تم پریشان مت ہونا......تم بھی کہو گے کہ اتنے دن بعد ملی تو بھی وہی قصہ لے کر بیٹھ گئی۔ مگر سعد علی یُو نو......ممی تو کبھی برائن کو رونگ نہیں سمجھتیں۔ میں تو بس تم سے ہی یہ سب شیئر کر سکتی ہوں......سوری میں نے تم کو پھر سے بوور (پریشانی) دے دیا......“

ساحرہ بالکل بچپن والی ساحرہ بن گئی تھی۔ بس بچپن میں، میں اس کے بال سہلایا کرتا تھا تو جیسے اُس

کی آدھی پریشانی رفع ہو جاتی تھی۔ مگر اب...... اُسے سن کر ہی جیسے میں اُس کی پریشانی رفع کر رہا تھا۔

مجھے وہ واقعہ یاد آیا جب برائن نے ایک دفعہ کرسمس کے موقع پر ساحرہ کو Humpty Dumpty بن کر ڈرایا تھا اور وہ کتنے دن تک اس کے بڑے سارے سر سے خوفزدہ رہی تھی...... وہ ہمیشہ اسے ڈرایا ہی کرتا تھا۔ پتا نہیں اِس ڈراوے کی محبت سے وہ اپنی کون سی تسکین پاتا تھا مگر...... اُس کا شروع سے ایسا ہی معاملہ رہا اور اب وہ اُسے شادی کے نام سے ڈراتا تھا۔

بچپن کی باتیں بھلا ذہن کیسے بھول سکتا ہے...... ساحرہ اُس پر قطعی اعتماد نہیں کرتی تھی اور پیار...... پیار تو ایک پہیلی تھا۔ جسے کوئی بھی اب تک بُوجھ نہ پایا تھا۔ یادیں حصار میں لے لیں تو مشکل ہی سے پیچھا چھوڑتی ہیں۔ میں اس وقت اس حصار کا حصہ بننے کے لیے قطعی تیار نہ تھا...... میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا ہو گیا...... بیٹھو نا...... ممی تمہارے لیے Pizza بنا رہی ہیں۔ اب وہ کھائے بغیر تم کیسے جا سکتے ہو۔ بیٹھ جاؤ......''

Pizza کی خوش بُو میرے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی مگر...... میں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ پیچھے ساحرہ مجھے دیکھتی ہی رہ گئی اور اب اُس نے مجھے پیچھے سے آوازیں دینا بند کر دی ہیں۔ پہلے وہ مسلسل آوازیں دیتی تھی۔

''رُک جاؤ...... سعد علی! ممی...... دیکھیں وہ چلا گیا...... سعد ممی کال یُو۔ کم آن...... جلدی آؤ۔''

مگر شاید وہ وقت بھی یاد بن گیا تھا۔

☆......☆......☆

''چندا کہاں چلے گئے تھے...... معلوم ہے نا، باہر ہوتے ہو تو میرا دل گھبراتا ہے۔ آج تمہاری دادی کی برسی ہے...... چلو تم فریش ہو جاؤ اور میں نے تمہارے کپڑے یہ ہینگر کر دیے ہیں، پریس کر کے...... او کے...... جاؤ جلدی سے نہا کر آؤ۔''

امی کی باتیں...... ساحرہ کی یادوں سے پیچھا چھڑا رہی تھیں مگر پیچھا چھوڑتی ہیں یادیں......؟؟ یادیں تو عفریت کی طرح جسم و جان پر قابض ہو جاتی ہیں...... اپنا اسیر کر لیتی ہیں...... تنہائیوں میں میلہ لگا دیتی ہیں۔ کالی گھور راتوں میں جگنو کی طرح...... مگر حال میں جینا بھی تو کمال ہے نا...... اور میں تو ایسے ہی کمال کرتا ہوں۔ بے حسی اوڑھ کر میں فریش ہو کر آ گیا۔

''بی بی جی۔'' ناظمہ دادی اماں کی نیاز پر رکھا سوٹ، چپل اور چادر کسی کو دینے جا رہی تھی کہ دروازے سے پلٹی تھی۔

''کیا بات ہے، کوئی ہے کیا دروازے پر......'' امی جان نے میرے ہاتھوں کو ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

''بی بی جی...... سلیمن بُوا آئی کھڑی ہیں......''

''تو...... ارے تو بلاؤ نا...... تم بھی بس...... پتا نہیں ہمیں تین تیرہ کرنے والے ہی نوکر کیوں ملتے ہیں۔ اچھا بھلا پتا ہے کہ وہ اکثر آتی ہیں۔ بُوا کا دل کتنا خراب ہوا ہو گا اس کی حرکت سے۔''

''بُوا ڈرائنگ روم میں آ چکی تھیں۔ حیرت تھی کہ انہوں نے ناظمہ کی حرکت کا بُرا نہیں منایا تھا۔

''سلام بی بی......! آتے ہی پہلا جملہ ادا ہوا تھا۔ میں تھوڑا دور ہو گیا تھا۔ یہ خاتون مجھے بالکل اچھی جو نہیں لگتی ہیں۔

''بُوا! ناظمہ سے غلطی ہو گئی۔ کیا کروں، ملازم پتا نہیں ذہن کہاں رکھتے ہیں کہ دو منٹ کی بات بھول جاتے ہیں۔''

امی نے صفائیاں دینا شروع کر دیں۔ میں اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مجھے یہ باتیں ہضم نہیں ہوتی تھیں۔

☆......☆......☆

میں آج اس حقیقت کا اعتراف کر رہا ہوں کہ ساحرہ میں نے صرف تم سے محبت کی...... اور ہمیشہ کروں گا، مگر کیا کروں مجبور ہوں نا...... چاہ کر بھی اس محبت کو زبان نہیں دے سکتا کہ میری قسمت میں کہاں کہ تم سے اقرار یا انکار کر سکوں...... تمہارے لیے۔ تمہاری خوشیوں

کے لیے، خود کو کھونا، خود کو بھری دنیا سے تنہا، اکائی کر لینا کتنا مشکل کام ہے نا...... مگر میں نے یہ کمال کیا ہے کہ کمال کرنا ہی تو مجھے آتا ہے...... میرے سینے میں بھی دل ہے۔ جس کی ہر دھڑکن میں تم ہی دھڑکا کرتی ہو، مگر تم سے خود کو دور کر لیا ہے......

دل کی دھڑکن بے تال ہے مگر......

اس حال میں بھی زندہ رہنا ایک کمال ہی تو ہے۔

کچھ کمیاں ایسی ہوتی ہیں جو بہ ظاہر بڑی ہو کر بھی زندگی سے بڑی نہیں ہوتی ہیں لیکن ان کمیوں سے زندگی کا پندار اُلٹ پلٹ ہو جاتا ہے...... جیسے کہ میری زندگی......

گھر کے ساحل سے جو بہتا ہے اُسے بہنے دو
ایسے دریا کا کبھی رُخ نہیں موڑا کرتے

تم میری انگلی تھا مو یا میں تمہاری...... بس سفر کرتی رہو۔ میں ایک بے نام منزل...... وہ جزیرہ جسے دریافت ہونا ہے ابھی۔ وہ ساحل جو ابھی آدم زاد کی پہنچ سے دور ہے، مگر یہ سب میں کیسے کہہ سکتا ہوں تم سے...... میں اور تم...... دو الگ مذاہب کے لوگ تو ہیں، مگر دل...... وہ تو کسی مذہب کو نہیں مانتا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں دل، دل ہی رہے گا...... بھلے ہی کسی بھی مذہب کے فرد کا ہو...... مگر انسانیت کے ناتے میں احترام محبت کرتا ہوں۔ اظہارِ محبت نہیں، کہ خدا نے شاید میری لاج رکھ لی ہے......

ساحرہ میرا خدا مجھے خوب جانتا ہے۔

میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں، اس کی گہرائی بھی وہ میرا اللہ جانتا ہے۔ اسی لیے اس نے میرا پردہ رکھ لیا ہے۔

محبت کی کہانی تو بس شروع ہو جاتی ہے۔ اس پر کسی کا اختیار تو نہیں ہوتا نا...... یہ تو ایک جلتی ہوئی تیلی کی طرح ہوتی ہے جو جنگل کو بھسم کرنے کا کمال جانتی ہے...... اور تم کو پتا ہے نا کمال کرنا تو مجھے آتا ہے۔

میں آج سے تمہیں بھلانے کا کمال کرنے لگا ہوں...... تم بھی اپنے رَب سے میرے لیے دعا کرنا اور میرا اللہ تو میرے ساتھ ہے ہی...... دیکھو یہ بھی کمال ہے نا کہ مالک و معبود ایک ہے اور اُسے پکارنے والوں نے اپنے اپنے حساب سے اُسے نام دے رکھے ہیں۔ عبادت اُس کی کرنا ہے لیکن طریقے الگ الگ کر لیے ہیں۔ مسجد، مندر اور کلیسا...... خدا کرے کہ صراطِ مستقیم پر چلنے کا کمال ہر کوئی کرے۔

☆......☆

میں خود سے باتیں کر کے کافی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں آیا تو بُوا کی آواز کانوں سے ٹکرانے لگی تھی۔

''میری میا...... دلہن تم بھی نا کمال باتیں کرتی ہو۔ لو بتاؤ اگر لڑکی عمر میں کچھ بڑی ہے تو کیا ہوا...... ماشاء اللہ شکل صورت میں، تعلیم میں، خاندان میں، ذات برادری میں ہیرا ہے ہیرا...... اےُ میں تو کہوں کہ فوراً سعد میاں کی بات چلا دوں...... بس اگر تمہاری رضا کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں تو بات بھی کر آتی......'' بُوا نے نئے پان کا قیمہ بناتے ہوئے تیزی سے کہا۔

امی کشمکش و پیچ میں مبتلا دکھائی دے رہی تھیں۔

''بُوا...... انہیں سعد کا بتا دیا تھا نا...... کہیں بعد میں کچھ اُلٹا سیدھا ہوا تو......؟'' واہموں میں گھری میری ماں...... مگر میں کیا کہوں......؟

''اےُ ہےُ...... لو بتاؤ...... ماشاء اللہ شکل، صورت نورانی ہے...... قد کاٹھ...... گبھرو ہے گبھرو...... کیا ہوا اگر زبان نہیں...... اور پھر بھلا کس چیز کی کمی رہ جاتی ہے...... عیش کرے گی جو بھی آئے گی۔''

بُوا چلتر پنے سے کہتے ہوئے پان چباتی جا رہی تھیں۔

اِدھر میرا دل......!!

جسم سو بار جلے تب بھی وہی مٹی ہے
روح اِک بار جلے گی تو وہ کندن ہوگی

روح دیکھی ہے؟ کبھی روح کو محسوس کیا ہے؟

کاش میں بے زبان نہ ہوتا تو......

ساحرہ خدا نے میرا پردہ رکھ لیا...... اور بس......

☆......☆

افسانہ

عادل حسین

محبت کا رشتہ

محبت کا نشہ بھی کیا خوب ہوتا ہے۔ شہیر کی رفاقت میں، میں آسمانوں میں اُڑنے لگی تھی۔ بے وجہ سجنے سنورنے کو دل چاہتا تھا۔ روپ میں مزید نکھار آ گیا تھا۔ زندگی زندگی لگنے لگی تھی۔ ایک سرمستی تھی جو وجود کو اپنے حصار میں جکڑے رہتی تھی۔ کھلی آنکھوں سے......

محبت کی مضبوطی سے پیوستہ، ایک بہت خاص محبت نامہ

محبت اتنی کمزور نہیں جتنی شہیر سمجھتے ہیں۔ وہی شہیر جو محبت کی طاقت بیان کرنے میں زمین آسمان ملا دیتے تھے۔

تو کیا اتنی سی بات پر کوئی بھلا یوں بھی کرتا ہے؟ جانے انہوں نے کیسے سوچ لیا تھا کہ میں جدا ہو کر جی سکتی ہوں؟

مجھے دسمبر کی وہ سرد رات آج بھی یاد ہے۔ جب کزن کی شادی کی تقریبات میں ایک انجان شخص سے سامنا ہوا تھا۔ شدید سردی میں جیسے میں بھی قطرہ قطرہ پگھلنے لگی تھی۔ پانچ دنوں میں وہ کون سا پل تھا جو دل نے شہیر کے نام کی مالا نہ جپی ہو۔ آنکھیں اُسے دیکھتیں تو جھپکنا بھول جاتیں۔ گالوں پر کتنے رنگ تھے جو مستقل ڈیرا ڈال چکے تھے۔ بے وجہ مسکرانے کا دل چاہنے لگا تھا۔ زلفیں بادل بن گئی تھیں۔

میں کیسے بتاؤں کہ میرا حال کیا تھا؟ اور اِس کی وجہ صرف ایک ہی شخص تھا شہیر۔ اُس کی شخصیت تھی ہی ایسی کہ کوئی بھی اُس کے سحر میں گرفتار ہو جائے۔ گرفتاری مجھے بھی دینی تھی مگر ہاتھ آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ مجھے محبت ہوگئی تھی۔ نہیں شاید عشق ہو گیا تھا۔ میں جو بچپن سے ہی بہت باتونی واقع ہوئی ہوں۔ اس معاملے میں خلافِ توقع خاموشی کا دامن تھام کر بیٹھ گئی۔ لیکن کزن کی شادی کی رات مجھے احساس ہوا کہ دو آنکھیں مسلسل میرا پیچھا کر رہی ہیں۔ وہی دو آنکھیں جن میں عمر بھر قید ہونے کا سپنا پچھلے کچھ دنوں سے میں مسلسل دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں کے تعاقب نے دل کو زبان دے دی تھی۔ دل دل سے رابطہ کرنا چاہتا تھا مگر لب خاموش تھے۔

پھر اُسی رات نادیہ نے مجھ پر جو انکشاف کیا وہ تو میری دنیا ہی بدل گیا۔ شہیر نے مجھ سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ یعنی میں ٹھیک سوچ رہی تھی۔ شاید شہیر کی دلی کیفیت مجھ سے کچھ مختلف نہیں تھی۔

اگلی شام نادیہ نے ہماری ملاقات کا بندوبست گھر کی چھت پر ہی کر دیا۔

اُس نے جب اپنے ماتھے پر پڑے بالوں کو ہتھیلی سے اُوپر کیا تو لگا دھڑکن رُک جائے گی۔ لب کھولے تو پھول جھڑنے لگے۔ آواز تھی کہ جادو، کانوں میں رَس گھولنے لگی۔ جانے اُس نے مجھ سے کیا کچھ کہا اور کب تک کہا، مجھے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ ہاں یاد تھا تو بس اتنا کہ اُس نے مجھ سے اظہارِ محبت کیا تھا۔ بس ایک ہی جملہ تھا جو میری سماعتوں سے مسلسل ٹکرا رہا تھا۔

''مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے حور! مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے حور!''

اظہارِ محبت کب میرے اقرارِ محبت میں بدلا مجھے یہ بھی یاد نہیں۔ ہاں یاد ہے تو اتنا کہ اُس سرد شام دو دل ایک ہو گئے تھے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

محبت کا نشہ بھی کیا خوب ہوتا ہے۔ شہیر کی رفاقت میں، میں آسمانوں میں اُڑنے لگی تھی۔ بے وجہ سجنے سنورنے کو دل چاہتا تھا۔ روپ میں مزید نکھار آ گیا تھا۔ زندگی زندگی لگنے لگی تھی۔ ایک سرمستی تھی جو وجود کو اپنے حصار میں جکڑے رہتی تھی۔ کھلی آنکھوں سے میں نے اتنے سپنے دیکھ ڈالے تھے کہ شاید ہی کسی محبت کرنے والے نے دیکھے ہوں۔ ہر وقت شہیر کا خیال میرے دل و دماغ پر طاری رہتا تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو شہیر کا سراپا سامنے آ جاتا۔ زلفوں کو باندھنے لگتی تو لگتا اُس کے ہاتھ مجھے روک لیتے ہوں۔

''نہیں حور! کھلی زلفیں تم پر بہت اچھی لگتی ہیں۔'' جانے مجھے کیا ہو گیا تھا اُن دنوں۔

پھر مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں ہمارے پیار کو زمانے کی نظر نہ لگ جائے۔ اور پھر گھر والے......

میرے خاندان میں شادیاں اپنوں میں ہی ہوتی ہیں۔ بڑوں کے اس فیصلے سے اختلاف آج

تک کسی نے نہ کیا تھا تو میں......؟

پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میرا گھر والوں کی مرضی سے شادی کا انکار قیامت لے آیا۔ کون سی سختی تھی جو مجھ پر نہ کی گئی ہو۔ گھر والوں کا ڈرانا مارنے تک پہنچ گیا تھا۔

''محبت بہت مضبوط ہوتی ہے۔'' ایسا شہیر ہی نے تو کہا تھا اور سچ پوچھیں تو سچ ہی کہا تھا۔ میرے اندر مضبوطی اِس محبت نے ہی تو پیدا کی تھی۔ لڑکیاں اکثر کمزور ہوتی ہیں۔ ڈری ڈری، سہمی سہمی، میں بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ مگر یہ محبت ہی تھی جس نے مجھے مضبوط بنا دیا تھا۔ میرا حوصلہ چٹانوں جیسا ہو گیا تھا۔ سختی کرنے والے تھک گئے مگر میں نے ہار نہیں مانی۔

پھر قسمت کی دیوی مجھ پر مہربان ہو گئی۔ گھر والوں کو اپنی جھوٹی ضد سے دستبردار ہونا پڑا۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا اور میں شہیر کے دل کی رانی بن کر اِن کے گھر آ گئی۔

☆......☆......☆

پہلے پہل تو مجھے نئے گھر میں بہت گھبراہٹ ہوتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ میں اپنے اِس نئے ماحول میں سیٹ ہو گئی۔ اس معاملے میں بھی میری مدد شہیر نے ہی کی تھی۔ وہ مجھے پیار سے سمجھاتے کہ دیکھو لوگ محبت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ دنیا میں ہر چیز پیسوں سے مل جاتی ہے مگر محبت نہیں۔ میرے گھر والوں سے بھی تم وہی برتاؤ کرو جو اپنے گھر میں سب سے کرتی ہو۔ دیور کو بھائی اور نند کو بہن بنا کر دیکھو۔ ساس میں ماں تلاش کرو اور سُسر میں باپ کو، تو دیکھو یہ لوگ کیسے تم پر صدقے واری ہو جاتے ہیں۔ دلوں کو جیتنے کے لیے دل دینا پڑتا ہے۔ محبت بہت مضبوط ہے حور! تم محبت کے بل پر دنیا فتح کر سکتی ہو۔''

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ مجھے شہیر کے گھر میں کبھی بھی غیریت کا احساس نہیں ہوا۔ میں سب کے دلوں کو جیت چکی تھی۔

اور شہیر؟ بہنیں کہتی تھیں کہ بھائی غصے کے بہت تیز ہیں۔ کھانے پینے میں بہت نخرے دکھاتے ہیں۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ شہیر نے مجھے اپنی ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا۔ میری محبت کا دم بھرتے اِن کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ اللہ کا کروڑوں بار شکر کہ میرا انتخاب درست تھا۔ مجھے اِن کی محبت میں سبھی کچھ ملا۔ خوبصورت گھر، محبت کرنے والے سچے رشتے، عزت، خوشی اور دنیا کی ہر نعمت بس نہیں ملا تو بچوں کا شور!

یہی تو وہ وجہ تھی جو دوری کا سبب بن رہی ہے۔ مجھے بچے بہت پسند ہیں اور ہر عورت کو ہوتے ہوں گے۔ میری ساس کو بھی تھے۔ پہلے مہینے سے ہر مہینے وہ اِس انتظار میں رہتیں کہ شاید یہ مہینہ اُن کے لیے خوشی کی نوید لے آئے۔ مگر ہر مہینہ پچھلے مہینے کی طرح آتا اور چپ چاپ گزر جاتا۔ پرہیز بھی سارے کر کے دیکھ لیے اور دوائیں بھی۔ مگر جو خدا کو منظور، تو پھر ساس نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ ساس میری ماں تھیں۔ اگر ساس ہوتیں تو بیٹے کو دوسری شادی کا مشورہ یا مجھے بانجھ ہونے کا طعنہ ضرور دے دیتیں۔ میں محبت کے مضبوط ہونے کی دل سے قائل ہو چکی تھی۔

وقت کا کام ہے گزرتے رہنا سو وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔

☆......☆......☆

شہیر مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ یہ محبت ہی تو ہے جو وہ میری بجائے اپنے ٹیسٹ کروا آئے تھے۔ مردوں میں ایسے مرد کم

پائے جاتے ہیں جو اپنی مردانگی کو چیلنج کر بیٹھیں۔ جب خود مطمئن ہو گئے تو پھر میری ضد پر مجھے بھی ٹیسٹ کروا لائے۔ کمی کسی میں بھی نہیں تھی یہ اللہ کا کرم تھا۔ مگر دیر بھی اللہ کی طرف سے ہی تھی۔ پچھلے دو سالوں میں زندگی نے بہت سے موسم دیکھے مگر ہماری محبت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔

یہ بات تو پچھلے دو ہفتوں کی ہے کہ مجھے شہیر کچھ پریشان پریشان سے دکھائی دے رہے تھے۔ میں اسے کام کی زیادتی سمجھتی رہی لیکن پچھلی رات جب اچانک شہیر نے مجھ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں تم مجھ سے علیحدگی لے کر دوسری شادی کر لو۔''

سچ کہوں تو میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔ شہیر ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں۔ اقرارِ محبت والی رات کی طرح مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ جانے علیحدگی کی بات کے ساتھ شہیر نے اور کیا کچھ کہا ہو گا۔ بس یاد ہے تو اتنا کہ انہوں نے مجھے موت کا حکم دیا تھا۔

قالین سے اُٹھا کر کب انہوں نے مجھے بیڈ پر لٹایا اور کب میں ہوش میں آئی مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ ہاں جب آنکھ کھلی تو شہیر کی باتیں کانوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ لیکن اس کے بعد محبت نے اپنی مضبوطی دکھائی۔ دل نے عقل کو سمجھایا کہ بچے اُن کا بھی تو خواب ہیں۔ پھر اس کے آگے کچھ سوچنے کا من ہی نہیں کیا۔ ہاں مگر اِتنا خیال ضرور آیا کہ دوسری شادی وہ مجھ سے علیحدگی کے بغیر بھی تو کر سکتے ہیں؟

''ٹھیک ہے! وہ مجھے امی کے گھر چھوڑنا چاہتے ہیں نا؟ چلی جاتی ہوں۔ مگر صاف صاف کہہ دوں گی کہ مجھے آپ کی دوسری شادی سے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بس آپ اپنا نام میرے نام کے ساتھ جڑا رہنے دیں۔''

☆......☆......☆

اوہ میرے خدا! شہیر آپ مجھ سے اِتنی محبت کرتے ہیں؟ کپڑے نکالتے ہوئے اگر آپ کی ڈائری نہ پڑھتی تو کیا ہو جاتا؟

پچھلی رات کی تاریخ میں لکھا گیا ہے کہ حور! میں تم کو کیسے بتاؤں کہ میں تمہیں کتنا پیار کرتا ہوں؟ تم سے جدائی کا فیصلہ آسان تھوڑی ہے۔ کوئی موت کو خود گلے لگا سکتا ہے کیا؟ میں جانتا ہوں تم کو بچوں کی کتنی تمنا ہے۔ یہ فیصلہ اسی لیے ہے۔ میں تمہیں ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہر حال میں!'' زندگی کا کچھ نہیں پتا، اس کے دامن میں کتنے برس کے سکے خدا نے ڈال رکھے ہیں۔

میری زندگی! تم اور میں، زیست کے راستوں میں ہمیشہ خوش رہیں گے۔ تم کسی اور کے ساتھ، اپنی اولاد کی خوشیوں کو لے کر جینا اور میں تمہاری یاد کی خوشیوں سے خود کو خوش رکھوں گا۔

اوہ میرے خدا! محبت اتنی کمزور نہیں جتنی شہیر سمجھتے ہیں! وہی شہیر جو محبت کی طاقت بیان کرنے میں زمین آسمان ملا دیتے تھے۔

تو کیا اتنی سی بات پر کوئی بھلا یوں بھی کرتا ہے؟

شہیر! جہاں تک میں سمجھتی ہوں، جب ایک عورت کو اولاد اور شوہر میں سے کسی ایک کو چننا پڑے تو وہ شوہر کو چنتی ہے۔ جہاں تک میری عقل کہتی ہے شہیر!

تو تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں......؟

محبت بہت مضبوط ہے شہیر! بہت مضبوط!

☆......☆......☆

افسانہ

عافیہ رحمت

بہار آئے گی

یہ پارک میری کہانیوں کی بہترین نرسری ثابت ہو رہا تھا۔ یہاں مجھے اکثر ایسے انمول کردار نظر آ جاتے، جن کی حقیقی زندگی میں دوسروں کے لیے بہت ساری راز کی باتیں......

زندگی کو راہِ راست پر لاتا، ایک خوب صورت افسانہ

میں نے ایک سرسری سی نگاہ پورے پارک پہ دوڑائی، مگر مجھے کسی چیز نے متاثر نہیں کیا دراصل میں ایک افسانہ نگار ہوں، اس لیے اِدھر اُدھر اپنے کرداروں کو ڈھونڈتی رہتی ہوں اور یہ پارک میری کہانیوں کی بہترین نرسری ثابت ہو رہا تھا۔ یہاں مجھے اکثر ایسے انمول کردار نظر آ جاتے، جن کی حقیقی زندگی میں دوسروں کے لیے بہت ساری راز کی باتیں ہوتیں۔ مجھے ان دنوں دو تین کرداروں سے غیر معمولی شناسائی ہو گئی تھی اور ان کی زندگی بہت حد تک قابل رشک تھی میری نظر میں۔

نماز فجر کے بعد یہ میرے معمولات میں شامل ہے کہ قریبی محلے کے پارک میں جا بیٹھتی ہوں۔ بزرگوں سے سلام دعا، خیر و عافیت دریافت کرنا میری نظر میں بہت اہم ہوتا ہے۔ ان چند لمحوں سے میں خود بھی فیض یاب ہوتی یعنی ہلکی پھلکی ورزش کرتی اور اس دوران پانی خوب پیتی مختصراً یہ کہ میری نظر میں یہ صحت مندی کا فارمولا ہے کہ صبح صبح اپنی جسمانی گاڑی میں ایندھن بھر لیں، مٹی وٹی جھاڑ لیں اور سیلف ٹیوننگ کر لیں تو دن بھر گاڑی فرّاٹے بھرتی پھرے گی، اسی وجہ سے میرا سستی کا جن بوتل میں بند تھا۔

''السلام علیکم خالہ جان'' میں نے پارک میں داخل ہوتی ہوئی ایک معمر خاتون کو دیکھا۔ وہ ایک بڑا سا پرام لے کر آئی تھیں اور کافی سامان اس کے اندر ترتیب سے رکھا ہوا تھا۔ ایک بستہ اور تھرماس ان کے کندھوں پہ لٹکے ہوئے تھے۔ مجھ سے رہا نہ گیا، میں نے ان سے سامان لیا اور ایک دو بچوں کی انگلی پکڑ کے اندر بٹھا آئی۔ پرام کے باہر چار بچے تھے اور اندر دو بچے لیٹے ہوئے تھے۔ میں حیرت سے سوچ ہی رہی تھی کہ کیا حکمت عملی اختیار کروں، وہ گارڈز اور ایک مالی کو بلا لائی تھیں اور ان دونوں نے آن کی آن میں تمام چیزیں پارک کے اندر پہنچادی تھیں۔ انہوں نے بڑی سی چادر نکال کر بچھائی، بچے اپنے کھیلنے کا سامان نکال رہے تھے۔

''آؤ بیٹھو بیٹی بہت شکریہ تمہارا۔ لو یہ شربت لو۔'' اب وہ ایک بوتل سے سب بچوں میں شربت تقسیم کرنے لگی تھیں۔ منع کرتے ہوئے مجھے اچھا

نہیں لگ رہا تھا، اس لیے میں بیٹھ گئی، پھر میں نے دیکھا کہ بچے جو چھوٹے تھے، مثلاً چھ یا سات ماہ کے وہ بہت آرام سے جھولے میں جھول رہے تھے۔ آتے ہی انہوں نے بہت پھرتی کے ساتھ چادر سے جھولا باندھ دیا تھا، اسٹینڈ کے اوپر بڑے بچوں نے چادر کے اوپر قرینے سے سب سامان سیٹ کر دیا تھا، جن میں تھرماس، گلاس، پیالی، چند کتابیں، ایک بڑی ٹرے میں چند پھل، ابلے ہوئے انڈے، چینی اور نمک دانی رکھے ہوئے تھے۔ بچے بہت مزے سے مختلف کھیل کھیل رہے تھے اور وہ چکوترے کی قاشوں سے گودا نکال نکال کر الگ رکھ رہی تھیں۔ میں نے جوس کا مگ خالی کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو میں نے پہلے نہیں دیکھا یہاں؟'' تو وہ بولنا شروع ہوئیں، بوڑھوں سے باتیں کرنا اسی وجہ سے بہت آسان ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی سوال میں پوری داستان سنا دیتے ہیں اور کافی دانشمندانہ باتیں بیچ بیچ میں یونہی بتاتے جاتے ہیں۔

''میں تو روزانہ یہاں سوا آٹھ بجے آتی ہوں، بڑے بچوں کو اسکول چھوڑ کر اور سوا نو بجے چلی جاتی ہوں۔ صبح صبح گھر کے سارے کام ہو جائیں یہ مجھے بہت پسند ہے، اسی وجہ سے میں صبح ہی سارے بچوں

کو لے کر گھر سے نکل جاتی ہوں۔ کچھ اسکول جاتے ہیں تو کچھ یہاں میرے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور یوں ایک گھنٹے کے اندر اندر گھر کے سارے کام نمٹ جاتے ہیں۔'' باتوں کے ساتھ ساتھ ان کے ہاتھ بہت تیزی سے چل رہے تھے۔ ان کی ناشتے کی ٹرے تیار ہو چکی تھی۔ دسترخوان پر ایک پلیٹ میں چکوترے، کالی مرچ اور نمک چھڑک کر رکھے ہوئے تھے، دوسری طرف انڈوں کے چھوٹے ٹکڑے بھی اسی طرح اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ سادہ پانی اور جوس کی بوتلیں کنارے پر رکھی ہوئی تھیں۔ میں حیرت زدہ سی سب کچھ دیکھ رہی تھی، تھوڑی دیر میں بچے بھی آ گئے، جب تک وہ سب کے سامنے دو توس، انڈے، جیم اور چمچہ رکھ چکی تھیں۔ بچوں نے آرام سے ہاتھ دھوئے اور ناشتا کرنے لگے، وہ بھی اب مکمل ناشتے کی طرف متوجہ تھیں اور میرے، بہت منع کرنے کے باوجود وہ انڈے کا سینڈوچ میرے ہاتھ میں تھما چکی تھیں۔ ناشتا کر کے اب بچیاں پلیٹیں ٹشو سے پونچھ کر دوبارہ لال ٹوکری میں رکھ رہی تھیں اور خالہ جان ایک موٹی سی کتاب میں سر دیے بیٹھی تھیں۔ بچے جھولوں کی طرف چلے گئے تھے۔ میرا دل اُن سے ڈھیروں باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا، مگر اب ان کے مطابق گھڑی نو بج کر دس منٹ بجا چکی تھی۔ پارک کے مرکزی دروازے پہ ایک لمبی سی کالی گاڑی آ کر رکی اور ہارن بجا۔ بچے بھاگتے ہوئے آئے اور چھوٹا موٹا سامان اٹھا اٹھا کر لے جانے لگے۔ وہ آرام سے بیٹھی تھیں کہ دو خواتین آئیں اور انہوں نے اپنے اپنے بچوں کو گود میں اٹھا لیا۔

''چلیے امی جان'' ایک نے مؤدب ہو کر کہا اور وہ اُٹھ گئیں، اس دوران وہ کچھ پڑھ رہی تھیں۔ چادر لپیٹی اور ذرا سا سہارا لے کر چل دیں، میں نے بھی سلام کیا اور اپنی راہ لی۔

☆......☆

''اری بٹیا رانی کہاں تک سنو گی کہاں تک سنائیں، اب تو بس ہم اپنے دن پورے کر رہے ہیں۔'' صالحہ بیگم بہت عاجزی سے گفتگو کیا کرتی تھیں۔ ''صبح تو رب کے شکرانے کے لیے ہوتی ہے، نیا دن دیا اُس مالک نے، گناہوں سے بچنے کی مہلت دی، نیکیاں کرنے کی توفیق دی تو بس میرا دل یہی چاہتا تھا کہ سب لوگ ہمیشہ صبح سویرے اٹھیں، نماز و قرآن پڑھیں اور تلاش علم و رزق میں لگ جائیں، مگر اپنی ساری زندگی یہ کچھ نہ کر سکی۔ پے در پے بچوں کی پیدائش، پھر سسرال کا ناموافق ماحول، الغرض وہ خواہش دل میں ہی چھپی رہ گئی تھی، جو رب نے اب پوری کر دی ہے۔ بیٹا ہمیشہ یاد رکھو، یہ خواہشوں کے بیج دل کی سرزمین پہ خود بخود نہیں آن گرتے، بلکہ کوئی بہت پیار سے پہلے زمین گیلی و نرم کرتا ہے اور گداز زمین میں ہل چلاتا ہے، پھر یہ بیج بکھیرے جاتے ہیں اور ہم اس تمنا کو لمحہ بہ لمحہ سالوں یا مہینوں سینچتے ہیں تو پودے اُگتے ہیں، کچھ لوگ بہت نادان ہوتے ہیں، وہ اپنی خواہشوں کی کونپلوں کو پھوٹتا ہوا دیکھتے ہیں، مگر چلچلاتی دھوپ اور ناسازگار ماحول سے بچانے کا سامان نہیں کرتے اور اس طرح ان کی سالوں کی محنت برباد چلی جاتی ہے۔ بس تم جو میری یہ مشقت دیکھ رہی ہو نا، یہی میرے خواہشوں اور تمناؤں کے پودے ہیں۔ میں نے خونِ جگر دے کر سینچا ہے انہیں، اب ان سے کیسے غافل ہو جاؤں۔

میرے چھ بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ نوجوانی کا سارا دور صرف بچوں کی پرورش اور روٹی کپڑے کی فکر کی نذر ہو گیا، اس سے آگے کی ساری سوچیں دب کر رہ گئیں، مگر وہ ایک ہوک کی شکل میں اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ میں نماز و قرآن کی پابندی کرنا چاہتی تھی، مگر نہ ہو پائی تھی۔

کوئی مددگار نہ تھا بلکہ الٹا ڈانٹ پڑتی۔ ''لو اتنا کام پڑا ہے اور یہ محترمہ قرآن لے بیٹھی ہیں، اب ہم تو فاقوں مریں گے۔'' یہ میری ساس کے الفاظ تھے، جو وہ صبح صبح میرے ہاتھ قرآن کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتیں تو کہہ دیتیں اور میں فوراً ہاتھ روک لیتی، مگر وہ اپنا کلام مختصر نہ کرتیں۔ ''ہم تو صبح سویرے چکنی مٹی سے گھر اور چولہا لیپتے، بچوں اور شوہر کے جانے کا سامان تیار کرتے اور جب سب اپنے کاموں پہ روانہ ہوتے تو سلائی کڑھائی میں سر کھپاتے، مگر یہ پڑھے لکھے دور کی لڑکیاں کیا جانیں کام کی عظمت......

ہمارے زمانے میں سِل پر مسالے پیسے جاتے تھے۔ دستر خوان پر دس طرح کی چیزیں رکھی جاتی تھیں اور یہ سب کام تو ہم بس محبت میں ہی کیے جاتے تھے، ہمیں کوئی صلے کی توقع ہی نہیں ہوتی تھی۔'' وہ کم و بیش روزانہ ہی یہ تقریر دن میں دو تین مرتبہ دہراتیں۔ میں نے یونیورسٹی سے اسلامک ہسٹری میں ماسٹر کیا تھا، مگر شادی کے بعد کتابوں کو ہاتھ لگانا بھی عیاشی خیال کیا جاتا تھا، سو چھوڑ دیا۔ امور خانہ داری میں ماہر ہو کر بھی اپنا آپ مٹا دیا، لیکن ساس کی باتوں سے دل پر میل نہ آنے دیا، شاید اسی وجہ سے انہوں نے اپنے تمام ہنر ہمیں بخش دیے اور آرام سے جا سوئیں، رفتہ رفتہ بچے بڑے ہو گئے اور ہر طرح کے کاموں میں مددگار و معاون مل گئے تو دل میں پھر سے اُسی خواہش نے سر اُبھارا۔ برسوں اُس کو غم کے آنسوؤں سے سینچا تھا اور اب تو وہ تناور درخت کی طرح تھا۔ میری محنت شاقہ رنگ لے آئی تھی اور میرے شوہر میری خوبیوں کے معترف ہو گئے تھے۔ بس بیٹا جس کو رب دنیا میں قدر دان شوہر عطا کر دے، اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہوتی۔ صبح شام اس سے دعا کیا کرو کہ رب اولاد کو اور ازواج کو آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے۔

رفتہ رفتہ سارے بیٹے برسر روزگار ہوتے گئے۔ رب نے بڑی مہربانی کی، مناسب رشتے بھی ملتے گئے اور یوں محبت و چاہت سے بھرا ہمارا چھوٹا سا آشیانہ بڑا ہوتا گیا۔ ویسے دیکھا جائے تو میرے سب بیٹے الگ ہیں، یعنی ان کی رہائش دوسری اور تیسری منزل پر ہے، کھانا پینا سب الگ ہے، مگر سب ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ ایک دستر خوان بچھتا ہے۔ صبح ناشتا الگ الگ ہو جاتا ہے، مگر سب کا عمل ایک سا ہوتا ہے۔ میں صبح کے بعد پودوں کو پانی دیتی ہوں اور ساتھ جانے کے لیے سامان تیار کرتی رہتی ہوں۔ میرے ساتھ میری جو بہو ہے، وہ مجھے اپنی بیٹیوں سے زیادہ عزیز ہے۔ دراصل وہ گونگی ہے، مگر وہ ہر کام میری سوچ کے مطابق کرتی ہے اور اسی وجہ سے دل پر راج بھی کرتی ہے۔ اصل میں اس طرح کے لوگوں کو ہم عام لوگوں کے درمیان رہنا چاہیے۔ اس سے ظرف وسیع ہوتا ہے اور شکر گزاری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ میں اس کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ خاموش رہنے کی کوشش کرتی ہوں کہ وہ میری کسی بھی بات کا جواب ہی نہیں دے سکتی اور اگر اس کو تکلیف پہنچ گئی تو خدا کو کیا جواب دوں گی۔ وہ بہت خوب صورت ہے، صابرہ نام ہے اُس کا۔ میری ہر پریشانی کا جواب اس کے پاس ہوتا ہے، جو میں دِل کے کانوں سے سنتی ہوں۔ ویسے وہ بہت زبردست لکھتی ہے، اور کراٹے بھی جانتی ہے۔ میں صبح صبح جب بچوں کو لے کر نکلتی ہوں تو پیچھے وہ میری پوزیشن سنبھال لیتی ہے۔ یہ میرا حکم ہے کہ ساری بہو، بیٹے صبح اُٹھتے ہی قہوہ پیتے ہیں، وہ میں بناتی ہوں اور صابرہ سب کو اُٹھا آتی ہے۔ اُس کا انداز اتنا پیارا ہوتا ہے کہ بچے اپنی ماں سے اتنا پیار نہیں کرتے جتنا اُس سے کرتے ہیں اور بچوں سے اپنی باتیں

منوانا میں نے اس سے ہی سیکھا ہے، پھر بیٹے باجماعت نماز ادا کرتے ہیں اور بہوئیں بچوں کو تیار کرتی ہیں۔ صابرہ اُن کی خوب مدد کرتی ہے۔ ابھی اُس کے بچے نہیں ہیں، مگر اگلے ماہ اس کے ہاں جڑواں متوقع ہیں، ورنہ وہ میرے ساتھ یہاں ضرور آیا کرتی تھی پارک میں۔ جب تک میں پارک سے آتی ہوں، پورا گھر دھل چکا ہوتا ہے۔ باتھ روم اور کچن چمک رہے ہوتے ہیں۔ میں سب کو فرداً فرداً سلام کرتی ہوں، اِسی بہانے بہت سی اہم باتیں بھی مجھے پتا چل جاتی ہیں۔ مثلاً کوئی بیمار ہے، کسی کو کہیں درد ہے، تکلیف ہے، کوئی امی کے گھر رکنے جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔ پھر میں اور صابرہ اُس کے مسئلے کو حل کرتے ہیں یا ڈاکٹر کے پاس جانے کی تجویز دیتے ہیں۔ اسی پیار و محبت کی وجہ سے ہمارے گھر میں ہر سہولت موجود ہے۔ ایک بہو حافظ قرآن ہے، وہ اپنا سپارہ روزانہ رات کو بیٹے کو سناتی ہے یا پھر میں شام ساڑھے پانچ بجے سے ساڑھے چھ بجے تک سن لیتی ہوں۔ اس وقت سارے محلے کے بچے قرآن پڑھنے آتے ہیں میرے پاس، عائشہ نام ہے اس بہو کا، بے حد صلح جو، ڈرپوک اور بے وقوف سی لڑکی ہے، مگر خطرناک حد تک ذہین ہے۔ میرا مدرسہ اس کے ہی دم سے ہے۔

میری ساس کی خواہش تھی کہ لڑکیوں کا کام کاج میں بہت ماہر ہونا چاہیے، اسی وجہ سے ان کے مرنے کے بعد میں نے گھر میں ایک انڈسٹریل ہوم بھی کھولا ہے جو تیسری منزل پر ہے اور وہ میری بہو حمیرا کے دم سے ہے۔ اس نے ہوم اکنامکس میں ماسٹرز کیا ہے۔ کوئی بھی ڈش خراب ہو جائے، یہ اسے ٹھیک کر دے گی منٹوں میں، کوئی بھی سوٹ خراب کٹ جائے، فٹنگ کرانی ہو، سب کام منٹوں میں کر دیتی ہے اور خوبی اس کی یہ ہے کہ وہ کبھی ماتھے پر بل نہیں لاتی اور کبھی کسی کام سے منع نہیں کرتی۔ صبح دس بجے سے جو بچیاں آنا شروع ہوتی ہیں تو دن کا ایک بج جاتا ہے، پھر ساری بچیاں یہیں وضو کر کے نماز ادا کر کے جاتی ہیں اور یوں میری آنکھیں ٹھنڈی رہتی ہیں۔ ہفتے میں ایک دن میں خود ساری خواتین کے گھر گھر جا کر بلاوا دیتی ہوں درس قرآن کا اور تقریباً سب ہی خواتین آجاتی ہیں جن میں سے کسی کے بچے ٹیوشن پڑھتے ہیں تو کسی کی بچی سلائی سیکھتی ہے، وقت بے وقت ہم محلے کے تمام لوگوں کے بہت کام بھی آجاتے ہیں۔

دوپہر کا کھانا حمیرا ہی پکاتی ہے۔ بچیاں جو سیکھتی ہیں، ساتھ ساتھ کافی کام نمٹا جاتی ہیں اور میں بھی ساتھ ہی لگی رہتی ہوں۔ بچے اسکول سے آتے ہیں تو موسم کے لحاظ سے شربت، ستو تیار ہوتا ہے۔ بچے سلام کرتے ہیں، جوتے، موزے اسٹینڈ پہ رکھتے ہیں اور بستے لے کر اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے ہیں۔ جب تک وہ منہ ہاتھ دھوتے ہیں میں اور صابرہ مل کر دسترخوان لگا دیتے ہیں، پھر سب مل کر دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں اور سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے ہیں۔ چھوٹے بچے میرے پاس کہانی سنتے ہیں، میں آدھ گھنٹہ، بیس منٹ سو لیتی ہوں۔ نماز عصر سب ساتھ ادا کرتے ہیں پھر ٹیوشن پڑھنے والے بچے آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی نماز ادا کر کے دوسری منزل پہ منورہ سے ٹیوشن پڑھتے ہیں۔ منورہ اور عائشہ مل کر انہیں پڑھاتی ہیں، کچھ کم اور کچھ زیادہ فیس دیتے ہیں۔ ہمارا بھی دل لگا رہتا ہے۔ مزے کی بات یہ کہ ہمارے گھر میں بچے زیادہ تنگ نہیں کرتے، مطلب یہ کہ مار پیٹ کم ہی ہوتی ہے، صابرہ کی وجہ سے، اس کی ایک پیاری سی عادت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کمرے میں بچوں کی پسند کی ڈھیروں چیزیں منگوا کر

رکھتی ہے اور نخرے بھی بچوں کے خوب اٹھاتی ہے، اسی وجہ سے بچے اس سے زیادہ خوش رہتے ہیں، وہ خاموش جو رہتی ہے، اسی وجہ سے بچے بھی خاموش رہنا سیکھ جاتے ہیں۔ میری کبھی کسی بہو سے لڑائی نہیں ہوئی اور پتا ہے یہ صابرہ کرانے ماسٹر بھی ہے۔ بچوں کو چھٹی والے دن کراٹے بھی سکھاتی ہے۔ اس کی کبھی کسی سے تُو تُو میں میں بھی نہیں ہوتی۔ ہم سب کبھی بھی آپس میں نہ لڑنے کا عہد کر چکے ہیں، بلکہ مل کر معاشرے میں شیطان سے لڑنے کے خلاف قوت و طاقت اکٹھا کرتے ہیں۔

میری پیاری بیٹی! اصل بات جو زندگی کا حاصل ہے، وہ یہی ہے کہ سب مل کر ایک ہو کر شیطانی قوتوں کے خلاف لڑو اور اس کا ہر تیر باطل کر دو، اپنے بچوں کو دین کا سپاہی بناؤ۔ قرآن کو ترجمے سے پڑھنے کی عادت ڈالو اور نمازوں کو معاشرے میں قائم کر دو، بس میری تو یہی خواہش رہی ہے اور رب نے بخوبی یہ پوری بھی کر دی ہے۔ جب سب سے پہلا قدم اپنے نفس پر رکھ دیا تو باقی سب راستے آسان ہو جاتے ہیں۔ اگر آج ہم کسی کو آسانی یا سہولت دیتے ہیں تو ہم اپنے لیے آسانی و سہولت دینے والے ہاتھ بڑھا لیتے ہیں۔ کل وہ ہماری پریشانیاں اپنے وجود میں سمیٹنے کے لیے تیار ہوں گے۔

رب سوہنے کی رضا کی پروا کر لو باقی تو سب اپنے بن جائیں گے، مگر وہ جس سے روٹھا رہا تو اس کی بگڑی دنیا کوئی نہیں بنا سکتا۔ زندگی ٹکراؤ اور تصادم میں نہیں، بلکہ مل کر قدم آگے بڑھانے میں ہے۔

تینوں بیٹیاں الحمدللہ اپنے گھروں میں سکھی و آباد ہیں۔ ہر اتوار کو گھر میں میلہ سا لگا ہوتا ہے۔ میں سب خاندان والوں کو بلاتی ہوں اور کمپیوٹر پر قرآن کو ترجمہ سے پڑھنے کی کلاس ہوتی ہے۔ یہ لوگ رو رو کے بلاتی ہیں اپنی نندوں کو، بچے اپنی پھوپیوں سے اتنے مانوس ہیں کہ اکثر خود ہی فون پر بات کرتے ہوئے دعوت دے ڈالتے ہیں۔

ہمارے ہاں ہر روز دعوت ہی سمجھ لو، اتنا بڑا دستر خوان بچھتا ہے جس پر سب لوگ مل کر کھاتے ہیں۔ نماز و قیام میں راتیں گزارتے ہیں تو رب کے حضور شکرانے کے آنسو بہہ نکلتے ہیں کہ اس نے ساری دعائیں پوری کر دیں۔

بس میں نے زندگی گزارنے کا ایک اصول بنایا ہوا ہے، جس کو توڑنے کی کسی کو جرأت نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ اگر صرف اس چیز کو توڑ ڈالو تو میرا سارا کارخانہ تہس نہس ہو جائے گا۔ وہ اصول یہ ہے کہ رات دیر تک جاگنے پر پابندی ہے۔ عام طور پر عشاء کی نماز کے بعد سونے کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں، چاہے کسی کا امتحان ہو یا کوئی بیمار ہو، عشاء کی نماز کے بعد سب سو جاتے ہیں۔ سب سلام کر کے سوتے ہیں اور اٹھتے ہوئے بھی سلام کرتے ہیں، کیوں کہ سلام پھیلانا ہی پیار و محبت کو بڑھانے کا ذریعہ ہے، جتنا چاہے پھیلاؤ اس کو......! الحمدللہ! اب ماحول ایسا بن گیا ہے کہ کینہ بالکل نہیں رکھتے دلوں میں، تقریباً گھر کا ہر فرد صابرہ کو اپنے دل کی بات بتا دیتا ہے اور وہ بہت پیار سے کیسے اُس مسئلے کو سلجھاتی ہے، ہمیں پتا بھی نہیں چلتا۔ رب تعالیٰ ہمیں اور ہماری اولادوں کو شیطان کے پھندوں سے بچائے اور سلامتی کے ساتھ جنت میں لے جائے۔"

ان کی یہ ساری باتیں بہت حد تک مسحور کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ میرا من ان کے گھر میں اٹک سا گیا تھا۔ اب میں بھی باقاعدگی سے ان کے ہاں درسِ قرآن میں جانے لگی ہوں اور نیکیوں کی تڑپ مجھ میں بیدار ہو گئی ہے۔ زندگی کے اصل مقصد سے پردہ ہٹ گیا تو میں نے علمِ حقیقی کی تلاش میں

قرآن انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا۔

☆......☆

پانچ چھ مہینے کیسے گزرے، پتا ہی نہ چلا۔ میں نے اُن سے رب کی محبت کی خوشبو محسوس کی۔ ترجمہ اور تفسیر پڑھتے ہوئے میں نے خود قرآن کی سرزمین پر چلنے پھرنے کا مزا اُٹھایا۔ ربی تعالیٰ محبتوں کا بھرپور صلہ دیتا ہے۔ میری پوزیشن آئی تو دل خوشی سے جھوم اٹھا اور ان محسنہ خاتون کی یاد ستائی پھر خیال آیا کہ اب تو صابرہ کے بچے بھی ہو چکے ہوں گے، اس خیال سے بازار کا رُخ کیا، چند جوڑے کپڑے لیے، کھلونے کا ایک سیٹ اور مٹھائی کے ایک ڈبے کے ساتھ میں خوب اہتمام سے ان کے گھر پہنچی۔ وہاں میرے لیے باہمی محبت کے اور بہت سے انمول واقعات منتظر تھے۔

☆......☆

دوپہر کے دو بج رہے تھے، گھر میں جب گھنٹی بجی تو ایک چھوٹی سی بچی اپنا دوپٹا سنبھالتی ہوئی دروازے پر آئی اور فوراً ہی چل دی کہ جماعت کھڑی ہو چکی ہے، میری نماز نکل جائے گی۔ لاؤنج میں کافی ساری لڑکیاں نماز پڑھ رہی تھیں۔ ان کے درمیان میں حافظہ بہو عائشہ جماعت کرا رہی تھی۔ سب نے سنتیں بھی وہیں ادا کیں اور بہت آرام سے سپارے اٹھا اٹھا کر جانے لگیں۔ صابرہ کی مجھ پر نظر پڑی تو ہاتھ پکڑ کے اپنے کمرے میں لے آئی۔ خوب صورت مسکراہٹ اس کے چہرے پر رقصاں تھی۔ گلے ملنے میں ڈھیروں اپنائیت اور خلوص تھا۔ مجھے بٹھا کر وہ باہر چلی گئی پھر باری باری عائشہ، حمیرا سب آنے لگیں، خالہ جان بھی گود میں نئے مہمان کو لیے ہوئے برآمد ہوئیں۔ صابرہ اتنی دیر میں لوازمات کی ٹرے سجا کر لے آئی۔ خالہ جان ہمیشہ کی طرح بے تکلفی سے بولیں۔

''کہاں غائب ہوگئی تھیں تم؟ لو ان مہمانوں سے ملو۔''

''جی خالہ جان، میں ان کو دیکھنے کے لیے خود بھی بے چین تھی، بس پڑھائی میں ایسے مگن ہوئی کہ وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ یہ لیجیے، یہ مٹھائی بھی اس امتحان میں اول آنے کی خوشی میں ہے۔'' وہ بہت خوش ہوئیں، بچوں کے نام فرقان اور عمران تھے۔

''بیٹی یہ تم نے بہت اہم کام کیا ہے؟'' اب وہ مجھ سے مخاطب تھیں۔ ''اب اس علم کے نور سے ایک دیا اور ضرور جلانا۔ ہمارے معاشرے میں بہت گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے نا! جتنے زیادہ دیے جلائے جائیں اتنی ہی ضوپاشی بڑھتی جائے گی۔ کہو اب تم اپنے ایمان اور نمازوں کو کیسا پاتی ہو۔''

''خالہ جان بہت ہی مختلف اور نیا نیا ہے یہ سب کچھ میرے لیے، ہر دفعہ نیت باندھتے ہی آیات دل میں وہ سماں باندھ دیتی ہیں کہ آنسوؤں کو روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ رب سے ایسی محبت محسوس ہوتی ہے جیسے اپنے ماں باپ سے بھی بڑھ کر کوئی ہستی ہو۔ بس ایک میٹھا سا تعلق ہے جو دن بدن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ بس خالہ جان آپ دعاؤں میں یاد رکھیں کہ میں بھی شیطان کے مقابل ایک ایسی ہی فوج تیار کرسکوں اور اپنے بچوں کی تربیت اسلامی خطوط پر کرسکوں اور خود بھی اپنی تربیت کا سامان کرتی رہوں۔ آمین، ثم آمین۔''

''بیٹی یہ چمن تو یونہی قرآن سے سجتا رہے گا، بس تم زمین نرم رکھنا۔'' آنسوؤں کا نذرانہ رب کے حضور روز بھیجتی رہنا، کب کونپلیں پھوٹتی ہیں اور بہار کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کا آغاز ہوتا ہے تم کو پتا بھی نہ چلے گا۔ مگر ہاں بہار آئے گی ضرور......!!''

☆......☆

عشق کی راہداریوں، طبقۂ اشرافیہ اور اپنی مٹی سے جڑے
لوگوں کی عکاسی کرتے سلسلے وار ناول کی انیسویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملک قاسم علی جہان آباد کے مالک تھے۔ ان کا شمار ضلع خوشاب کے جانے مانے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ان کے دو بیٹے ملک عمار علی اور ملک مصطفیٰ تھے۔ عمار علی ریاست کے امور میں دلچسپی لیتے تھے جبکہ ملک مصطفیٰ علی چھوٹی بہن امل کے ساتھ تعلیم کے سلسلے میں لاہور رہائش پذیر تھے، ملک عمار علی کی شادی ان کی کزن ماہین سے ہوئی تھی۔ وہ اٹھارہ سالہ لڑکی خود سے عمر میں کئی سال بڑے ملک عمار علی کو ذہنی طور پر قبول نہ کرسکی تھی۔ وہ کانونٹ سے پڑھی ہوئی اور خاصے آزاد خیالات رکھتی تھی، جو لائف بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ اُمِ فروا اُمِ زارا اور اسماعیل بخش مولوی ابراہیم کی اولادیں ہیں۔ اُمِ فروا کی شادی بلال حمید سے ہوئی ہے جو میڈم فیری کے لیے کام کررہا ہے۔ میڈم فیری کا تعلق اس جگہ سے تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ بلال حمید اُمِ فروا کو پہلی بار میکے لے کر آیا تھا کہ میڈم فیری کی کال آگئی......

میڈم فیری نے بلال عرف بالو کو باور کرایا کہ جلد اُمِ فروا کو ان کے حوالے کردے۔ بلال حمید کے لیے یہ ناممکن سا ہوگیا تھا کیونکہ وہ اُمِ فروا سے واقعی محبت کرنے لگا تھا۔ ماہین اپنے دیور مصطفیٰ علی میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ امل کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اُس کی شادی اُس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہونے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں لیکن امل کے خیالات کسی اور طرف بھٹکنے لگے تھے۔

ماہین اپنے بچپن کے دوست کاشان احمد سے ملتی ہے تو پتا چلتا ہے کاشان بچپن ہی سے اُس میں دلچسپی لیتا تھا مگر کبھی محبت کا اظہار نہ کرپایا۔ ماہین اپنے آئیڈیل کے اس طرح بچھڑ جانے پر دکھی ہے۔ کاشان احمد ملک سے باہر جانے سے پہلے ماہین سے محبت کا اظہار کردیتا ہے۔ ماہین ملک عمار علی سے ویسے ہی ناخوش ہے اس پر کاشان احمد کا اظہارِ محبت اُس کی زندگی میں ہلچل مچادیتا ہے۔

ماہین کے دل میں کاشان احمد کی محبت بھی جڑ پکڑ رہی ہے اور اب وہ عمار علی کی شدتوں سے مزید خائف ہونے لگی ہے۔ امل کی شادی اس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہوجاتی ہے۔ محمد علی اُسے محبتوں کی بارش میں نہلا دیتا ہے اور یوں فوجی افسر کی بیوی بن کر وہ اپنی پہلی محبت کی یادوں سے پیچھا چھڑالیتی ہے۔ ماہین اور عمار علی کے بیچ میں تکرار ہونے لگی ہے۔ میڈم فیری بلال کو اُمِ فروا پر کڑی نظر رکھنے کا کہتی ہے۔ ایک دن اچانک بلال کی ملک مصطفیٰ علی سے ملاقات ہوجاتی ہے اور وہ انہیں اعتماد میں لے کر اپنی اور اُمِ فروا کی رام کتھا سنا دیتا ہے۔ ملک مصطفیٰ علی اُسے اپنے ساتھ مراد ولا میں لے جاتا ہے اور انیکسی میں رہائش اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ فیری بلال کی تلاش میں ہے۔

اچانک ملک قاسم علی کی وفات ہوجاتی ہے۔ سارا جہان آباد سوگ میں ڈوبا ہے۔ ملک عمار علی سارے انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے ملک کے فرائض انجام دینے لگتے ہیں۔

ماہین کی ذرا سی غفلت اُسے نہ چاہتے ہوئے بھی ماں بنا دیتی ہے۔ ماہین کے دل میں کسی طرح بھی بچے کی محبت پیدا نہیں

ہو پاتی۔ وہ ماں کے سنگھاسن پر بیٹھ کر بھی کاشان کی محبت کی ہُوک اپنے دل میں محسوس کرتی ہے۔ اہل دوسری بار ماں بننے والی ہے۔ محمد علی مہرالنساء بیگم سے اہل کا خیال رکھنے کا کہتا ہے۔ اِدھر مہرالنساء بیگم دادی بننے کے بعد چاہتی ہیں کہ ماہین ریاست کی بڑی ملکائن کی ذمے داریاں اُن کی زندگی ہی میں اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ماہین اس صورتِ حال سے سخت متنفر ہے۔ وہ جلد از جلد جہان آباد سے واپس لاہور جانا چاہتی ہے۔ لیکن ملک عمار علی اُس کی باتیں سن کر......

(اب آگے پڑھیے)

اُس رات عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر اُمِ فروا ہاتھ میں تسبیح لیے کچن میں آ گئی۔ وہ عشاء کی نماز کے بعد دس تسبیحات درودِ ابراہیمی کی پڑھتی تھی۔ صبح سے اُس کی طبیعت بوجھل تھی۔ دوپہر بھی اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ شام کو چائے کے ساتھ دو تین بسکٹ زہر مار کیے تھے۔ اس وقت اُسے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اکیلی جان تھی اپنے لیے کچھ پکانے کا سوچتی ہی نہ تھی۔ ویسے ہی جب بندہ اکیلا ہو تو وہ اپنے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں کرتا۔ اُمِ فروا کو اپنے کھانے پینے کی قطعی فکر نہیں ہوتی تھی۔ بلال حمید روزانہ اُس کے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتا۔ اس روز اُمِ فروا نے اُسے منع کر دیا تھا۔

''آپ کچھ نہ لایا کریں، فریج میں بہت کچھ پڑا ہوتا ہے۔'' وہ بلال حمید سے پردہ کرتی تھی۔ اپنے کمرے میں دروازے کی اوٹ میں کھڑے کھڑے یہ بات اس نے کچن کی طرف جاتے بلال حمید سے کہی تھی۔ اُمِ فروا کو ہرگز گوارا نہیں تھا کہ بلال حمید اس کے لیے کچھ لائے۔ اُس نے اس کے ساتھ جو کیا تھا۔ بجلی کے کوندے کی طرح اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگتے۔

ملک مصطفیٰ علی جب بھی آتے اس کے لیے ڈرائی فوڈز لے کر آتے۔ جو جلد خراب نہیں ہوتا تھا۔ جس میں فرائیڈ فش، باربی کیو، نگٹس وغیرہ ہوتے۔ ایک بار اُمِ فروا نے اُن سے بھی کہا تھا۔

''ملک صاحب آپ یہ تکلفات مت کیا کریں۔''

''اُمِ فروا آپ میری ذمے داری پر یہاں آئی ہیں، اس لیے آپ کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔'' ان ساعتوں میں جھکی ہوئی پلکوں والا چہرہ ملک مصطفیٰ علی کو بھاتا چلا جاتا۔

تسبیح پڑھتے دوسرے ہاتھ سے بسم اللہ پڑھتے ہوئے اُمِ فروا نے فریج کھولا۔ فریج میں بہت کچھ پڑا تھا۔ کباب، نگٹس، کوفتے کے کئی پیکٹ پڑے ہوئے تھے۔ اس نے کباب کا ایک پیکٹ نکالا، مائیکرو ویو میں گرم کرنے کے لیے رکھا بریڈ کے دو سلائس ٹوسٹر میں رکھے تھوڑی دیر بعد وہ پلیٹ بنائے ہال میں چلی آئی۔ کھا لینے کے بعد وہ چائے کا کپ لیے لان کی طرف کھلنے والی دیوار گیر گلاس ونڈو کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ دو انگلیوں کی چٹکی کی مدد سے پردہ سرکا کر باہر دیکھنے لگی۔ ہر سمت اک مضمحل کر دینے والا ہُو کا عالم تھا، جیسے ساکن رات نے خود پر برستی ساعتوں کو تھپکی دے کر سلا دیا ہو۔ قطار در قطار درخت نیند کے خمار سے بوجھل تھے۔ کسی پل پتوں میں ہلکی سی ہل چل مچتی، ٹہنیوں پر بیٹھے پرندے شاید کروٹ بدلتے تھے۔ اس نے کھڑکی کا ناب گھمایا، سلائیڈ کو دوسرے رُخ ہلکا سا دھکیلا۔

ایک جھونکا اس کے چہرے کی حدتوں میں کہیں غائب ہو گیا۔ اُمِ فروا کو خنکی محسوس ہوئی، تو وہ مسکرائی۔ اب پرندوں کی قدرے تیز آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔ پرندوں کی آوازیں، جامد اندھیرا، گونگی خاموشیاں ایک دوسرے میں مدغم ہوتیں۔ دھیما دھیما ارتعاش پھیلا رہی تھیں۔ کیاریوں میں اونگھتے پھول بھی ساکن پروں میں ہلکورے کھا رہے تھے۔ لان میں جلنے والی اکلوتی لائٹ کی تیز روشنی چھوٹے سے لان کو روشن کیے ہوئے تھی۔ اُمِ فروا اس منظر کی دلکشی میں کھوسی گئی تھی۔ چائے کے چھوٹے چھوٹے سپ بھرتی وہ اچانک سے بہت اچھا فیل کرنے لگی تھی۔ دور سے پن چکی کی اُداس آواز پُرسوزی لیے اس کی سماعتوں میں اُتر رہی تھی۔ ہمیشہ آٹے کی یہ چکی مغرب کی

نماز کے بعد چلائی جاتی تھی۔ کسانوں کو اس وقت فرصت کے لمحات میسر آتے تھے۔ وہ کھانا کھا کر شام کو گندم پسوانے آتے تھے۔ کوکو، کوک، کوکو پن چکی کی اُداسی کے تھپیڑوں میں لدی آواز اُم فروا کے کانوں کی لوؤں کو سرخ کر گئی تھی۔ اُم فروا غیر ارادی طور پر دروازہ کھول کر لان میں آ گئی۔ لان کے اطراف دیوار نہیں تھی۔ مہندی کی باڑھی۔ تازہ پتوں اور رات کی رانی کی مہک مل کر بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اندھیرے کی چادر میں کچی نیند میں اونگھتے درختوں کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ اُسے بہت دور ایک نفس دکھائی دیا جو ہاتھ میں سرچ لائٹ پکڑے ہوئے تھا۔ لال حویلی کا رہائشی ایریا کافی اونچائی پر تھا، اس لیے باہر کے منظر باآسانی دکھائی دیتے تھے۔ حالانکہ شمال کی طرف رہائشی ایریا کی اختتامی دیوار موجود تھی۔ اُس لڑکے کے دوسرے ہاتھ میں لمبا سا ڈنڈا تھا۔ شاید وہ ہاری تھا اور کھیتوں کو پانی دے رہا تھا۔ ساتھ ہی اُس کی سریلی آواز کی ہلکی ہلکی بازگشت اُس تک پہنچ رہی تھی۔ وہ کوئی ماہیا گا رہا تھا۔ اب آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ اُم فروا وہیں کرسی پر بیٹھ گئی اور تسبیح پڑھنے لگی۔ اس نے دیکھا بلال حمید اور ملک مصطفیٰ علی اسی طرف آ رہے تھے۔ اندر جاتے ہوئے وہ اُم فروا کو لان میں بیٹھے دیکھ کر چونک گئے۔ اس وقت ململ کے بڑے سے سفید دوپٹے کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹے وہ تسبیح پڑھ رہی تھی۔ بلال حمید باہر کے دروازے سے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی اس کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ اس وقت وہ گرے کلر کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ اُن کے بیضوی شفاف چہرے پر دو بڑی بڑی براؤنش آنکھیں، رات کی اس لرزتی تاریکی میں بہت سج رہی تھیں۔ وہ بھرپور وجاہتوں سمیت اُم فروا کے قریب آ گئے۔

''اسلام وعلیکم!'' ملک مصطفیٰ علی نے سلام میں پہل کی۔

''وعلیکم اسلام۔'' اُم فروا چونکی۔ اس وقت اُن کی آمد نے اُسے شدید ناگواری سونپ دی تھی۔

''آج تو آپ لان ہی میں بیٹھی ہیں، خیر تو ہے نا۔''

''موسم اچھا تھا اس لیے یہاں چلی آئی۔'' اُم فروا نے دوپٹے کو گردن کے گرد مزید کسا اور دوپٹے کو غیر ارادی میں ماتھے کی طرف کھینچا۔ وہ اُسے دلچسپی سے دیکھ کر مسکرائے اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

''ہاں موسم تو بہت اچھا ہے۔'' ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ سرکتے لمحوں کی دھند دونوں کو اپنے حصار میں لینے لگی۔

''جی۔'' اس کا جواب مختصر تھا۔ 'بھلا یہ کوئی تک ہے اس وقت منہ اٹھا کے یہاں چلے آئے ہیں' ناگواری کی سلوٹوں کو ماتھے پر آنے سے اُس نے بمشکل روکا تھا۔ وہ یہاں پر تنہا رہتی تھی۔ شرعی اعتبار سے یہ انتہائی معیوب بات تھی۔ وہ اچانک اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ملک مصطفیٰ علی نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں اندر جانا چاہتی ہوں۔''

''شیور!'' انہوں نے پھر اُم فروا کو دیکھا۔ اُم فروا کے چہرے پر انہیں کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ یہاں مزید رُکنا نہیں چاہتی۔

'خدا حافظ۔'' اُن کی طرف دیکھے بغیر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ٹائلز کی چوڑی سیڑھیاں عبور کرتی اندر چلی گئی۔ وہ ہال میں صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ دو خوبصورت آنکھیں بدستور اس کی بصیرتوں میں ہلچل برپا کر رہی تھیں۔ یہ کیسا کیف تھا جو اس کی مٹی پلید کیے جا رہا تھا۔ اب وہ بلاوجہ اپنی صفائیاں پیش کر رہی تھی۔

'مالک میرے نہ چاہنے کے باوجود یہ دو آنکھیں میرے خیالوں کی ریشم ریشم میں گھسنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں اُسے غیر ارادی طور پر سوچنے لگی ہوں۔ میں خود کو گناہ گار تصور کرنے لگی ہوں، بلال حمید اور ملک مصطفیٰ

علی عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد اکٹھے مسجد سے نکلتے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے ملک مصطفیٰ علی بلال حمید کے ساتھ انیکسی کی طرف نکل آتے تھے۔ تب لان میں کرسی پر بیٹھی اُم فروا کو دیکھ کر بلال حمید چونکا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی کو سامنے بیٹھی اُم فروا کی جانب بڑھتے دیکھ کر بلال حمید کے دل میں ایک آہ اُبھر آئی تھی۔ حالانکہ بلال حمید جانتا تھا ملک مصطفیٰ علی آتے ہی اُم فروا سے ملتے ہیں۔ جب وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اُس کے قدم آگے بڑھنے کی بجائے، اُسے پیچھے کی طرف دھکیل رہے تھے۔ وہ بمشکل اپنے کمرے تک آیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ دل کو چھید دینے والی بے قراری تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔ اُسے کسی پل چین نہیں آرہا تھا۔ اُسے اپنے ہر سُو رنج والم بھرے پہر افسردگی میں پنہاں دکھائی دے رہے تھے۔

'بلال حمید اب کیوں پریشان ہو! یہ سب تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔ سارا دوش تمہارا ہے، پھر کوئی کیونکر تیرے دل کا حال جانے گا۔ بلال حمید تم غلطی کر گئے ہو۔ تمہیں اُم فروا کے علم میں لائے بغیر فیری کی بقایا رقم واپس کر دینی تھی۔'

'میں ایسا ہی کرتا، لیکن میں جانتا تھا وہ شاطر عورت مجھ جیسے کمزور شخص کو کبھی نہیں چھوڑے گی۔ کیونکہ آگے پیچھے میرا کوئی نہیں ہے، نہ ہی کسی تک میری رسائی ہو پاتی، مجھے کون سپورٹ کرتا۔ فیری کے ساتھ غداری کرنے والوں کا انجام موت ہوتا ہے۔ وہ مجھے مروا کر آسانی سے اُم فروا پر قبضہ جما لیتی۔ اگر خدانخواستہ اُم فروا اُس کے ہاتھ میں چلی جاتی تو...... تو کیا ہوتا؟' بلال حمید نے جھرجھری لی۔ اس کے پورے جسم میں سوئیاں چبھنے لگی تھیں، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ فیری ملک مصطفیٰ علی کی طاقت وحیثیت سے بخوبی واقف ہے۔ وہ کبھی بھی اُن کے ساتھ اُلجھنے کے بارے میں سوچے گی بھی نہیں، اُمید ہے اب تک وہ یہ شہر چھوڑ چکی ہوگی۔ ملک مصطفیٰ علی نے اُسے یہ شہر چھوڑنے کی وارننگ دی تھی۔ طاقت ور سے ہر بندہ ڈرتا ہے۔ ہم غریبوں کا کیا ہے۔ اگر مر بھی جائیں تو کسی کو کیا فرق پڑتا ہے۔ اُم فروا خدا تمہیں ہمیشہ اپنی حفظ وامان میں رکھے۔

اِس وقت بار بار ثمرین کی کال آرہی تھی لیکن آج وہ اُس کا فون نہیں اُٹھا رہا تھا۔ اسے اس وقت کسی سے بات نہیں کرنی تھی نہ ہی کسی سے کوئی سروکار تھا۔

اس وقت اپنا آپ اُسے خود پر بوجھ لگ رہا تھا۔ اب اکثر اُس کے اندر زہریلی کاٹ بھر جاتی تھی۔ وہ خود کو نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا۔ یہ اختیار اُس کے پاس نہیں تھا۔ زندگی تُو بھی ہر بار نئے سے نئے سوال لیے میرے سامنے تن جاتی ہے۔ بچپن میں ماں باپ مر گئے۔ تب زیست نئے نئے سوالیہ نشان لیے میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ تایا تائی کی جھڑکیوں اور ٹکڑوں پر پلنے لگا۔ تایا اور اُس کے بیٹوں نے چند ایکڑ زمین بھی ہڑپ کر لی۔ جیسے تیسے محنت مزدوری کر کے تعلیم مکمل کی۔ اَن گنت راتیں بھوکے پیٹ کھلے آسمان کے نیچے گزاریں۔ ڈگری لینے کے بعد در در نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ کسی نے بی ایس سی پاس لڑکے کو نوکری نہ دی۔ دھتکارا دیا، ڈانٹ دیا گیا۔ تذلیل کر کے دفتر سے نکالا گیا۔

پھر تقدیر نے اس بری عورت فیری کے پلّے ایسے باندھا جیسے لُولا لنگڑا ہو گیا، پھر اُس کے چنگل سے آزادی ناممکن ہوگئی۔ اس مکار عورت نے ایسا برین واش کیا کہ جو کچھ ہے پیسہ ہے۔ ایمان مذہب آگے پیچھے صرف پیسہ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ پیسہ ہی مشکل کشا ہے۔ اس کے سامنے نہ رشتہ نہ پہچان۔ اگر جیب میں پیسہ ہے تو رشتے بھی وافر مقدار میں ہیں۔ پہچان تو پیسہ خود بخود بنا تا ہے۔ عزت، مرتبہ زندگی کو انگوری شراب کی مانند پُر کیف بنا دیتا ہے یہ پیسہ۔ تب فیری کی باتیں میں نے کس کر ذہن کے پلو میں باندھ لیں اور لکھ پتی بننے کا جنون خود پر سوار کر لیا۔ میں بھی فیری کی طرح کوٹھیاں بنگلے، بڑی بڑی گاڑیوں کے خواب دیکھنے لگا۔ عیش وعشرت کی زندگی حاصل کرنا چاہی۔ دولڑکیوں سے کاغذی نکاح کر کے انہیں فیری کو سونپ دیا۔ اچھی شکل وصورت کا مجھے بہت

فائدہ ہوا۔ وہ دونوں لڑکیاں کھوٹے سکے نکلیں۔ تب مجھے بھی فیری سے کھوٹے سکوں کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ اس وقت بھول چکا تھا آسمانوں کی وسعتوں میں موجود کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ ہر وقت ہر جگہ اُس کی نگاہ مجھ پر موجود ہے۔ مجھے دیکھتا ہے، سنتا ہے، مجھے نوٹ کر رہا ہے۔ میری سوچوں کے بھید بخوبی جانتا ہے۔ زندگی میں کوئی رہبر ایسا نہ ملا جو مجھے صحیح غلط کی پہچان کراتا۔ میری اصلاح کرتا کہ اوپر کوئی ہے جو تمہارے ہر عمل سے آگاہ ہے واقف ہے۔ میں نے کوشش نہ کی فلاح پانے کی، راتوں رات لاکھ پتی بن جانے کی چربی میری آنکھوں پر چڑھ چکی تھی۔ میرے دل پر دولت اکٹھی کرنے کی دھن مضبوط ہو چکی تھی۔ پھر میں کیسے سوچتا؟ سمجھتا صحیح غلط کا ادراک مجھے ہوتا؟ میں گناہوں کی سڑاند اور تعفن زدگی میں ایسا لتھڑا ہوا ہوں مجھے خود سے گھن آتی ہے۔

دل میں مچی زلزلے کی مانند تیز دھمک بلال حمید کے جسم کی عمارت لرزا رہی تھی۔ ''بنا سوچے آکاش کی وسعتوں کو چھونے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے ناں؟'' وہ زندگی کی دہلیز پر کھڑا خود سے سوال کر رہا تھا۔ تمام رات اُس نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے گزار دی۔ سگریٹ پھونک پھونک کر اُس کا حلق دکھنے لگا تھا۔ اس وقت اُس کی متورم آنکھیں دہکتے انگارے بنی ہوئی تھیں۔ بے ترتیب بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ سگریٹ کی کثرت سے خشک ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ ایک ہی رات میں وہ صدیوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ اس تمام اضطراب کی وجہ اتنی تھی کہ کل رات اُس نے لان میں بیٹھی اُم فروا کی طرف ملک مصطفیٰ علی کو جاتے دیکھ لیا تھا۔ تب مندمل ہوتے زخموں کے منہ پھر سے کھل گئے تھے۔ بس اُسے موقع چاہیے تھا اندر کی بھڑاس نکالنے کا۔ تب وہ اپنے ماتم کدے پر خود ہی نوحہ کناں تھا۔ کبھی کبھار اندر کے زخم تازہ کرنے کے لیے عام سی بات وجہ بن جاتی ہے۔ جبھی اُن دونوں کو اکٹھے دیکھ کر اچانک اس کا دل ادھڑنے لگا تھا۔ تاریکی کے سوا اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ صبح تیار ہو کر وہ بنا کچھ کھائے فیکٹری چلا گیا۔

☆......☆......☆

اُمِ فروا کو آج اپنے گھر والے بہت یاد آ رہے تھے۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ اُڑ کر اُن کے پاس پہنچ جاتی۔ اس کے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا اور اُس نے تنہا ہی یہ سب کچھ سہار لیا۔ اُسے تسلی دینے والا کوئی اپنا پاس نہیں تھا سرکتے لمحوں کے ساتھ دل کا درد بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد نوافل پڑھتی رہی دن کافی چڑھ آیا۔ اُسے خبر نہ ہوئی جب درد حد سے زیادہ بڑھ جاتا تو پھر وہی درد اُسے بارگاہِ الٰہی میں لے جاتا۔ وہ گہرا سکون پا جاتی۔ جیسے اچانک ٹھنڈی میٹھی چھاؤں میں آ گئی ہو۔ جائے نماز طے کر کے رکھتے وہ بیڈ روم سے نکل کر ہال میں آ گئی۔ باہر خاص تیز دھوپ چپے چپے پر اپنی روشنی چھڑکتی کرنوں کی بوچھاڑ کر رہی تھی۔ اس نے پردے دونوں اطراف میں سمیٹ دیے۔ چاندی کے تار منعکس کرتی کرنیں اب غائب ہو چکی تھیں۔ مست خرامی سے پوری دھوپ اندر آنے لگی تھی۔ اس نے اپنے لیے ایک کپ چائے بنایا اور ہال میں اپنی مخصوص نشست پر آ کر بیٹھ گئی۔ چائے پینے کے بعد اُمِ فروا نے پورے گھر کی صفائی کی۔ روزانہ صبح مالی فریش پھولوں کا گلدستہ باہر کے برآمدے میں رکھے ٹیبل پر رکھ جاتا تھا۔ وہ منہ لپیٹے باہر نکلی، ٹیبل سے گلدستہ اٹھایا اور انہیں کرسٹل واز میں فریش پانی بھر کر رکھ دیا۔

☆......☆......☆

بلال حمید کو کچھ اندازہ ہو چکا تھا کہ ملک مصطفیٰ علی اُم فروا میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ وہ مطمئن تھا لیکن اُداس بھی تھا۔ اُمِ فروا کسی اور کی زوجیت میں چلی جائے گی۔ کہیں پھر اس بار اُم فروا کے ساتھ کچھ غلط نہ ہو جائے۔ ان رئیس زادوں کا کوئی دین ایمان بھی تو نہیں ہوتا۔ کیا واقعی ملک مصطفیٰ علی اُم فروا سے نکاح کر کے اُسے عزت و تکریم دیں گے؟ اگر اُن کا ایسا ارادہ نہ ہوا تو...... اس سے آگے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے مفلوج

ہو جاتی۔ میرے رب میرے لیے آسانیاں فرما۔ کہاں سے کوئی قابلِ اعتبار شخص لاؤں اُم فروا کے لیے۔ ملک صاحب سے کہوں گا کہ اس کو اس کے والدین کے پاس بھیج دیں۔ ایسا تو ملک صاحب خود بھی چاہ رہے ہیں۔ وہ مناسب وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ ہے۔ انشاء اللہ اس بار اُمِ فروا کے ساتھ کچھ غلط نہیں ہوگا۔' اس روز باتوں باتوں میں بلال حمید نے ملک مصطفیٰ علی سے یہ سب کہہ ہی دیا تھا۔

''ملک صاحب جس قدر جلد ممکن ہو اُمِ فروا کو اس کے پیرنٹس کے پاس بھیج دیں۔''

''ہاں بلال میں بھی یہی چاہتا ہوں، جلدی اس کو مولوی صاحب کے گھر پہنچا دیا جائے۔'' بلال حمید نے بغور ملک مصطفیٰ علی کی آنکھوں کی طرف دیکھا جن میں اُسے سچائی دکھائی دے رہی تھی۔ انشاء اللہ اللہ پاک اُم فروا کے لیے خود آسانیاں پیدا کرے گا۔ بلال حمید کی پریشانی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے خود ہی تو اُم فروا کو طلاق دی تھی۔ اُم فروا اب اپنے والدین سے ملنے والی تھی۔ تو وہ اس کی جدائی سے کیوں اُداس تھا۔ گم نام بے قراری کیوں پل پل اُسے چین نہ لینے دے رہی تھی۔ اُسے لگتا اس کا دل اندر سے پھوڑا بن چکا ہے۔ اس رات بھی ثمرین کا فون آتا رہا لیکن اُس نے اٹینڈ نہ کیا۔ وہ بیڈ سے ٹیک لگائے سگریٹ پھونکتا رہا۔ اُسے لگتا جیسے کسی نے اینٹوں کے بھٹے میں دہکتے انگاروں پر اُسے لٹا دیا ہو۔ ایش ٹرے سگریٹ کے اَدھ جلے ٹکڑوں سے بھر چکا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگاتا رہا۔ ساعت ساعت کی اذیت ناکی سہارنا بہت دشوار تھا۔ وہ اس قدر دور چلے جانا چاہتا تھا جہاں اُم فروا کا خیال بھی اُس کا پیچھا نہ کر سکے۔ لیکن دنیا میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ جس پناہ گاہ کی جانب بڑھتا، اُم فروا کے احساس کی خوشبو اس کے ساتھ رہتی۔ بلال حمید وہ جاگزیں لمحات کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ جو اُمِ فروا کے ساتھ ایک ہی چھت تلے گزارے تھے۔

☆......☆......☆

بلال حمید نے خود کو فیکٹری کے کام میں اتنا مشغول کر لیا کہ اُس کی خوشی اور غم اس مصروفیت میں دب سے گئے تھے۔ اُس دن کام کی زیادتی تھی۔ بلال حمید سنہری فریم کی نفیس گلاسز درست کرتا۔ مسز نورین اقبال کے کیبن میں آ گیا۔

''سوری مسز اقبال! سر ثاقب میر کو آج ہی تمام نئے Contacts کی مکمل رپورٹس چاہیے۔ پلیز آپ انٹرنیٹ سے تمام معلومات اکٹھی کر کے پرنٹ نکال لیں اور لنچ آور کے بعد مجھے پہنچا دیں۔''

''یس سر میں ان ہی رپورٹس پر ورک کر رہی ہوں۔'' نورین اقبال کی بورڈ پر تیز تیز انگلیاں چلاتی۔ بلال حمید کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ نورین اقبال کھلتی گندمی رنگت کی مالک تھی پانچ فٹ سات انچ قد کی مالک نورین اقبال دبلی پتلی اسمارٹ خاتون تھی۔ فیکٹری میں کام کرنے والی باقی خواتین سے مختلف تھی۔ ہمیشہ سادہ لباس زیب تن کرتی تھی۔ اُس کا تین گز کا دوپٹا ہوتا تھا جس سے خود کو ڈھانپے رکھتی۔ جس کے پلو کا آخری کونا فرش کو ہمیشہ چھوتا تھا۔ وہ زیادہ خوبصورت نہیں تھی لیکن اس کی آنکھیں اس کے کتابی چہرے پر بجتی تھیں۔ اٹھی ہوئی ناک میں ہیرے کی نوز پن چمکتی رہتی۔ ہونٹ اُس کے بہت مہین تھے۔ وہ باقی لڑکیوں کی طرح کسی سے فری نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی۔ بلال حمید دن میں ایک دو مرتبہ اس کے کیبن کے چکر ضرور لگاتا تھا۔ نورین اقبال بھی سپلائی کے پیپرز چیک کرانے، آرڈرز کی تفصیل لینے دن میں ایک آدھ بار بلال حمید کے پاس ضرور آتی۔ بلال حمید ہمیشہ اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا کیونکہ نورین اقبال کو اپنی عزت کرانا آتی تھی۔

یہاں کام کرنے والی نادیہ اور رابیل ہر لڑکے سے گپ شپ لگاتی تھیں۔ چیختے چنگھاڑتے میک اپ اور فٹنگ والے لباس کے ساتھ گلے میں دوپٹہ کسے دکھائی دیتیں۔ قاتلانہ مسکراہٹوں کے طلسم چھڑکنے کے گر بخوبی

جانتی تھیں۔ لیکن کوئی بھی اُنہیں منہ نہیں لگاتا تھا۔ بلال حمید پر نادیہ خاص توجہ دیتی تھی۔ اب تو دنیا کی کسی عورت میں بھی اُسے دلچسپی محسوس نہ ہوتی۔

صنفِ نازک اب اُس کی نگاہ کا مرکز نہیں بنتی تھی۔ فیکٹری میں کام کرنے والی خواتین سے کتراتا بیزار رہتا، 'نورین اقبال اُن سب سے الگ تھلگ تھی۔

دو دن سے مسز نورین اقبال فیکٹری نہیں آ رہی تھی۔ پہلے دن تو بلال حمید نے کوئی توجہ نہ دی۔ دوسرے روز اُس کی غیر حاضری کی کمی ضرور محسوس ہوئی۔ نئے آرڈرز کے پیپرز نکلوانے اُس کی جگہ پر کام کرنے والے لیاقت منظور کے پاس آ گیا۔

''مسز نورین اقبال چھٹی پر ہیں کیا؟'' بلال حمید نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''بلال صاحب وہ چار روز کی لیو پر ہیں۔''

''خیریت۔'' بلال حمید نے پوچھا۔

''بیمار ہیں وہ۔''

''اچھا۔'' بلال حمید اُس کے بارے میں سوچتا اپنی سیٹ تک آ گیا۔ دن بھر وہ مصروف رہا تھا۔ اُسے بار بار باس ملک مصطفیٰ علی کے آفس تک جانا پڑا۔ شام کو گھر جاتے ہوئے بلال حمید نے سوچا نورین اقبال کا پتا کرتا جاؤں۔ اُس کا ایڈریس بلال حمید نے آفس سے نکلوا لیا تھا۔

☆......☆......☆

سبزہ زار میں نورین اقبال کا گھر اُسے آسانی سے مل گیا تھا۔ چھوٹے سے سیاہ گیٹ کے سامنے اپنی بائیک لاک کرتے ہوئے اُس نے بیل دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک پانچ سالہ بچہ باہر نکلا۔

''السلام علیکم انکل۔''

''وعلیکم اسلام بیٹا۔ میں مسز نورین اقبال کا کولیگ بلال حمید ہوں۔ اُن کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔ آپ اندر جا کر بتائیں۔''

''جی اچھا۔'' وہ بچہ بھاگتا ہوا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دی بعد وہ دوبارہ نظر آیا۔

''انکل آپ اندر آئیں!'' چھوٹا سا صحن اور گیلری عبور کرنے کے بعد وہ بچہ اُسے ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر غائب ہو گیا۔ بلال حمید نے ایک طائرانہ نگاہ چہار سو دوڑائی۔ چھوٹا سا کمرہ جس میں سنگل سیٹر صوفہ رکھا تھا' سینٹر میں لکڑی کا ٹیبل تھا۔ فرش کی ٹائلز چمک رہی تھیں۔ فرنٹ دیوار پر ڈبل فریم میں ایک پینٹنگ تھی۔ اس کے بائیں جانب کی دیوار پر وال کلاک تھی۔ یہ کل اثاثہ تھا اس چند فٹ کے ڈرائنگ روم کا' تھوڑی دیر بعد نورین ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ کاٹن کا بے تکلف سا سوٹ اُس نے پہن رکھا تھا۔ ململ کے ہم رنگ دوپٹے کی اُس نے بکل اوڑھ رکھی تھی۔

''السلام وعلیکم!'' بلال حمید اُسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

''وعلیکم اسلام۔ تشریف رکھیے۔'' وہ بیٹھ گیا تو نورین بھی اُس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''آپ کی طبیعت ناساز ہونے کا پتا چلا۔ میں نے سوچا مزاج پرسی کرتا جاؤں۔''

''شکریہ۔'' اُس کی آواز میں نقاہت واضح تھی۔

''کیا ہوا آپ کو؟'' بلال حمید نے اچٹتی نگاہ اُس پر ڈالی۔

''بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے۔'' اب بھی اُس کے چہرے پر سرخی تھی۔ پیشانی اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

''میڈیسن کھا رہی ہیں؟''

''جی ہاں۔ڈاکٹر نے تین چار دن کا ریسٹ بتایا ہے۔'' ایک باوقار خاتون ٹرے میں چائے کے ساتھ بسکٹ لیے اندر داخل ہوئیں۔

''اسلام علیکم جی۔'' بلال حمید نے انہیں دیکھتے ہی کھڑے ہو کر سلام کیا۔

''وعلیکم اسلام۔'' وہ خوش مزاجی سے مسکرائیں اور ٹرے میں سے چائے کا کپ اور بسکٹ کی پلیٹ ٹیبل پر رکھ دی۔

''آپ نے ناحق تکلیف کی۔میں بس جانے ہی والا تھا۔'' بلال حمید کو اچھا نہ لگا۔بڑی عمر کی خاتون کو اس کے لیے تکلیف اٹھانا پڑی تھی۔

''کوئی تکلیف نہیں کی میں نے آپ یہ چائے پئیں اور بسکٹ بھی لیں۔'' وہ خاتون صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''یہ میری امی ہیں۔''

''اچھا اچھا۔'' بلال چائے پینے لگا۔

''ابھی آپ کو ریسٹ کرنا چاہیے۔جب پوری طرح ٹھیک ہوں تب فیکٹری آئیں۔'' وہ خاموش تھی جبکہ خاتون بولیں۔

''بیٹا اس کا بی پی بہت اوپر چلا جاتا ہے۔ٹینشن بہت لیتی ہے۔'' بلال حمید سوچ رہا تھا اس کو کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔

''اپنے بچے کی طرف سے فکر مند رہتی ہے۔ابھی بہت چھوٹا ہے احمد۔وہ ایک سال کا تھا جب نورین بیوہ ہو گئی۔'' بلال حمید یک بارگی سٹ پٹا کر چونکا۔

''بیوہ۔''

''جی ہاں بلال صاحب میں بیوہ ہوں۔امی اور بھائی کے ساتھ رہتی ہوں۔''

نورین کے سسرال والے جائیداد کے سلسلے میں اسے بہت تنگ کر رہے ہیں۔وہی پریشانی لے کر اپنا بلڈ پریشر بڑھا لیتی ہے۔دراصل نورین کے سسر اس کا نکاح رنڈوے جیٹھ سے کرانا چاہتے ہیں' جس کے جوان بچے ہیں اور وہ اس نکاح کے سخت خلاف ہیں۔''

''بہت افسوس ہوا جی اِن کے بارے میں یہ سب جان کر۔''

''ہاں زندگی اسی کو کہتے ہیں۔نورین کی وجہ سے میں بھی پریشان رہتی ہوں۔میرا بیٹا بہن کا خیال رکھتا ہے۔لیکن نورین کی وجہ سے بہو کا ہر وقت جھگڑا رہتا ہے میرے بیٹے سے۔بیٹا آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ پہلی دفعہ آیا ہوں تو یہ اپنے دکھڑے لے کر بیٹھ گئی ہیں۔''

''کوئی بات نہیں جی۔بات کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔'' بلال بولا۔

''بیٹا آپ اچھے لگے تو دل کا حال کہہ سنایا۔'' نورین کی امی کافی دیر تک بلال حمید سے باتیں کرتیں رہیں۔

وہ ضرورت سے زیادہ سادہ اور مخلص خاتون تھیں۔

انہوں نے زبردستی بلال حمید کو کھانے کے لیے روک لیا۔بلال نے بہت انکار کیا لیکن اُن کا خلوص کسی طریق کم نہ ہوا۔یہاں آ کر بلال حمید کو اچھا لگا تھا۔نورین کی والدہ کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔آج میری ماں بھی ہوتی تو نورین کی ماں جیسی ہوتی' سب مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔بے لوث محبت کرنے والی' یہاں سے جانے کے بعد سے بلال حمید خود کو فریش محسوس کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

ملک مصطفیٰ علی کو تمام رات اُم فروا کے خیال سونے نہ دیتے۔ اپنے لگژری بیڈروم میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے سگریٹ پھونکتے اُن کا دھیان بار بار اُم فروا کی طرف چلا جاتا۔ انہوں نے سگریٹ پینے کافی حد تک کم کر دیے تھے۔ لیکن آج کی رات انہوں نے بے حساب سگریٹ پھونک ڈالے تھے۔ جب سے ملک مصطفیٰ علی نے اُم فروا کو دیکھا تھا اُس فلیٹ میں جہاں بلال حمید اُم فروا کے ساتھ رہتا تھا۔ تب سے وہ شراب کی بوتل کے قریب تک نہیں پھٹکے تھے۔ نہ ہی غیر عورت کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے خود پر احکام کیوں مسلط کیے؟ خود نہیں جانتے تھے۔ شباب و شراب اُن کی زندگی میں لازم و ملزوم تھے' جو انہیں بہت آسانی سے میسر تھے۔ اب اُسی آسانی سے چھوڑ چکے تھے۔ کیونکہ انہیں ہر صورت اُم فروا کو اپنی زندگی میں شامل کرنا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے ایک مرتبہ پھر اُم فروا دوسرے مرد سے دھوکہ کھائے۔ اُس جیسی پاکیزگی اُس کے سراپے میں تھی۔ ملک مصطفیٰ علی کو خود اُس کے معیار تک لانا تھا۔ خود پر جبر کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن ناممکن نہیں ہوتا۔ اُم فروا کی تڑپ اُن کے دل میں خدا نے ڈال دی تھی۔ ایسا کب اور کیسے ہوا۔ وہ نہیں جانتے تھے۔ اس وقت دیوار گیر اسکرین پر چلنے والی ڈاکیومنٹری فلم کی طرف اُن کا دھیان نہیں بلکہ اُن کے اندر باہر اُم فروا اُتری ہوئی تھی۔ اگر کبھی اُم فروا کو معلوم ہو گیا کہ میں نے پہلے زندگی کس طرح گزاری ہے۔ وہ نہیں جانتی میرے بارے میں یقیناً وہ میرے متعلق یہ سمجھتی ہو گی میں شریف آدمی ہوں۔ جو صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے۔ زاہدوں' عابدوں کی صحبت میں اٹھتا بیٹھتا ہو گا' جس سے کبھی کوئی گناہِ کبیرہ سرزد نہیں ہوا ہو گا۔ اُسے علم ہو گیا تو مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اگر اُسے مجھ سے کوئی سروکار ہی نہ ہوا تو پھر؟''

''ہاں...... پھر وہ میری کیونکر پروا کرے گی۔''

''مصطفیٰ علی ہو سکتا ہے اُس نے تمہارے بارے میں کبھی سوچا ہی نہ ہو۔'' اُس کے ضمیر نے ہولایا۔

''میرا دل کہتا ہے اُم فروا ضرور مجھے سوچتی ہو گی۔ اگر نہیں سوچتی تو شاید کبھی سوچنا شروع کر ہی دے۔ اس کا ممنون ہوں میں۔ پہلے میں اچھا آدمی نہیں تھا۔ اُسے دیکھ کر اُس سے مل کر، اس کی آواز سن کر، اس کے پاکیزہ احساس کو محسوس کر کے۔ مجھے سمجھ آئی۔ میں جوانی اور پیسے کے نشے میں چور جو کرتا رہا' وہ بہت غلط تھا۔ ایسی غلطیوں کو ہی تو گناہِ کبیرہ کہتے ہیں جو بندہ اپنے ہوش و حواس میں کرتا ہے۔

مجھے شدت سے کوئی بار بار باور کراتا کہ میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ میں اپنی زندگی کی وہ شدید سرد رات کبھی نہیں بھولوں گا جب میرے وجود میں کسی نے میری کھال کھینچ لی تھی۔ باہر رگوں میں لہو جما دینے والی یخ بستگی تھی۔ لیکن میری رگوں کا خون کھولتا سیال بن کر میری نس نس میں بہہ رہا تھا۔ مجھے لگا میرے عمر رسیدہ ماں باپ میرا پیارا بھائی، میری بھابی مجھے کفن میں لپیٹ کر بہت گہری قبر میں اُتار رہے ہیں۔ میں محسوس کر رہا تھا' اُس گڑھے کی گہرائی میری گھبراہٹ بھری سانسیں ناپ رہی تھی۔ پھر وہ مجھ پر مٹی ڈال کر چلے گئے۔ میں نے چیخنا چاہا میرا حلق بند تھا۔ جیسے کسی نے میری آواز کو زنجیروں میں جکڑ لیا تھا۔ میرے جسم سے پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا میرے بال' میرا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ میں نے کوشش کر کے چیخنا چلانا چاہا' مدد کے لیے کسی کو صدائیں دینا چاہیں...... گھبراہٹ میں میری آنکھ کھل گئی' کلمہ پڑھتے ہوئے میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں وہ ملک مصطفیٰ علی جس نے سونے سے پہلے شراب تو ضرور پی تھی لیکن کلمہ کبھی نہ پڑھا تھا۔ ان لمحوں میں کس طاقت نے مجھ سے کلمہ پڑھوایا تھا۔ وہ میرا رب تھا جو واقعی میں میری شہہ رگ سے نزدیک تھا۔ وہ تو تھا ہی میرے پاس' میں ہی لاعلم رہا۔ اُسے کھوجنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا بہت ڈراؤنا خواب دیکھا تھا میں نے۔ صد شکر کہ یہ خواب ہی تھا۔ اِس خواب نے ملک مصطفیٰ علی کا لائف اسٹائل بدل دیا۔ اُن کی سوچیں

بدلنے لگی تھیں۔ پرانی ڈگر کی طرف جاتے ہوئے اب اُن کے پیر لڑکھڑاتے تھے۔ زندگی کے چھبیس سالوں میں کبھی انہوں نے ایسا نہ سوچا تھا۔ آخر یہ دنیا ہی اُن کے لیے جنت تھی۔ باقی جنتوں کو سوچ کر انہوں نے کیا کرنا تھا۔ امارت کا طنطنہ ہی کافی تھا اُن کے لیے۔ ملک مصطفیٰ علی کی سوچیں بدلنے والا کون تھا۔

''اُمِ فروا''

یک بارگی تبرک کی مانند یہ نام اُن کے بند ہونٹوں کی دراڑوں سے پھسلتا۔ اسی کو دیکھ کر مجھے خدا یاد آیا۔ پہلا خیال میرے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا تھا کہ اسے بنانے والا خود کس قدر حسین ہوگا۔ اس کے حسن کا فسوں میرے روم روم میں پھیلا۔ وہ بہت خاص الخاص تھی۔ صبر تحمل ایثار شکر ٹھہراؤ۔ سبھی کچھ تو تھا اُس میں با عصمت لڑکی با اخلاق صالحہ! احساس کی نپی تلی بار آوری کہیں بہت اندر کی ہر ہر پرت تک پھیلی تھی۔ پھر وہ وہ نہ رہے اُن کے اندر باہر اُمِ فروا کے احساس کی دھمال تھی اور ملک مصطفیٰ علی اپنی مانگ کے آخری بال تک اس میں ڈوب چکے تھے۔ اُس نے ان کو ان کے رب سے ملوا دیا تھا۔ پہلی ہی نگاہ میں کسی بشر کو دیکھ کر مقابل کو اُس کا خدا یاد آجائے......اُمِ فروا کی وجہ سے ملک مصطفیٰ علی کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ کیا وہ اُمِ فروا کو دیکھنے سے پہلے لادینیت کے مرتکب تھے؟ کیا دین سے کوسوں دور تھے وہ؟ کیا وہ صرف پیدائشی مسلمان تھے؟

دین کی سمجھ اور ہدایت پانے کی دعا خود مانگنے لگے تھے اپنے آپ کے لیے۔ رب کو انہوں نے ہر صورت منانا تھا۔ معافی کے لیے اُس کے دربار میں سربسجود ہونا تھا۔ خضوع و خشوع نیک نیتی کے ساتھ۔ اُس کی وحدانیت حاکمیت کا انہیں ادراک ملا اُس کے ہر جگہ موجود ہونے کا یقین پختہ ہوا۔ دین و مذہب کسے کہتے ہیں؟ رب کا حکم اُس کی فرمانبرداری کس طرح زنگ آلود دلوں میں جاگزیں ہوتی ہے یہ سب اُس مشکبار لڑکی سے مل کر انہیں معلوم ہوا۔ میں پہلے بدعمل تھا۔ اب نہیں ہوں۔ اگر وہ میرے نصیب میں لکھی ہوئی ہے تو میں صالح اعمال خود میں پیدا کرنے کے بعد ہی اُسے اپناؤں گا۔ شاید تب خود کو اُس کے قابل سمجھ لوں۔ ملک مصطفیٰ علی اس وقت خود کو قدرے اچھا محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے ایل سی ڈی آف کیا۔ خود پر لحاف ڈالتے سیدھی کروٹ لیٹ گئے۔ کلمہ پڑھتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ گہری نیند میں جارہے تھے۔

☆......☆......☆

اُمِ فروا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ ملک مصطفیٰ علی جلدی اس کے پیرنٹس سے بات کر کے اُسے چھوڑ آئیں۔ وہ یہاں سے فوری طور پر چلے جانا چاہتی تھی۔ لمحہ لمحہ وہ خودی میں آپ ہی آپ غرق ہوتی رہتی۔ زہریلی پھانس تھی جو اس کی سانسیں چوستی رہتی۔ کیسی اذیت ناکی سے دو چار تھی وہ کسی سے اپنا درد بانٹ نہیں سکتی تھی۔ لمحے عذاب بن کر اس پر گزر رہے تھے۔ وہ بلال حمید کے سامنے نہیں جاتی تھی۔ وہ گھر پر رہتا ہی کتنا تھا۔ اب وہ ہال کی طرف بھی نہیں آتا تھا۔ صبح جب فروا سو رہی ہوتی بیڈ روم اندر سے لاک کیے وہ اپنے کمرے سے نکلتا۔ کچن میں آکر ایک کپ چائے بناتا اور تیار ہو کر فیکٹری چلا جاتا۔ اپنے آنے جانے کے لیے اپنے کمرے کا باہر والا دروازہ ہی استعمال کرتا تھا۔ رات اکثر باہر سے کھانا کھا کر آتا۔ کئی دفعہ اُس نے ارادہ کیا کہ ملک مصطفیٰ علی سے اجازت لے کر وہ اپنی رہائش کا انتظام فیکٹری کے قریب کرلے۔ پھر خیال آتا اُمِ فروا بجیرا اپنے والدین کے پاس پہنچ جائے پھر میں یہ جگہ چھوڑ دوں گا۔ میری ہی وجہ سے وہ یوں دربدر ہوئی ہے۔ منجدھار اُسے نہیں چھوڑ سکتا۔ اُمِ فروا کا خیال جونک کی طرح اس کے وجود سے چمٹ چکا تھا۔

بلال ملک مصطفیٰ علی کے ساتھ آج اُمِ فروا کو اُس کے گھر بھیجنے کی بات پوری کرنا چاہتا تھا۔
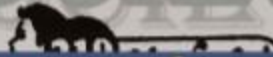
''ملک صاحب ایک نہ ایک دن تو مولوی صاحب سے سامنا ہونا ہی ہے۔ کیوں نہ جلد ہی اس حقیقت کو اُن کے گوش گزار کر دینا چاہیے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟''

''بلال آج میں فیکٹری نہیں جا رہا، نہ تم جاؤ گے۔ آج ہم مولوی صاحب کی طرف جائیں گے۔''

''درست پر ملک صاحب مولوی ابراہیم تو اپنے موچی گیٹ والے گھر میں شفٹ ہو چکے ہیں۔''

''اچھا تو پھر وہیں چلے جاتے ہیں۔ بلال جب تم اُمِ فروا کو بیاہ کر لائے تھے اُس وقت وہ کچی بستی میں رہتے تھے ناں؟''

''جی ملک صاحب اب وہ گھر مولوی صاحب نے بیچ دیا ہے۔ موچی گیٹ میں اُن کے دو گھر تھے۔ جو خاصے کشادہ اور کھلے ہیں۔''

''ہاں بلال میں سوچ رہا ہوں کہ یہ تو اچھی بات ہے مولوی صاحب دوسری جگہ شفٹ ہو گئے ہیں۔ نئی جگہ پر کسی کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اُمِ فروا کی شادی بھی ہوئی تھی۔''

''ملک صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ' خدا ہمارے لیے آسانیاں فرمائے۔''

''آمین۔'' ملک مصطفیٰ علی نے کہا۔

''یہاں پر بھی وہ جامعہ مسجد میں امامت کے منصب پر فائز ہیں۔''

''بلال تم نے وہ گھر دیکھا ہوا ہے؟''

''جی ہاں مولوی صاحب کے ساتھ ایک مرتبہ وہاں گیا تھا۔''

''ٹھیک ہے ہم ابھی نکلتے ہیں۔''

''ملک صاحب ابھی؟'' بلال حمید کے دل میں گانٹھیں بڑھتی جا رہی تھیں۔

''ہاں بھئی ابھی۔'' ملک مصطفیٰ علی نے بلال حمید سے مولوی صاحب کا نمبر لے لیا تھا۔

راستے بھر بلال حمید گم صم ہوں ہاں میں ہی جواب دیتا رہا۔ اس کا دل ٹکڑے ہو رہا تھا۔ وہ کس موڑ پر کھڑا تھا۔ کس قدر مجبور بے بس' وہ اپنی مدد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے خود ایسے اسباب پیدا کیے تھے کہ اُس کا دل و دماغ اس کی مدد کرنے سے انکاری تھے۔ مولوی ابراہیم بخش اس وقت مسجد میں تھے۔

ملک مصطفیٰ علی نے بلال حمید کو گاڑی میں ہی بیٹھنے کا مشورہ دیا تھا۔

''ملک صاحب یہ درست ہے۔'' بلال حمید نے صد شکر ادا کیا۔ ملک مصطفیٰ علی نے اُسے ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ گاڑی مین روڈ پر ایک سائیڈ پر کھڑی تھی۔ مسجد تک کے راستے کی ملک مصطفیٰ علی کو رہنمائی دی تھی۔ مسجد کے مینار دکھائی دے رہے تھے۔ راستہ چند گلیاں عبور کرنے کے بعد مسجد تک اختتام پذیر ہوا تھا۔

اس وقت مولوی ابراہیم بخش مسجد کے ہال میں اکیلے ہی تھے اور تلاوتِ قرآن پاک میں مشغول تھے۔ ملک مصطفیٰ علی اُن کے دائیں جانب بیٹھ گئے اور مولوی صاحب کی پُرسوز آواز میں عقیدت کے ساتھ تلاوت سننے لگے۔ یہاں کے ماحول میں غیر مرئی سکوت تھا۔ روح پرور احساس تھا' طمانیت آمیزی لیے مشکباری اطراف میں رچی ہوئی تھی۔ اس جگہ بیٹھ کر سانس لینا ملک مصطفیٰ علی کو بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ ساعتیں صندلی عطر و دبیز تھیں۔ مولوی صاحب پچاس سال سے زیادہ نہیں لگ رہے تھے۔ معمولی کاٹن کے کھلے ہوئے جوڑے میں ملبوس تھے۔ سر پر جالی دار ٹوپی' نیلے چیک والا سفید رومال اُن کے کندھوں پر تھا۔ داڑھی مہندی سے رنگی ہوئی تھی۔ اُن کے چہرے پر غیر معمولی بردباری' تمکنت' شگفتگی اور نرمی دکھائی دے رہی تھی۔ اُن کی تسلسل بھری آواز بہت میٹھی تھی۔ جو ملک مصطفیٰ علی کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ اندر سے کسی نے بُری طرح ملک مصطفیٰ علی کو زچ کیا۔

قرآن پاک بند کرتے ہوئے مولوی صاحب نے مسکرا کر ملک مصطفیٰ علی کی طرف دیکھا جوان سے خاصے مرعوب دکھائی دے رہے تھے۔ ملک مصطفیٰ علی نے سلام کرتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مولوی صاحب نے گرمجوشی سے اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ملک مصطفیٰ علی کی طرف چمکتی ذہانت بھری آنکھوں سے دیکھا۔

''مولوی صاحب میں ملک مصطفیٰ علی ہوں، میرے کسی جاننے والے نے محترم کا ذکر اس انداز سے کیا کہ دیکھنے کی چاہ یہاں تک لے آئی۔'' مولوی صاحب ملک مصطفیٰ علی کی بات کرنے کے دوران مسکراتے رہے۔

''جناب میں تو ایک معمولی آدمی ہوں۔ آپ نے ضرورت سے زیادہ تعریف کردی۔ بہرحال آپ کی اس محبت کا ممنون ہوں۔ یہاں تشریف لانے کی تکلیف آپ نے اٹھائی۔ اس کے لیے شکر گزار ہوں۔''

''مولوی صاحب ایسا کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' وہ نروس تھے کہ اس باوقار وضع دار مولانا صاحب کے سامنے بات کس طرح شروع کریں۔ ملک مصطفیٰ علی کی زبان گنگ ہورہی تھی۔ مولوی ابراہیم نے سوالیہ نگاہوں سے ملک مصطفیٰ علی کی طرف دیکھا۔ جیسے کہنا چاہ رہے ہوں ملک صاحب کچھ کہنا چاہ رہے ہیں آپ۔ بدستور نرمی گھل رہی تھی مولوی صاحب کے چہرے پر۔ ملک مصطفیٰ علی حواس باختہ اثبات میں سرہلا کر رہ گئے۔

''فرمایئے ملک صاحب۔''

''مولوی صاحب میرا ایک جاننے والا ہے، اُس کا مسئلہ آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا ہوں۔''

''فرمایئے۔'' مولوی صاحب ہمہ تن گوش تھے۔ ملک مصطفیٰ علی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا بات کہاں سے اور کیسے شروع کریں۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ سراسیمگی ہنوز برقرار تھی۔

''مولوی صاحب میرا جاننے والا گناہِ کبیرہ کا مرتب ہوا ہے۔ اُس سے پہلے کہ وہ گھناؤنا شر پھیلاتا اُس کے اندر انسانیت جاگ گئی۔ یقیناً خدا کی طرف سے اُسے ایسی گمراہی سے روکا گیا، سو وہ رُک گیا۔ کیونکہ خدا کا حکم نہیں تھا کہ وہ ایسے گناہ کا مرتکب ہو۔ وہ گناہ کرنے سے بال بال بچ گیا۔'' مولوی صاحب بغور ملک مصطفیٰ علی کو سُن رہے تھے۔

''مولوی صاحب پھر اُس شخص نے گناہ کرنے کا ارادہ بدل دیا۔ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی سچے دل سے، وہ رب سے معافی کا طلب گار رہا۔ اُس کی آنکھیں پل پل خدا کی ناراضگی کے خوف سے گیلی رہتی ہیں۔ میرے اس جاننے والے کا دل پھوڑا بن چکا ہے۔ سوچتا رہتا ہے پتا نہیں میرے مالک نے مجھے معاف کیا یا نہیں۔ میں معافی کے قابل نہیں ہوں۔ پر اوپر والا بے حد رحمٰن ہے۔ اپنے بندے کی خلوصِ دل سے مانگی گئی معافی کو معاف فرما دیتا ہے۔''

ملک مصطفیٰ علی اپنے اندر جھانک رہے تھے۔ گناہ تو گناہ ہوتا ہے چاہے وہ کسی بھی نوعیت کا ہو۔ ملک مصطفیٰ علی بلال حمید تم سے بہت بہتر ہے۔ سیاہ گناہ کی گھور اندھیری رات نے اُسے دہلا کر روک لیا۔ میں تو کچھ عرصہ پہلے تک شراب وشباب کے بغیر رہ نہیں پاتا۔ کیا میں اس قابل خود کو سمجھتا ہوں کہ بلال حمید کی حمایت کروں۔ پہلے اپنے گریبان میں تو جھانک کر دیکھ لوں۔ مصطفیٰ علی یہاں بھی تمہارا طمع حریص مردہ کھانے والے گدھ کی طرح جبڑے کھولے تمہیں اُکسا رہا ہے۔ کیونکہ تم ہر صورت اُم فروا کو پانا چاہتے ہو۔ کیا تم اُس کے قابل بھی ہو؟ بلال حمید تم سے بہت بہتر ہے۔ مولوی صاحب کی بیان کردہ آیتوں نے انہیں شرمندگی کی یخ بستیوں میں دھکیل دیا تھا۔ اس وقت وہ ہیجانی کیفیت کے زیرِ اثر تھے۔ بوجھل پپوٹوں کے نیچے براؤنش آنکھیں سُلگ رہی تھیں۔

مولوی صاحب کافی دیر سے ملک مصطفیٰ علی کو دیکھ رہے تھے۔ تب بنا کچھ کہے مولوی صاحب نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''ملک صاحب میں نے آپ کے سامنے جو آیات تلاوت کی ہیں۔ اُن سے پتا چلتا ہے وہ رب معاف کردینے والا مہربان ہے۔ جب بندہ خلوصِ نیت سے اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے گڑگڑا کے معافی مانگتا ہے تو وہ رب ضرور معاف کردیتا ہے تب اپنے کرم سے بندے کو نوازتا چلا جاتا ہے۔''

''مولوی صاحب جن لوگوں کو اُس آدمی نے تکلیف پہنچائی ہے کیا وہ بھی معاف کردیں گے؟''

''جناب یہ تو اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ اگر وہ اُس آدمی کو معاف کرتے ہیں تو خدا اُن سے اور خوش ہوگا۔ کیونکہ خدا معاف فرمانے والا ہے اور وہ معافی کو پسند فرماتا ہے۔'' اچانک ملک مصطفیٰ علی کی پیشانی پر عرق ریزی نمایاں ہوئی۔ 'آخر میں کیسے مولوی صاحب کو بتاؤں' ایسا آپ کی بیٹی کے ساتھ ہوا ہے۔ خداوند میری مدد فرما! مجھے ہمت دے تاکہ میں مناسب الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے مدعا مولوی صاحب کے گوش گزار کرسکوں۔ کافی دیر سوچنے کے بعد ملک مصطفیٰ علی بولے۔

''مولوی صاحب آپ کی صاحبزادی کا بلال حمید سے عقد ہوا ہے ناں۔''

''جی ہاں کیا آپ بلال حمید کو جانتے ہیں۔''

''جی ہاں اتفاقاً اُس سے ملاقات ہوئی تھی۔''

''بلال اچھا لڑکا ہے' اُس نے میری بیٹی کو خوش رکھا ہوا ہے۔ ایک مرتبہ وہ ملک مصطفیٰ علی کا ذکر کررہا تھا۔ اچھا تو وہ آپ ہیں۔ ملک صاحب اس وقت مسجد میں آپ کی کوئی خاطر مدارت نہیں کرسکتا۔''

''مولوی صاحب جو آیات میری سماعتوں میں اتریں اس سے بڑھ کر کیا خاطر کریں گے آپ میری۔'' ملک مصطفیٰ علی زور سے گال کھجاتے زبردستی کا مسکرائے۔

''مولوی صاحب دراصل میں بہت ضروری کام سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ مولوی صاحب آپ بلال حمید کو کتنا جانتے ہیں؟'' مولوی صاحب اُن کے سوال پر چونکے۔

''مجھے وہ نیک شریف اچھے خصائل کا لڑکا لگا۔''

''مولوی صاحب آپ نے کوئی چھان بین نہیں کی تھی شادی سے پہلے؟''

''ملک صاحب میں نے صرف اپنے رب کی ذات پر بھروسہ رکھا ہے۔ بیٹی جوان تھی، اُس کا فرض ادا کرنا میری اولین ترجیح تھی۔ جس میں دیر نہیں لگانا چاہتا تھا۔ بلال نے مجھ سے کہا تھا۔ مولوی صاحب آپ میرے ساتھ تلہ گنگ چلیں میں اپنے رشتے داروں سے آپ کو ملوا دیتا ہوں۔ والدین اُس کے وفات پاچکے ہیں۔ میں نے اُس کے کہے پر بھروسہ کیا۔''

''مولوی صاحب وہ آپ کے بھروسے کے ہرگز قابل نہیں تھا۔ آپ اُس سے دھوکہ کھا گئے۔ اُجلے چہروں کے پیچھے نجانے کتنے ماسک شدہ چہرے چھپے ہوتے ہیں۔'' لحہ بہ لحہ مولوی صاحب کے چہرے پر زردی کھنڈی جارہی تھی۔

''ملک صاحب آپ کھل کر بات کریں۔'' تب ملک مصطفیٰ علی نے نہایت شائستہ الفاظ میں خوش اسلوبی و خوش الحانی بھر سکتے تھے حلاوت ڈال سکتے تھے' ڈال دی۔ پر ایسا سچ تو زہریلے ناگ سے بھی زیادہ کڑوا اور جاں کنی کو برزخ تک پہنچانے سے بھی زیادہ اذیت ناک' روح ادھیڑنے والا ہوتا ہے۔ ملک مصطفیٰ علی نے نپے تلے

الفاظ میں مختصراً پوری بات مولوی صاحب سے کہہ ڈالی تھی۔ مولوی صاحب کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ وہ ٹکر ٹکر سامنے کی دیوار گھور رہے تھے۔ آنکھیں سپاٹ تھیں۔ جن میں شدید تکلیف کے بحر بیکراں مچل رہے تھے۔ اُن کی پیشانی عرق ریز تھی۔ گھبراہٹ میں بار بار داڑھی پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ انہیں کچھ بجھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ آنکھوں میں کسیلا دھواں بھر چکا تھا۔ مولوی صاحب ایک بار بھی نہیں بولے تھے۔ ملک مصطفیٰ علی نے جتنی دیر مولوی صاحب سے بات کی اُن کی نگاہیں جھکی رہیں۔ بات ختم کرنے کے بعد ملک مصطفیٰ علی میں ہمت نہیں تھی مولوی ابراہیم بخش کی طرف دیکھنے کی۔ وہ مولوی صاحب کو مخاطب کیسے کرتے۔ لمحے سرکتے رہے، وہ دونوں خاموش تھے۔ اچانک مولوی صاحب کی بھرائی ہوئی آواز ملک مصطفیٰ علی کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ملک صاحب میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے میری بچی کی مدد کی۔''

''نہیں مولوی صاحب میرا اس میں کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ سب اللہ کی طرف سے ہوا ہے۔ آپ نے جس خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی بیٹی کو بیاہا تھا اُسی رب شاید اُسی وقت سے آپ کی بیٹی کی حفاظت کا ذمہ لے لیا تھا۔ پھر کیسے غلط ہوتا۔''

''ملک صاحب آپ درست فرما رہے ہیں۔ وہ پروردگار کارساز ہے۔ میرا بیٹا اسماعیل بخش گھر پر نہیں ہے۔ میں ابھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں اور اُم فروا کو لے آتا ہوں۔'' ملک مصطفیٰ علی سوچ میں پڑ گئے کیونکہ اس وقت بلال حمید گاڑی میں موجود تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے بلال حمید کا مولوی صاحب سے سامنا ہو۔ ملک مصطفیٰ علی نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ضرور میں آپ کو لے کر چلتا ہوں۔ مولوی صاحب کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ شام کو میں خود آ کر آپ کو لال حویلی لے جاؤں۔ اس دوران آپ اپنے گھر والوں سے بات کر لیں۔ میں بھی اُم فروا کو ذہنی طور پر تیار کر لوں کہ مولوی صاحب انہیں لینے آ رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب۔'' بیٹھی ہوئی آواز اب بھی مولوی صاحب کے گلے میں پھنس رہی تھی۔

''ملک صاحب میں اپنے گھر والوں کو مختصراً بتاؤں گا کہ اُم فروا اور بلال حمید میں علیحدگی ہو گئی ہے۔ مزید نہیں بتا سکتا۔ اُس کی ماں، بہن یہ صدمہ سہار نہیں سکیں گی۔ آپ بھی اُمِ فروا کو سمجھا دیں کوئی مناسب جواز بنا کر اتنا ہی ماں، بہن کو بتائے۔''

مولوی صاحب بظاہر خود میں ہمت پیدا کر رہے تھے۔ لیکن اندر سے وہ ریزہ ریزہ ہو چکے تھے۔ اُن کی ہمتیں جواب دے چکی تھیں۔ ایسی تلخ حقیقت جاننے کے بعد اس وقت وہ سخت نقاہت و لاغر پن محسوس کر رہے تھے۔ لیکن ہمیشہ خدا کی ذات پر صبر شکر کرنے والے تھے۔ ایک تکلیف دہ ٹوٹ پھوٹ اُن کے اندر جاری تھی۔ دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ لیکن ہر سانس کے ساتھ خدا کا شکر ادا ہو رہا تھا۔

''مولوی صاحب آپ سے ایک گزارش ہے آپ بلال حمید کو معاف کر دیں۔ وہ اپنے کیے پر سخت نادم ہے۔ وہ خود آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔''

''ملک صاحب میں نے خدا اور اُس کے رسولؐ کے صدقے میں اُسے معاف کیا۔ آپ اُس سے کہیں کبھی میرے سامنے نہ آئے۔'' اچانک سے مولوی صاحب کی آواز رندھ گئی۔ ایک دلخراش گھٹی گھٹی سسکی انہوں نے گلے کے اندر جبر اُسفا کی سے روکی۔ وہ خدا کی ذات پر بھروسہ کرنے والے صابر و شاکر انسان تھے۔ اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو دھاڑیں مار مار روتا لیکن مولوی ابراہیم بخش اپنے لیے اپنے خدا سے آسانیاں مانگ رہے تھے۔

اس صدمے کو سہنے کی ہمت کی طلب کر رہے تھے۔

''مولوی صاحب بہت بہت شکریہ۔ اب اجازت چاہوں گا۔ شام پانچ بجے میں آپ کو لینے آؤں گا۔ آیئے میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ دوں۔''

''شکریہ میں چلا جاؤں گا۔ اسی گلی میں ہے میرا گھر۔ پہلے میں شکرانے کے نوافل ادا کرنا چاہوں گا۔'' گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بمشکل وہ اٹھے اور نفل کی نیت باندھ لی۔

ملک مصطفیٰ علی کے دل کا بوجھ کافی حد تک اُتر چکا تھا۔ وہ اٹھے اور آہستہ روی سے مسجد کا صحن عبور کرتے ہوئے دروازہ پار کر کے گلی میں آ گئے۔ گلی سے گزرتے ہوئے اُن کی نظر ایک گھر کے سامنے لگی 'مولوی ابراہیم بخش' کے نام کی تختی پر پڑی۔ انہوں نے بغور گھر کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

اس ویک اینڈ بلال حمید کو نورین کی والدہ کا فون آ گیا۔ وہ اٹھ تو کب کا گیا تھا لیکن ابھی تک بستر میں تھا۔ وہ اتنی جلدی اُٹھ کر کرتا بھی کیا؟ کون تھا اُس کا منتظر...... ویک اینڈ پر وہ سخت بوریت محسوس کرتا۔ اس کے پاس کچھ کرنے کو ہی نہیں ہوتا تھا۔ نورین کی والدہ بلال حمید سے کہہ رہی تھیں۔

''بلال بیٹا اگر مناسب سمجھو تو ہمارے ہاں چکر لگا لو۔ دراصل میرا بیٹا محمود اپنے سسرال ملتان گیا ہوا ہے۔ آج ویک اینڈ پر نورین نے خاص دیسی لاہوری کھانا بنانے کا ارادہ کیا ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں بیٹا کہ آپ لنچ ہمارے ساتھ کرو۔''

''جی کیوں نہیں!'' وہ کچھ ہکلایا۔ بلال حمید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا جواب دے نورین کی والدہ کو۔ اچھا ہے تھوڑا ٹائم اُن کے ساتھ گزار لے گا تو بہتر ہے۔ یہ سوچ کر اُس نے حامی بھر لی تھی۔

''ٹھیک ہے جی دوپہر تک میں حاضر ہو جاؤں گا۔'' اس طرح بلال کی نورین کی فیملی سے مکمل شناسائی ہو گئی اور اب بلال حمید کو بھی نورین کے گھر جانا اچھا لگنے لگا تھا۔ یہاں آ کر اُس کا دھیان بہت حد تک بٹ جاتا تھا۔ نورین کبھی اُس کو عام نہیں لگی تھی بلکہ اُس کا خیال بلال حمید کو اکثر آتا۔ وہ اکثر احمد کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر جاتا۔ احمد بلال حمید سے مانوس ہونے لگا تھا۔ بلال احمد کے ساتھ خود کو فریش فیل کرتا تھا۔ نورین کی والدہ باتوں باتوں میں بلال حمید کے متعلق جاننے کی کوشش کرتیں۔

محمود سے بھی بلال حمید کی ملاقات ہو گئی تھی۔ محمود اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک سیدھا سادہ سا انسان تھا۔

اب بلال ہر ویک اینڈ پر نورین کے گھر انوائٹ ہوتا تھا۔

محمود اپنی بیوی کے سامنے جورو کا غلام بنا ہوا تھا۔ بچوں کی خاطر بیوی کی بک بک جھک جھک برداشت کر لیتا۔ عابدہ نورین کو ایک آنکھ برداشت نہیں کرتی تھی۔ گھر میں ہر وقت کِل کِل رہتی۔ آئے دن روٹھ کر میکے چلی جاتی۔ ماں جی نورین کی وجہ سے ویسے ہی پریشان رہتی تھیں، وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اکلوتے بیٹے کی زندگی اس طرح ڈسٹرب ہوتی رہے۔ وہ جلد سے جلد نورین کی دوسری شادی کے لیے فکر مند تھیں۔ ڈرتی تھیں کہیں عابدہ اُن کی بیٹی کے متعلق غلط سلط باتیں خاندان بھر میں نہ پھیلا دے۔ یہ ماؤں کے واہمے بھی بڑے عجیب ہوا کرتے ہیں۔ بلال حمید سے چند ملاقاتوں کے دوران انہوں نے اپنے خدشات شیئر کیے تھے۔

اُس روز وہ بلال حمید سے کہہ رہی تھیں۔ ''بیٹا آپ کی نظر میں کوئی اچھا رشتہ ہو تو ضرور بتایئے گا۔''

''ضرور۔''

''بیٹا آپ کو دیکھ کر لگتا ہے آپ اچھی فیملی سے تعلق رکھتے ہو۔ آپ مجھے پہلی ملاقات میں ہی اچھے اخلاق و دل کے لگے ہو۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں پیشانی پر محراب کا نشان بنا پوچھے تمہارے خصائل کا پتا دیتا ہے۔ اس لیے تمہیں اولیت دیتے ہوئے خود تم سے بات کرنے میں عار محسوس نہیں کر رہی ہوں۔ اب فیصلہ تو تمہیں ہی کرنا ہے۔''

''میں آپ کو سوچ کر جواب دوں گا۔ آپ خدا پر بھروسہ رکھیں۔''

بلال حمید انہیں یہ نہ بتا سکا۔ میری پیشانی کے محراب کی وجہ بھی ایک پارسا لڑکی ہے۔ بلال حمید کافی سوچ بچار کے بعد اس فیصلے پر پہنچا تھا کہ اُسے نورین سے شادی کر لینی چاہیے۔ اس طرح اُس کی زندگی قدرے بہتر ہو جاتی اور اُم فروا کے خیالات سے بھی نجات مل جاتی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اُم فروا کی محبت تا حیات اُس کے دل سے نہیں نکل سکتی تھی اور نہ ہی اُس کے خیال کے بغیر وہ زندہ رہ سکتا تھا۔ اگر نورین میری زندگی میں آجاتی ہے تو در در بھٹکنے سے بچ جاؤں گا۔ میرا گھر آباد ہو جائے گا۔ میرا وقت نورین کی سنگت میں اچھا گزرے گا۔ میری زیست کو منجمد و بے ثبات کر دینے والا آئس برگ پگھلے گا۔ اُس کے بہاؤ میں آسودگی میسر آجائے گی۔ ہم دونوں دکھی ہیں، ایک دوسرے سے دل کا حال بانٹ سکیں گے۔

نورین اچھی لڑکی ہے، اُسے بھی سہارے کی ضرورت ہے۔ کیوں نا ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بن جائیں۔ زندگی کٹھن ہے۔ اس کی شاہراہ پر قدم قدم سہاروں کی ضرورت پڑتی ہے، کسی پارٹنر کے بغیر زندگی گزارنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ مجھے نورین کا ہاتھ تھام لینا چاہیے، تب شاید زندگی کچھ آسان ہو جائے۔ نورین کو میں سب کچھ بتا دوں گا کہ میں ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ اُس کی شادی کہیں اور ہوگئی۔ ٹھیک ہے میں نورین سے بات کر کے کوئی حتمی فیصلہ کروں گا۔'

☆......☆......☆

اُس روز کئی دنوں بعد ثمرین کا فون آیا تھا۔ بلال حمید اُس کی آواز سُن کر خوش ہوا تھا۔

''کیسی ہو ثمرین؟''

''میں خیریت سے ہوں تم کیسے ہو بلال؟''

''میں...... ہاں میں بہت اچھا ہوں۔''

''واؤ بہت اچھے ہو تم؟''

''کیا اچھی بات نہیں ہے؟'' سوال پر سوال ہو رہے تھے۔

''بلال مجھے کبھی یاد کیا؟'' اس کی طرف سے پھر سوال ہوا۔

''ہاں جب کبھی رات کو نیند نہیں آتی تھی تب تمہیں یاد کرتا تھا کہ تمہارا فون آجائے، تھوڑی گپ شپ ہو جائے گی۔ ہمیشہ تم سے بات کرنے کے بعد مجھے نیند اچھی آتی تھی۔''

''بس اتنا ہی واسطہ ہے تمہیں مجھ سے؟'' وہ مسکرا کر خاموش رہا۔ توقف بعد بولا۔

''یہ بتاؤ تم کہاں غائب تھیں؟''

''یہیں پر تھی، بس تھوڑی مصروف تھی۔''

''کیسی مصروفیات تھیں؟'' بلال حمید کی آواز میں کھنچاؤ پھیلا تھا۔ سیاہ گھنیرے بالوں میں وہ بار بار انگلیاں پھنسا رہا تھا۔ وہ خالی الذہنی کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔ ثمرین کی ہنسی کی آواز بلال حمید نے سنی۔

''تم مردوں کی عادت ہوتی ہے طنزیہ باتیں کرنے کی۔''

''اچھا۔'' وہ خجل ہو کر مسکرایا۔

''میرے ہزبینڈ ترکی سے آئے ہوئے ہیں۔''

''اچھا...... اچھا خیر سے شادی شدہ ہو؟''

''خیر سے میرے دو بچے بھی ہیں۔ میں اپنے ہزبینڈ سے بہت محبت کرتی ہوں۔''

''اور دوسروں کو فون بھی ڈیلی کرتی ہو؟'' ثمرین کی بات اچکتے ہوئے وہ پھر طنز کر گیا تھا۔

''اب تمہیں فون نہیں کروں گی۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''واٹ؟''

''کیونکہ میں ترکی شفٹ ہو رہی ہوں۔''

''وری گڈ!'' بلال واقعی خوش ہوا تھا۔

''بلال میں نے تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ جب میں اُداس و پریشان ہوا کرتی تو میں تمہیں فون کرتی۔ تم سے تھوڑی دیر باتیں کر کے میرا دھیان بٹ جاتا۔ اُن پریشانیوں سے مجھے وقتی نجات مل جاتی جنہوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ تم سے بات کرنے کے بعد میں پُرسکون ہو جایا کرتی تھی۔ اچھا اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا۔''

''ثمرین تم بھی اپنا خیال رکھنا۔'' دوسری طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑا موبائل دیکھتا رہا۔ بے خودی میں مسکرایا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆......☆......☆

اس دن بلال حمید نے نورین سے فون پر کہا تھا۔ آفس آف ہونے پر آپ مجھ سے کہیں مل سکتی ہیں؟ آپ میرے ساتھ بائیک پر بیٹھ سکتی ہیں؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''ایسا مجھے پسند نہیں۔ باہر ملنے کی بجائے آپ ویک اینڈ پر میرے گھر آ جائیں، عابدہ بھابی بھی میکے گئی ہوئی ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں آ جاؤں گا۔''

☆......☆......☆

اتوار کی اس دوپہر بلال حمید نورین کے گھر پہنچ گیا تھا۔ آج بھی نورین نے پُرتکلف کھانا تیار کر رکھا تھا۔ اس کی والدہ بلال حمید کو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح خوش ہوئی تھیں۔ نورین ڈرائنگ روم میں بلال حمید کے لیے کولڈ ڈرنک لائی اور وہیں بیٹھ گئی۔

کچھ دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی رہی، پھر بلال حمید نے گلا کھنکار کر جھجک ہٹائی۔

''نورین مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔''

''کہیے میں سُن رہی ہوں۔''

''نورین آپ کی والدہ مجھے ایک اچھا لڑکا سمجھتی ہیں۔''

''وہ درست ہی سمجھتی ہیں۔'' نورین نے نگاہیں جھکائیں۔ بلال اُس کی صاف گوئی پر محظوظ ہوا۔

''کافی صاف گو ہیں آپ؟''

''بلال صاحب انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ میری والدہ نے میرے بارے میں آپ کو ہر بات سچائی سے بتا دی ہے۔''

''نورین اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' ''میں سُن رہی ہوں۔''

''آپ کو میرے ساتھ رشتہ طے ہونے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''بلال صاحب میں یہ بات نہیں جانتی۔ میرا دل بار بار آپ پر اعتبار کرنے کو مجھے اُکسا رہا ہے۔''

''میں نے آپ کی والدہ کو بتایا تھا اس نوکری کے علاوہ میرے پاس کوئی جائیداد نہیں ہے۔''

''بلال صاحب ہر انسان اپنے حصے کا دانا پانی خود اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ جو میری قسمت میں ہوگا ہر صورت مجھے مل کر رہے گا۔ دولت کی فراوانی میری نظر میں اہمیت نہیں رکھتی۔ میں سادہ زندگی بسر کرنے والی عورت ہوں۔ ہمیشہ سادگی کو ترجیح دی۔ میری والدہ نے روزِ اول سے مجھے صبر شکر کی تلقین کی ہے۔ بچپن میں ماں کا دیا درس آج بھی میرے پلّو کے ساتھ بندھا ہے۔ شدید نامساعد حالات میں بھی صبر کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا کیونکہ مجھے خدا کی ذات پر بھروسا ہے۔'' ''نورین میں اپنے بارے میں کچھ اور بھی بتانا چاہتا ہوں۔''

''آپ کہیں۔'' وہ اب بھی تین گز دوپٹے کی بکل مارے بلال حمید کے سامنے بیٹھی تھی۔

''مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوئی تھی۔ ایسا پیار کہ خود کو بھی فراموش کر بیٹھا ہے۔ بے طرح ٹوٹ کر اُسے چاہا، ایسے جیسے سورج کی ہیرے کی مانند دمکتی کرنیں کائنات پر اپنے پر پھیلاتی ہیں۔ چہرہ دیکھنے کے بعد تمام حسن اُس کے سامنے ماند تھا۔ دل کے نہاں خانوں میں وہ چہرہ ایسے آباد ہوا کہ کسی اور چہرے کو دیکھنے کی خواہش کبھی دل میں نہ ابھری۔'' اچانک سے بلال حمید کی آواز رندھ گئی۔ اُس نے ایک ہنکارا ابھرا۔

''میری روح میں آج بھی اُس کا پیکر آباد ہے۔ خدا نے مجھے اُس کی چاہت کی سلطنت بخشی ہے۔ شاید اُس کے خیال سے چھٹکارا نہ پاسکوں۔ میرے صحرا دل پر اُس کے خیالوں کی برسات رہتی ہے۔ میں چاہوں بھی تو اُس کے احساس کی مہک کو اپنے اندر سے کھرچ نہیں سکتا۔ یہ سب میری مجبوری ہے کیونکہ میرے بس سے باہر ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کبھی آپ کے ساتھ ناانصافی نہیں کروں گا کیونکہ وہ میرا کل تھی اور آپ آج۔

''بلال صاحب اگر آپ میرے کل کو بھلا کر مجھے اپنانے کے لیے تیار ہیں۔ پھر میں اُس لڑکی کے لیے اپنا دل کیوں تنگ کروں۔ وہ آپ کا گزرا ہوا کل ہے۔''

''نورین اُس لڑکی کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔''

''بلال صاحب آپ نے اُسے دعائیں دی ہوں گی کہ وہ ہمیشہ خوش رہے؟'' ''ہاں میں نے اُسے بہت دعائیں دی۔ وہی لڑکی میری پیشانی پر بنے محراب کی وجہ بھی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خلاؤں میں گھورنے لگا۔

☆......☆......☆

مولوی صاحب اُم فروا کو گھر لے آئے تھے۔ ملک مصطفیٰ نے اُمِ فروا سمجھا دیا تھا کہ بلال حمید سے علیحدگی کی بابت معقول طریقے سے ماں بہن کو مطمئن کر دے۔ بلال حمید کا آپ سے شادی کرنے کا ارادہ تھا اس کے متعلق کسی سے ہرگز کوئی بات نہ کرے۔ اسماعیل سے مولوی صاحب خود بات کریں گے۔ اُم فروا آپ بس یہ سمجھیں کبھی آپ کی شادی ہوئی نہیں تھی۔ آپ جیسے پہلے تھیں اب بھی ویسی ہی ہیں۔ اگر

اس سوچ کو اپنے ذہن میں بٹھا لیں گی تو خوش رہیں گی۔ مانا کہ یہ سب مشکل ہے لیکن آپ کوشش ضرور کریں۔ اگر آپ خوش رہیں گی تو آپ کے گھر والے بھی تسلی پالیں گے۔ اُم فروا! ابھی آپ کی عدت میں چار مہینے مزید ہیں۔ میں فون پر آپ سے رابطے میں رہوں گا۔''

اُم فروا نے بمشکل اثبات میں سر ہلایا۔ اپنوں کے درمیاں آ کر اُم فروا بہت مطمئن تھی۔ یہ تکلیف دہ خیال اسے نہیں ستاتا تھا کہ وہ کسی غیر کے گھر میں تنہا رہ رہی ہے۔ اب اس کے چہرے پر گھبراہٹ، بے بسی اور خوف نہیں چھلکتا تھا۔

یہ نیا محلہ تھا۔ اس گھر میں یہ سب پہلے نہیں رہے تھے۔ ساتھ ساتھ بنے یہ دونوں گھر مولوی صاحب نے خریدے تھے تو فوراً کرائے پر دے دیے تھے۔ اس لیے محلے میں کسی سے آشنائی نہیں تھی نہ ہی کوئی جانتا تھا کہ اُم فروا کی شادی ہوئی ہے۔ اب محلے داروں کو یہ پتا چلنے لگا تھا کہ مولوی صاحب کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ بے بے جی نے علیک سلیک کے علاوہ کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔

مولوی صاحب نے بے بے جی کو مختصراً بتایا تھا کہ بلال حمید ایک مشکوک آدمی تھا۔ تمہاری بیٹی اور اس کا میل نامناسب تھا، اس لیے اُم فروا کو علیحدگی دلا دی ہے۔ خدا کا بھی یہی حکم تھا اور ہمارے حق میں بھی یہی بہتر تھا۔ اُم فروا کی ماں اب اس کے بارے میں آپ مجھ سے کوئی سوال نہیں کرنا۔ بس یہی سوچنا، وہ خواب تھا، آنکھ کھلی ٹوٹ گیا۔ اُم فروا جیسے پہلے ہمارے ساتھ رہ رہی تھی اب بھی اسی طرح رہے گی۔''

اُم فروا نے بھی بے بے جی کو یہی بتایا تھا کہ بلال حمید اچھا آدمی نہیں ہے۔'' تب بے بے جی نے اُم فروا سے کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا۔ بے بے جی نے پہلے ہی اُم زارا کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اسی لیے اس موضوع پر اُم زارا نے اُم فروا سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ کوئی بھلا کیا بات کرتا، یہ حادثہ کوئی چھوٹا تو نہیں تھا۔ بہت تکلیف دہ تھا۔ مولوی صاحب اور ملک مصطفیٰ علی کے درمیان کیا بات ہوئی تھی۔ ملک مصطفیٰ نے اُم فروا کو سب کچھ بتا دیا کہ کس طرح انہوں نے طریقے سے مولوی صاحب سے بات کی تھی۔ ورنہ وہ پریشان تھی کہ نہ جانے ملک مصطفیٰ علی نے کس انداز میں ابا جی سے بات کی ہوگی۔

وہ بلال حمید کو سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تنہائی میں یہ سوچ کر اکثر کانپ کانپ جاتی تھی کہ بلال حمید میرے ساتھ کیا کرنے والا تھا۔ اگر خدا اس کے دل میں میرے لیے رحم نہ ڈالتا تو؟؟؟ بس یہ سوچ کر ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور وہ جھرجھری لیتی سختی سے آنکھیں بند کر لیتی۔

مت سوچا کرو یہ سب۔ اللہ نے تمہیں بچا لیا، وہ مسکراتی آسمان کی طرف دیکھتی۔ 'صدقے جاؤں میرے پیدا کرنے والے، تُو نے میرے بھروسے، میرے یقین کی لاج رکھ لی۔'' تشکر سے اُم فروا کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اس کے تشکرانہ سجدے اب اور طویل ہو گئے تھے۔ پہلے کی طرح اُم فروا نے گھریلو امور سنبھال لیے۔ بے بے جی شروع شروع میں پریشان رہیں پھر انہیں بھی صبر آنے لگا اب وہ مطمئن نظر آتی تھیں۔

''پروردگار وہی اُم فروا کے لیے بہتر تھا جو تُو نے عطا کیا۔'' اُم فروا کی آنکھوں میں اب پہلے والی چمک نہیں رہی تھی۔ درخشاں گلابی گالوں کے منعکس ہوتے رنگ جانے کہاں کھو گئے تھے۔ بے سکونی حد سے بڑھتی تو وہ یاحی یاقیوم پڑھنے لگی۔ ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ سجا لیتی۔

(عشق کی راہداریوں میں، زندگی کی سچ بیانیوں کی چشم کشائی کرتے
اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط، انشاء اللہ آئندہ ماہ جون میں ملاحظہ کیجیے)

انتخابِ خاص

فرخندہ لودھی

نقشِ پا

اپنا پیر ہلاتے ہوئے اس نے بہت سی ٹانگوں کے ہجوم میں پائیدان پر دھرے پیروں کو دیکھنا چاہا' وہاں لاتعداد پیر موجود تھے' گورے' کالے' سانولے' گندے پیر' جرابوں میں بند بوٹوں والے پیر' اتنے سارے پیروں میں حمید سے اپنا پیر نہ پہچانا گیا......

ذخیرہ ادب سے ایک یادگار انتخاب

بس میں انتشار تھا کہ خدا کی پناہ۔ انسان پر انسان نہیں' پیروں پر پیر سوار تھے۔ ہر شخص کو اپنی منزل پہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ حمید کو آج پھر دفتر سے لیٹ ہونے کا ڈر تھا۔ وہ جو تیار ہونے سے لے کر دفتر پہنچنے تک کے وقت

کا ایک تخمینہ رکھتا تھا' وہ آج آدھے سے زیادہ گھر میں ہی ختم ہوگیا تھا۔ پپو کو رات سے بخار چڑھا ہوا تھا۔ اس کے لیے دوا لانی ضروری تھی۔ تیار ہو کر نکلنے لگا تو ماں نے سبزی لینے بھیج دیا۔ وہ ماں کو منع کر سکتا تھا مگر پھر یاں کو خود جانا پڑتا یا بیوی کو پھر پپو کو بخار تھا اور سبزی بھی آنی تھی۔

بس اتنی بھری ہوئی تھی کہ وہ بمشکل پائیدان پر یا پیر ٹکا کر لٹک سکا۔ اس نے سوچا' اگلے اسٹاپ پر یقیناً لوگ اتریں گے تو کچھ نہ کچھ جگہ بن ہی جائے گی۔ چلتی بس سے وہ گزرتی عمارتوں کو فٹ پاتھ پر چلتے تیز تیز مردوں کو' عورتوں اور بچوں کو گزرتے دیکھتا رہا۔ سب کو کہیں نہ کہیں پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس کا ایک پیر مسلسل ہوا میں معلق تھا اور ایک پیر کے سہارے وہ بس میں سوار ہونے کا الزام اٹھائے ہوئے تھا۔ وہی اکلوتا پیر کسی کے بھاری جوتے تلے کچلا گیا تو وہ بلبلا اٹھا۔ پاؤں کھینچ لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک پیر پر ہی تو کھڑا تھا۔ ایک تکلیف دہ چیخ کے ساتھ اس نے نیچے کی طرف نگاہ کی مگر بے شمار پیروں کے ہجوم میں اسے اپنا پیر کہیں نظر نہ آیا۔ کسی دوسرے شخص کا جوتا بدستور اس کے پیر پر سوار تھا۔

''ارے یار' میرا پیر تو چھوڑ دے۔'' تکلیف کی شدت میں اس کے منہ سے بے اختیار ایک چھوٹی سی گالی پھسل گئی۔ اس نے بہ وقت اپنا دبا ہوا پیر ہلانے کی کوشش کی تاکہ بھاری جوتے کو احساس ہو کہ وہ ایک معصوم چپل پر سوار ہے۔

اپنا پیر ہلاتے ہوئے اس نے بہت سی ٹانگوں کے ہجوم میں پائیدان پر دھرے پیروں کو دیکھنا چاہا' وہاں لاتعداد پیر موجود تھے' گورے' کالے' سانولے' گندے پیر' جرابوں میں بند بوٹوں والے پیر' اتنے سارے پیروں میں حمید سے اپنا پیر نہ پہچانا گیا۔

'ارے' ان پیروں میں میرا اپنا پیر کون سا ہے؟' اس نے خود سے پوچھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ 'کیا میرا حافظہ ختم ہوگیا ہے؟' وہم کی سرد لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ گھبرا کے اس نے پھر پیروں کے ہجوم میں اپنا پیر تلاش کرنا چاہا۔ 'ارے' میرا پیر کہاں گیا؟ ان پیروں میں میرا پیر کون سا ہے؟' اس نے پھر خود سے پوچھا۔ کچلے جانے کے سبب ابھی تک اس کا پیر درد کر رہا تھا مگر وہ اپنے پیر کو تلاش کرنے سے قاصر تھا۔ ابھی وہ اس کرب میں مبتلا تھا کہ اسٹاپ پر بس رکی۔ اندر سے کچھ بچے اور ایک ادھیڑ عمر برقع پوش عورت پائیدان پر آ کے ایسے گرے جیسے کسی بدسلیقہ عورت نے گھر کا دروازہ کھول کے کوڑے کا تھیلا گھر سے باہر اچھال دیا ہو۔ بے چاری عورت کے برقع کا نقاب اس کی گردن میں پھانسی کے پھندے کی طرح اٹکا ہوا تھا۔ اس کے گھٹے ہوئے گلے سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

''اتنی سواریاں کیوں ٹھونس لیتے ہو کم بختو۔ اللہ تمہارا بیڑہ غرق کرے۔ ستیاناس ہو تمہارا' ذلیل' لالچیو' کچھ تو خوف کرو خدا کا۔ چھوٹے چھوٹے ان بچوں پر تو رحم کھاؤ کمینو۔''

''اماں جی! تم بھی تو ترس کھاؤ' ایک ٹکٹ میں اتنی پنیری؟''

کنڈیکٹر نے ایک ایک کر کے پانچ بچے بازو سے اٹھا اٹھا کے فٹ پاتھ پہ رکھ دیے اور بس چلانے کا اشارہ دیا۔ کنڈیکٹر کی بات سن کے پائیدان پہ لٹکا ہجوم بے اختیار ہنس پڑا۔ کنڈیکٹر نے بس کے ہینڈل کے ساتھ جھولتے ہوئے آواز لگائی۔

''منٹ' واہگہ' شالیمار' چلو' چلو' چلو۔''

حمید سے ضبط نہ ہو سکا۔ کنڈیکٹر کی بے حسی پہ وہ جھنجھلا اٹھا۔ ''یار' کچھ تو خیال کر' پہلے ہی بندے پہ بندہ چڑھا ہوا ہے۔''

''صاحب جی' جب تک عوامی حکومت رہے گی' ایسا ہی چلے گا۔'' کنڈیکٹر نے خوش دلی سے کہا۔

''اور اللہ چاہے تو عوامی حکومت سدا رہے گی۔''

''اور اللہ چاہے تو ہمارا کاروبار بھی ایسے ہی رہے گا' بہار و بہار' یار' ہمارا وقت آیا تو آپ لوگ فریاد کرنے لگے ہو؟'' کنڈیکٹر چڑ کر بولا۔ سواریوں میں سے کسی نے کنڈیکٹر کی بات کا نوٹس نہ لیا۔ پائیدان پہ مزید سواریوں کے پیر بڑھ گئے تھے۔ حمید نے مشکل سے پیر بدلا اور دوسرے تازہ دم پیر کے سہارے پھر بس کے ڈنڈے

کے ساتھ لٹک گیا۔ کنڈیکٹر کی بات نے اس کے ذہن میں کھلبلی مچادی تھی۔ ڈنڈے کے ساتھ لٹکے لٹکے وہ اپنے اندر کنڈیکٹر سے مخاطب ہوا۔

''بھائی' ہمیں یہی تو گلہ ہے' یہی تو فریاد کرتے ہیں ہم مگر ہم ہیں کون؟ ہماری چیخیں' ہماری آہ وفغاں سنتا کون ہے؟ بھلا ہم کس کھیت کی مولی ہیں؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے اپنے پیر نہیں مل رہے تھے' جہاں پیروں کی شناخت ختم ہوجائے' وہاں انسان کیسے پہچانے جاسکتے ہیں؟ اب دیکھو' اس بس کے پائیدان پہ پیر ایسے ایک دوسرے پر چڑھے کلبلا رہے ہیں جیسے برسات میں کیچوے۔ مجھے تو میرے پیر کے درد نے احساس دلایا تھا کہ وہ ہے اور وہ میرا پیر ہے۔ اس کا میرے جسم' میرے وجود سے کچھ تعلق ہے ورنہ مجھے اب بھی پتا نہیں کہ میرے پیر کہاں ہیں؟ میں خود کہاں ہوں کیونکہ میرا ایک پیر ہوا میں معلق ہے اور دوسرا پائیدان پہ دھرا ہے اس لیے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میں بس میں سوار ہوں یا ہوا میں لٹکا ہوں؟''

''پیسے نکالیں جی' پیسے۔'' کنڈیکٹر پائیدان کی 'ٹیک پیری' سواریوں کے سر پر کھڑا ہو کر کاروباری لہجے میں اونچی آواز سے بولا۔

''ذرا دیکھو' پیسوں کی کیسی جلدی پڑی ہے۔ اس حالت میں پیسے نکالے جاسکتے ہیں بھلا؟'' کسی دل جلے نے کہا۔ دوسرا بولا۔ ''خود ہی سواریوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کے نکال لے' ہمارے ہاتھ تو جیب تک نہیں پہنچ سکتے۔''

''جگہ دیتے نہیں ہیں اور پیسے مانگنے لگتے ہیں' کاہے کے پیسے بھئی؟''

حمید کے ساتھ کھڑا نوجوان نیا نیا ملازم ہوا لگتا تھا۔

''جگہ نہیں ہے باؤ جی' مگر پہنچ ہی جاؤ گے نا آخر' شکر کرو۔''

کنڈیکٹر نے ایسے کہا جیسے احسان جتا رہا ہو۔

''تو پھر پیسے بھی نہیں ہیں۔'' نوجوان نے جھلا کے کہا۔

''یہ بات ہے تو پھر سن' بس بھی تیری ماں کی گود نہیں ہے' اتر جا فوراً۔''

نوجوان کے گرم خون میں ابال اٹھا اور اس نے کنڈیکٹر کے گال پہ ایک زوردار تھپڑ لگا دیا۔ ''اب کے بول' اتنی دیر سے میں تیری بکواس سن رہا ہوں۔''

تھپڑ نے کنڈیکٹر کے خون کو بھی چولہے پر چڑھا دیا' اس نے نوجوان کو ٹائی سے پکڑا اور چلتی بس سے چھلانگ لگا دی۔ دونوں کچھ دور بس کے ساتھ گھسٹتے رہے۔ سواریوں میں ایک دم کھلبلی مچ گئی۔ جو سیٹوں پر بیٹھے تھے' وہ اچک اچک کے باہر دیکھنے لگے۔ جو کھڑے تھے' وہ ایک دوسرے کے اوپر سے جھانکنے کی کوشش کرنے لگے۔ ڈرائیور نے بس روک دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بس کی ساری سواریاں نیچے اتر گئیں۔ فٹ پاتھ پہ وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا تھے۔ آناً فاناً دونوں طرف کی ٹریفک پھنس گئی اور سڑک پر بھیڑ اکٹھی ہوگئی۔ پیدل چلتے لوگ بھی ایسے دوڑتے چلے آئے جیسے اللہ کے نام کے پیسے بانٹنے پر دیہاتی بچے دوڑتے ہیں۔ لڑنے والوں کو کسی نے چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ سب گویا کسی اکھاڑے میں دو پہلوانوں کے فن کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے جبکہ یہاں صورت حال یہ تھی کہ نوجوان کے کوٹ کے بٹن ٹوٹ چکے تھے اور دوسرے کا گریبان چاک تھا پھر کسی نیک بخت عمر رسیدہ شخص نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر نوجوان کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ نوجوان ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے پھنکارا۔ ''میں اسے بتاتا ہوں کہ سواری کیسے اتاری جاتی ہے۔''

''بیٹا! تم پڑھے لکھے ہو کر ایسی فضول حرکت کرتے ہو؟ بتاؤ' اس چھوکرے کے منہ لگ کر تمہارے پلے کیا پڑا؟'' بڑے میاں نے ناصحانہ انداز میں نوجوان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''اس کے پلے تھا ہی کیا؟'' کنڈیکٹر نے جست لگا کر بس کے پائیدان پر چڑھتے ہوئے کہا اور دروازہ تھپتھپا کے بس چلانے کا اشارہ دیا جیسے وہ بس کو نہیں' گھوڑے کو ہنکار رہا ہو۔ سواریاں بھاگ بھاگ کر پھر سے بس میں سوار ہوگئیں۔ نوجوان بھی بس میں آ گیا۔ اسے بہر طور دفتر پہنچنا تھا۔ دونوں نے اپنے غصے کے بوجھ کو ایک

دوسرے پر مکوں اور گالیوں کی گولہ باری کر کے خاصی حد تک اتار پھینکا تھا۔ بس کے چلتے ہی کنڈیکٹر نے جلدی جلدی سواریوں سے کرایہ وصول کرنا شروع کر دیا۔ نوجوان نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا' کوٹ کے کندھوں سے مٹی جھاڑی اور جیب سے رومال نکال کے باچھوں سے رِستا خون پونچھا۔ لوگ کہہ رہے تھے۔

''بھئی' آپ کی گرمی سردی نے ہمارا خانہ خراب کر دیا' دفتر میں غیر حاضری لگ چکی ہوگی۔''

''پھر کریں نا اس کی رپورٹ۔'' نوجوان نے کنڈیکٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کس کے پاس کریں؟'' کئی آوازیں طنزیہ لہجے میں ایک ساتھ ابھریں۔ اس اثناء میں کنڈیکٹر ٹکٹ کاٹ کے فارغ ہو چکا تھا۔ وہ نوجوان کے قریب آ کے کھڑا ہوا اور بولا۔

''چار لفظ پڑھ کے رپورٹ کرنے کی دھونس دیتے ہو باؤ؟ بس......''

کھی کھی کر کے کچھ لوگ ہنسنے لگے۔ کنڈیکٹر کے ساتھ کچھ اور آوازیں بھی تھیں۔ کچھ حمایتی اور کچھ مخالف' حمید نے آواز کے جھرمٹ میں کنڈیکٹر کی آواز کو پہچانا۔

''باؤ' تیرا پیٹ اگر نعرے لگانے سے بھرتا ہے تو لگائے جا نعرے۔ میں بھی پیٹ ہی کے کارن پھیرے لگاتا ہوں' سواریاں چڑھاتا ہوں۔''

حمید کو دفتر پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی۔ وہ مضطرب تھا۔ اس ایک مہینے کے دوران وہ چھٹی مرتبہ دفتر تاخیر سے پہنچ رہا تھا۔ افسر بالا سے اسے وارننگ مل چکی تھی کہ وہ دفتر دیر سے آنے کی وجہ بتائے۔ اپنے بس اسٹاپ پر اترتے ہوئے اس نے سوچا۔

'بھلا مجھے کیا لینا دینا' جہنم میں جائے بس اور کنڈیکٹر' جل تو جلال تو کا ورد کرتا وہ تیز تیز چلنے لگا۔ دسمبر کا مہینہ ختم ہو رہا تھا اور اے سی آر جانے والی تھیں۔ اسے خدشہ تھا کہ اس کا افسر اس کی خفیہ رپورٹ اچھی نہیں لکھے گا۔ یہی سب سوچتا ہوا وہ افسر بالا کے کمرے کے سامنے جا کر رک گیا۔ ناریل کے موٹے پائیدان پر اس نے رگڑ کر اپنے جوتے صاف کیے۔ دروازے پر پڑے بھاری قیمتی پردے کو کھسکا کر اس نے ذرا سا اندر جھانکا۔ ایرانی پھول دار قالین سے ذرا سا آگے چمکدار میز کے نیچے بجلی کا ہیٹر جل رہا تھا اور عمدہ لکڑی کے پالش شدہ پائیدان پر سیاہ لشکتے ہوئے دو اعلیٰ چمڑے کے بوٹ رکھے تھے جن میں اس کے افسر کے پیر تھے اور جو صرف اتنا چلتے تھے کہ گاڑی سے اتر کے اپنے کمرے تک آئے تھے اور دبیز قالین پر چلتے ہوئے آ کر پائیدان پر ٹک گئے تھے۔ حمید نے درد سے ٹس ٹس کرتے اپنے پیروں کی طرف دیکھا جن پر راستے کی دھول جمی تھی اور جو زخمی تھے۔ وہ خفت سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کی میز کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔

''مسٹر حمید......!''

''جی سر......!''

''وارننگ کا کوئی اثر نہیں؟ او کے۔'' وہ ہیڈ کلرک کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''سارے عملے کی رپورٹس سائن ہو گئیں؟''

''جی سر......!'' ہیڈ کلرک نے پیٹ پہ بندھے ہاتھوں کو جنبش دیئے بغیر ٹھوڑی کو مزید گردن میں گھساتے ہوئے جواب دیا۔ حمید جانے کے لیے مڑا تو اسے لگا جیسے اس کے پیر اس کا ساتھ نہیں دے رہے۔ اس نے بمشکل اپنے بوجھل پیروں کو ایرانی قالین پر گھسیٹا اور بے ارادہ ہی ناریل کے پائیدان پر رگڑتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''تو کیا یہ میرے ہی پیر ہیں؟ پھر یہ میرے تابع کیوں ہیں؟ اور یہ زمین جس پر یہ چلتے ہیں؟ کیا یہ میری زمین ہے؟'' بند گٹر کی طرح سوالات اس کے اندر سے ابلتے رہے اور وہ کسی بے جان گٹھڑی کی طرح اپنی میز کے سامنے بچھی بوسیدہ سی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے دو چمک دار بوٹ اس کا دل کچل رہے ہیں۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ دل پر اس طرح رکھے جیسے اسے جوتوں کی زد سے بچا رہا ہو اور اس کا سر خود بخود میز پر جھکتا چلا گیا۔

☆☆☆

دوشیزہ میگزین

- رنگِ کائنات
- دوشیزہ گلستاں
- نئے لہجے، نئی آوازیں
- یہ ہوئی نا بات
- لولی وُڈ، بولی وُڈ
- نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل
- کچن کارنر
- حکیم جی!
- بیوٹی گائیڈ

اسماء اعوان

فرمانِ الٰہی

اے لوگو! یہ رسول تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے حق لے کر آ گئے ہیں۔ اب (ان پر) ایمان لے آؤ' کہ تمہاری بہتری اسی میں ہے اور اگر (اب بھی) تم نے کفر کی راہ اپنائی تو (خوب سمجھ لو کہ) تمام آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے (تم اللہ عزوجل کی گرفت سے کہیں بھاگ کر جان نہیں بچا سکتے) اور اللہ علم وحکمت دونوں کا مالک ہے۔

(سورۃ النساء، آیت: 170)

اقوالِ حضرت علیؓ

☆ انصاف شہادت کی جان ہے۔
☆ عادت پر غالب آنا کمال فضلیت ہے۔
☆ غور سے عقل کی روشنی بڑھتی ہے۔
☆ بیماری بدن کے لیے ایک قید ہے۔
☆ مال جمع کرنا غم میں پڑنا۔
☆ حریص کبھی بس نہیں کرتا۔
☆ علم بغیر عمل گمراہی ہے۔

مرسلہ: معصومہ رضا۔ کراچی

موتیوں کی مالا

☆ غصہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسروں کا انتقام اپنے آپ سے لیتے ہیں۔

☆ جو شخص کسی مقصد کو سامنے رکھ کر محنت کرتا ہے، اُس کو اِس کا پھل ضرور ملتا ہے۔

☆ جس کو منانا نہ آتا ہو اُس سے خفا نہیں ہونا چاہیے۔

☆ چہرہ ایک چراغ کی مانند ہوتا ہے، جس میں اگر خوشی کا تیل نہ ڈالو تو وہ بجھ جاتا ہے۔

مرسلہ: رخسانہ رضوی۔ لندن

جنت کی سم

اگر آپ ہر پریشانی سے بچنا چاہتے ہیں تو صرف نماز کی سم ہی استعمال کریں۔ کیونکہ نماز دیتی ہے آپ کو اپنے رب سے بات کرنے کے پانچ فری مواقع اور وہ بھی روزانہ، اس کے ساتھ ساتھ اَن لمیٹڈ فری رحمتیں، برکتیں اور سکون ہی سکون بلکہ تہجد پیکیج سے رات 12 بجے سے صبح 5 بجے تک سب کچھ منوائیے تو نماز پڑھو اور سب کہہ دو۔

(نوٹ) یہ آفر سانس رُکنے سے پہلے تک ہے۔

مراسلہ: یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ۔ لاہور

یتیمی

اگر ہو گود ماں کی تو فرشتے کچھ نہیں لکھتے
جو ممتا روٹھ جائے تو کنارے پھر نہیں دِکھتے
یتیمی ساتھ لاتی ہے زمانے بھر کے دُکھ عابی
سُنا ہے باپ زندہ ہو تو کانٹے بھی نہیں چبھتے

انتخاب: فہد غفار۔ کراچی

دربار کا چراغ

ایک بزرگ ایک گاؤں سے گزرے تو ایک عورت نے اُن سے درخواست کی کہ میری شادی کو دس سال ہوگئے ہیں۔ ابھی تک اولاد نہیں ہوئی۔''
بزرگ:'' میں تیرے نام کا دربار میں دیا جلاؤں گا۔ انشاءاللہ تیرے یہاں اولاد ہوگی۔''
بارہ سال بعد ان ہی بزرگ کا پھر اُسی گاؤں سے گزر ہوا تو اُسی عورت سے ملاقات ہوگئی' جس کے اب دس بچے تھے۔ بزرگ خوش ہوئے اور پوچھا کہ تمہارا شوہر کہاں ہے۔''
عورت بولی:'' وہ اُس دربار کو ڈھونڈنے گئے ہوئے ہیں تاکہ اُس دیے کو بجھا سکیں۔''
مرسلہ: انجم علی نواز، گلستان جوہر۔ کراچی

تم......

کس قدر حسن میں ڈھلے ہو تم
جب سے اُس شخص سے ملے ہو تم
کتنے اُجلے دکھائی دیتے ہو
اتنے دن تک کہاں رہے ہو تم
بس مجھے دیکھتے ہی رہنے دو
منظروں سے بھرے ہوئے ہو تم
پاس آؤ تو میں بتاؤں تمہیں
کس قدر پاس آگئے ہو تم
شاعر: کامی شاہ، انتخاب: قرۃ العین۔ کراچی

غلطی

ایک صاحب ایک مووی دیکھ کر زور زور سے چلا رہے تھے۔'' اوئے گدھے ہاں نہ کرنا پھنس جاؤ گے۔ اوئے پاگل سائن نہ کرنا، لٹ جاؤ گے۔'' اُن کی بیوی نے کچن سے چلا کر پوچھا۔
'' آخر آپ کون سی فلم دیکھ کر گالیاں دے رہے ہیں۔'' وہ صاحب افسردہ لہجے میں بولے۔
'' اپنی شادی کی فلم دیکھ رہا ہوں یار۔''
مرسلہ: عائشہ ندیم۔ میرپور خاص

یاد رکھیں

☆ اگر تم اُس وقت مسکرا سکتے ہو جب تم پوری طرح ٹوٹ چکے ہو تو یقین جانو کہ دنیا میں تمھیں کوئی نہیں توڑ سکتا۔
☆ رشتوں کی رسی کمزور تب ہوتی ہے جب انسان غلط فہمی میں پیدا ہونے والے سوالوں کا جواب بھی خود ہی بنا لیتا ہے۔
☆ دعا دستک کی طرح ہے اور مسلسل دستک سے دروازہ کھل جاتا ہے۔
مسز سراج کاظمی۔ بریلی، انڈیا

دردِ جگر

دل کو گنوا کے دردِ جگر ہم نے پایا ہے
بارہا تجھ ہی کو پھر بھی مگر آزمایا ہے
تیری وہ زلفیں یاد مجھے آنے لگتی ہیں
جس وقت ابر گھر کے میرے گھر پہ آیا ہے
کیسا کھلا پڑا ہے چمن میں ہر ایک غنچہ
شاید کوئی چمن میں بہت مسکرایا ہے
کیسے بھلا سکے گا اُسے اے دلِ احسن
سب کچھ بھلا کے جس کو فقط تو نے پایا ہے
شاعر: احسن قزلباش۔ انتخاب، شبانہ حسین (ثانی) ڈیفنس، کراچی

دوست

☆ دوست کے گھر کو جانے والا راستہ بھی طویل نہیں ہوتا۔
☆ کتنی عجیب بات ہے کہ ہمیں دشمنوں کی باتیں یاد نہیں رہتیں مگر دوستوں کی خاموشی یاد رہتی ہے۔
☆ بہترین دوست خدا کا انمول تحفہ ہے۔
☆ اچھے دوست سفید رنگ جیسے ہوتے ہیں۔ سفید رنگ میں کوئی بھی رنگ ملاؤ، نیا رنگ بن جائے گا۔ مگر دنیا کے سارے رنگ ملا کر بھی سفید رنگ نہیں بنایا جا سکتا۔
☆ اپنے دوست کو محبت دو مگر اپنے راز نہ دو۔

☆ دوست کو آزاد چھوڑ دو، قید نہ کرو۔ اگر وہ لوٹ آیا تو سمجھو تمہارا دوست ہے اگر نہ آیا تو سمجھو کبھی دوست تھا ہی نہیں۔

مرسلہ: افشاں رضا۔ اسلام آباد

منافق

وہ جب بھی ملی اور جہاں بھی ملی
چہکتی مہکتی لہکتی ملی
مگر اُس کی چوری کھلی ایک دن
دکھایا نجومی کو جو اُس نے ہاتھ
وہ کہنے لگا سخت حیرت کے ساتھ
بڑی ہی منافق سی لڑکی ہو تم
جو غم سہہ کے اوپر سے ہنستی ہو تم
ہے دل میں بسایا کسی اور کو
کسی اور کے ساتھ رہتی ہو تم

انتخاب: صبوحی کاظمی، شاعرہ شگفتہ شفیق

سنہری باتیں

☆ لا الٰہ الا اللہ کا ورد کرنے والا بلندیوں پر گامزن ہو جاتا ہے۔

☆ حقیقی کامیابی لگاتار محنت سے ہوتی ہے۔

☆ عاقلوں نے تکلیفیں برداشت کر کے سونا چاندی زمین سے نکالا تا کہ لوگ فائدہ اٹھا سکیں لیکن بخیل انہیں پھر مٹی اور پتھر میں دفن کر دیتے ہیں تا کہ لوگ فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔

☆ نادانوں اور جاہلوں کی صحبت سے تنہائی بہتر ہے۔

☆ غذاؤں سے بھرے ہوئے معدے ہوں تو دماغ میں حکمت کی بات کیسے آ سکتی ہے۔

☆ طلب علم کے دوران طالبِ علم کو بلند ہمتی سے کام لینا چاہیے۔

☆ ہمیشہ اچھے کاموں سے رغبت رکھو، قلبی سکون حاصل ہو گا۔

مرسلہ: مسز نگہت غفار۔ کراچی

حاضر جواب

ایک بچہ پارک میں بیٹھا ہوا چاکلیٹ کھا رہا تھا۔ جب اُس نے تیسری چاکلیٹ کھائی تو پاس بیٹھی ہوئی ایک عورت اُسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ’’بیٹا تمہیں پتا ہے جو زیادہ میٹھا کھاتے ہیں وہ بیمار ہو کر جلدی مر جاتے ہیں۔‘‘

بچے نے جواب دیا: ’’آپ کو معلوم ہے کہ میری دادی کی عمر ایک سو سال تھی۔‘‘

عورت بولی۔ ’’یقیناً وہ میٹھے سے پرہیز کرتی ہوں گی۔‘‘

’’جی نہیں۔‘‘ وہ اپنے کام سے کام رکھتی تھیں۔ بچے نے جواب دیا۔

ریحانہ مجاہد۔ کراچی

جیسے تمہاری خوشی

ایک صاحب نے اپنی بیٹی سے کہا۔ ’’آج صبح وہ نوجوان پھر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میں نے اُس سے کہہ دیا کہ مجھے اُس کے ساتھ تمہاری شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔‘‘

’’لیکن ڈیڈی! میں ممی کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔‘‘

’’ذرا سی بات کے لیے اپنی زندگی بھر کی خوشیاں کیوں برباد کرتی ہو؟ اچھا ایسا کرو، تم اپنی ممی کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جانا۔‘‘

مرسلہ: عاشر عتیق۔ لانڈھی، کراچی

عجیب بات

ایک مشہور امریکی ایئر لائن سے وابستہ پائلٹ نے بڑی دلچسپ بات بتائی۔ اس نے کہا کہ آپ میں سے زیادہ تر لوگ جب ہائی وے پر ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں تو سیٹ بیلٹ نہ باندھنے کا خطرہ مول لینا پسند نہیں کر سکتے، لیکن ہوائی جہاز میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ جب ہم ہزاروں فٹ بلندی پر پانچ سو میل فی گھنٹہ رفتار کو چھو لیتے ہیں تو مسافروں کو سیٹ بیلٹ کھول دینے کا اشارہ جاری کر دیتے ہیں۔ ہے نا دلچسپ بات۔

مرسلہ: نسیم سکینہ صدف۔ ڈسکہ

عادت

ایک لیڈر کو تقریر کرنے سے پہلے مائیک درست کرنے کی عادت تھی۔ وہ جہاں بھی تقریر کرنے جاتے، مائیک کو ضرور ہاتھ لگا کر درست کرتے۔ ایک بار الیکشن کے دوران میں ان کے مخالفوں نے جہاں ان صاحب کو تقریر کرنا تھی، اس مائیک میں کرنٹ چھوڑ دیا۔ تقریر کرنے والے لیڈر اسٹیج پر آئے اور حسب عادت جوش میں آ کر تقریر شروع کرتے ہوئے مائیک کو ہاتھ لگایا تو ان کے منہ سے یہ جملہ نکلا۔

''بھائیو! اور بہنو! ہائے! میں مر گیا۔''

مرسلہ: مریم لطیف۔ کراچی

شیکسپیئر نے کہا

تیس برس کی عمر تک انسان اپنے بارے میں شبہہ کرتا رہتا ہے کہ وہ احمق ہے۔ چالیس برس کی عمر میں اُسے اس شبہہ کا یقین ہو جاتا ہے اور وہ اپنے منصوبوں کی کاٹ چھانٹ میں لگ جاتا ہے۔ پچاس سال کا ہونے کے بعد وہ اپنی سُست گامی پر خود کو بُرا بھلا کہتا رہتا ہے اور ارادہ کرتا ہے کہ اب اپنے مقصد کے لیے زیادہ انہماک سے کام کرے گا۔ مگر مرتے دم تک صرف ارادے ہی کرتا رہتا ہے۔

مرسلہ: علینہ حسین۔ ٹنڈو آدم

امن وامان کی قیمت

ایک بادشاہ اپنے غلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہوا، چونکہ غلام نے پہلے کبھی دریا کا سفر نہیں کیا تھا اس لیے رونے پیٹنے لگا اور کسی طرح چپ نہیں ہوا۔ اس کشتی میں ایک فلسفی بھی تھا جو بادشاہ سے کہنے لگا۔

''اگر اجازت ہو تو میں اس کا علاج کروں۔''

بادشاہ نے کہا ''میں اسے خاص لطف و کرم سمجھوں گا۔''

فلسفی اپنی جگہ سے اُٹھا اور چند مسافروں کی مدد سے غلام کو دریا میں پھینک دیا۔ جب غلام دریا میں کئی غوطے کھا چکا تو فلسفی نے اسے بالوں سے گھسیٹ کر دوبارہ کشتی میں بٹھا لیا۔ غلام نے جان بچ جانے پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا پھر آرام سے ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گیا۔

بادشاہ بولا۔ ''اے فلسفی! اس میں کیا راز تھا؟''

فلسفی نے جواب دیا۔ ''امن وامان کی قیمت وہی جانتا ہے جو کسی مصیبت میں پھنس جائے۔''

مرسلہ: بسمہ اشتیاق۔ لالہ موسیٰ

محنت کش مزدور کا دن

ہم ہر سال مناتے ہیں
مل کر جشن مناتے ہیں
نعرے خوب لگاتے ہیں
''اپنی محنت اپنی شان
جاگ رہا ہے پاکستان''
لیکن بس یہ بتلا دو
آج کے دور میں کون کہاں ہے؟
میرا وہ مزدور وہیں ہے
ساٹھ برس پہلے تھا جہاں
ہم ہر سال مناتے ہیں
ہر مزدور کو اپنے ہاتھوں
نعرے لگا کر شور مچا کر
مٹی تلے دفناتے ہیں
مل کر جشن مناتے ہیں

شاعر: شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

ہائے رے فیس بک

بچہ: ڈیڈی میں آج آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔

ڈیڈی: ہاں بولو بیٹا۔

بچہ: ڈیڈی میں نے فیس بک پر لڑکیوں کے نام سے تین جعلی آئی ڈی بنائی ہیں۔

ڈیڈی: نالائق یہ کیا فضول حرکتیں کرتے رہتے ہو تم۔ اور یہ بات مجھے کیوں بتا رہے ہو؟

بچہ: آپ جس پروین کو ایک مہینے سے سیٹ کرنے کی ٹرائی کر رہے ہیں وہ میں ہی تو ہوں۔

زرین زبیر۔ کوٹھاری۔ کراچی

☆☆......☆☆

نئے لہجے نئی آوازیں

میری ماں

کتنی پیاری کتنی سندر ہے ماں
جیسے کسی شاعر کا حسیں خواب ہو
کتنی سادہ و آساں ہے ماں
جیسے کوئی کھلی کتاب ہو
تیری دعا سے آباد میری کوکھ ماں
دونوں اتنے پیارے جیسے گلاب ہو
تم جو آج نہیں میرے پاس ماں
زندگی ایسے ہے جیسے کوئی سراب ہو
آنکھ جب بھی کی بند پایا تجھے ماں
مانتا ہی نہیں دل کہ تم خواب ہو
تھام لے ہم کو بکھر رہے ہیں ماں
خاموش کیوں ہو ثمینہ کی التجا کا کوئی تو جواب ہو

شاعرہ: ثمینہ عرفان۔ کراچی

غزل

میں ترے لطفِ انتظار میں ہوں
مہکتی رہ گزار میں ہوں
نقش دھندلا گئے ہیں چہرے کے
میں تری راہ کے غبار میں ہوں
صحن گلشن میں خاک اڑتی ہے
کیسے اُجڑے ہوئے دیار میں ہوں
جب سے دیکھا ہے اس کو میں نے جمال
میں کہاں اپنے اختیار میں ہوں

شاعر: سمیع جمال۔ کراچی

میرا سایہ، میری ماں

کبھی غم کبھی دُکھ اٹھاتی ہے ماں
ہر اِک طرح سے دل بہلاتی ہے ماں
نہ پوچھو دل اس کا کشادہ ہے کتنا
ہر غلطی کو میری چھپاتی ہے ماں
وہ روئے تو میں چپ کراتی ہوں اکثر
میں روؤں تو مجھ کو ہنساتی ہے ماں
اکیلا مجھے چھوڑتی ہی نہیں ہے
میرا حوصلہ بڑھاتی ہے ماں
یا رب سایا تو رکھنا سلامت سدا
کہ ہر قدم پر ملے مجھے اُن کی دعا

شاعرہ: سعدیہ نور۔ کراچی

تیری یاد

پہنا ہوا درد کا غموں نے لباس ہے
تم کیا گئے کہ ہر شے اُداس ہے
آندھیاں تو چلی ہیں میرے در و دیوار پر
چھایا ہوا فضا میں کیوں خوف و ہراس ہے
کب سے بھٹک رہی ہوں صحرائے زیست میں تنہا
تشنہ لبوں پہ ٹھہری صدیوں کی پیاس ہے
شام و سحر ان آنکھوں کو رہتا ہے انتظار ترا
اِس دل کو تیرے ملن کی اب بھی آس ہے
سنبھال رکھا ہے اس نے بھیگا رومال میرا
سوکھا ہوا اِک گلاب بھی یاسمین کے پاس ہے

شاعرہ: یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ۔ لاہور

غزل

غم زندگی کو میری وہ خود ہی سنا کے روئے
نہ ہو دامنِ قبا تر، وہ خود ہی بچا کے روئے
کوئی ان کو یہ بتادے کہ ہمیں نہ آزمائیں
میری آزمائشوں پر خود ہی سر جھکا کے روئے
میری کون سی ہے منزل مجھے کچھ پتا نہیں ہے
جو تھے راستے کے رہبر خود ہی آزما کے روئے
میرے چارہ گر بتادے میرے ہم سفر بتادے
ہوئی مجھ سے کیا خطا تھی وہ خود ہی رُلا کے روئے
میرے پاس کچھ نہیں ہے یہ بچے ہیں چند آنسو
میری داستانِ غم کو وہ خود ہی سنا کے روئے
نہ کہیں ہے گردِ صحرا نہ کوئی نشان انزاء
غمِ زیست کو ہراک سے وہ خود ہی چھپا کے روئے
شاعرہ: انزاء نقوی۔ کراچی

غزل

کبھی ہم بھی تھے مشہور یاراں
آج وہی ہم گوشہ گمنام ہوئے
خوشیاں بانٹتے رہے زندگی بھر سب کو
مقدر کھلا ہمارا تو کانٹے انعام ہوئے
ایک روز سجی تھی بزم رفیقاں
بس یہیں سے ہم خاص سے عام ہوئے
کوئی لٹتا بھی ہے تو راتوں میں اکثر
ہم ہوئے برباد تو سر شام ہوئے
شاعر: خواجہ مختیار حسین۔ خیر پور ٹامیوالی۔ پنجاب

غزل

جلانے دل مرا نزدیک دل کے آنے لگے
چرا کے مری غزل مجھ کو ہی سنانے لگے
گلوں پہ شبنمی قطرے ہیں مستعارِ اشک
جو اس کے عارضِ دلکش پہ جھلملانے لگے
سمجھ لے زلف پریشان ہوئی اُدھر اس کی
چمن سے پھولوں کی خوشبو اِدھر جو آنے لگے
ہر اک کو لگنے لگی اپنی داستانِ حیات
فسانہ اپنا جو دنیا کو ہم سنانے لگے
بلند کتنا ہے رتبہ نظر میں اُن کی مرا
خدا کو چھوڑ کے قسمیں مری وہ کھانے لگے
یہ رنج و غم بھی تو یاں اس کی ہی عنایت ہے
اسی سے یہ تجھے تحسین آج بھانے لگے
شاعر: تحسین کاظمی۔ ہاپوڑ۔ انڈیا

غزل

محبت کو ہماری آزما کر دیکھ لو تم بھی
کبھی ہم سے ذرا دُور جاکر دیکھ لو تم بھی
زمانہ دشمنی پر نہ اُتر آئے تو پھر کہنا
چراغوں کو ہواؤں سے بچا کر دیکھ لو تم بھی
بھروسا کانچ کا نازک محل ہے ٹوٹ جائے گا
ذرا اسی آستیں اپنی ہلا کر دیکھ لو تم بھی
مرے چہرے سے غم کی دھول ہٹ جائے میں جی جاؤں
کبھی بھولے سے ہم کو مسکرا کر دیکھ لو تم بھی
کہ کتنا پیار ہے عادل کو تم سے جان جاؤ گے
میری تصویر کا کونا جلا کر دیکھ لو تم بھی
شاعر: عادل حسین۔ کراچی

ہائیکو

رات دن بس ترے خیالوں میں
بس یہی ایک کام باقی ہے
زندگی تیرے نین پیالوں میں
شاعر: شاہانہ احمد خان۔ کراچی

یہ ہوئی نا بات

اس ماہ زاہد سوری۔ ٹنڈ والہ یار کا سوال انعام کا حق دار ٹھہرا۔ انہیں اعزازی طور پر دوشیزہ گفٹ ہیمپر روانہ کیا جا رہا ہے (ادارہ)

یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ۔ لاہور

☺ پاکستان کا قومی پھول تو چنبیلی ہے قومی پھل کون سا ہے؟

✍ صبر کا پھل جو کسی بھی اچھے اور مہنگے پھل کی طرح ناپید ہے۔

☺ بادل گرجتے ہیں تو بارش ہوتی ہے، شوہر گرجے تو کیا ہوتا ہے؟

✍ تب بھی بارش ہوتی ہے مگر طعنوں، دھمکیوں اور کچھ کیسز میں جوتوں کی۔

ثریا خاتون۔ بہاول نگر

☺: زین بھیا آنکھوں سے بات چلی تو دل تک پہنچی، دل سے گھر کے لوگوں تک، گھر کے لوگوں سے شادی تک اب بھلا جلدی سے بتایئے اب یہ بات اور کہاں کہاں تک پہنچے گی؟

✍: ثریا صاحبہ میرا خیال ہے بات بہاول نگر سے خیبر تک تو پہنچ چکی ہے۔ اب تو بس طعنے، تشنے اور صرف لڑائی جھگڑے رہ گئے ہیں۔

عالمہ توحید۔ کوٹ ادو

☺: زین جی! اگر شیکسپیئر نا ہوتا تو......؟

✍: اگر شیکسپیئر نہ ہوتا تو مولا بخش ہوتا، پیر بخش ہوتا، خدا بخش ہوتا۔ سب کچھ ہوتا۔ ایک شخص کے نا ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے بی بی۔

ارجمند۔ ٹامے والا

☺: زین جی! مجھے صرف اتنا بتا دیجیے وہ میرے گلے میں اشکوں کی مالا پہنا کر آخر کیا ثابت کرنا چاہتا ہے؟

✍: اچھی ارجمند آپ کو کیا پتا اُن کے جذبات۔ اُنھیں آپ کے گلے میں خالی مالا کم لگ رہی ہے۔ یقیناً وہ آپ کو پورا سیٹ بھی جلد مکمل کر دیں گے۔

سانولی۔ خیر پور

☺ ہائے اللہ زین بھائی! مجھے تو سوال کرتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے مگر کیا کروں قلم پکڑ لیا ہے تو سوال ضرور کروں گی۔ بس اتنا بتا دیں کہ ہر مرد خوبصورت لڑکی ہی سے شادی کیوں کرنا چاہتا ہے۔ سانولی سلونی لڑکیاں کیا خوبصورت نہیں ہوتی ہیں؟

✍ پیاری سانولی! تم نے یہ کیا بات کر دی۔ خدا بہت جلد تمھیں کوئی خوبصورت سا ہم سفر عنایت کرنے والا ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھنے کی ہے ہر جگہ ظاہر داری کا راج ہے۔

غلام النساء۔ شیخوپورہ

☺ زین بھائی! سرخ گلابوں کے موسم میں مجھے پھولوں کے رنگ سیاہ کالے کیوں دکھائی دیتے ہیں؟

✍ اچھی بہن کیا شیخوپورہ میں آنکھوں کے ڈاکٹر ناپید ہو چکے ہیں۔ مجھے شک نہیں یقین ہے۔ آپ کے چشمے کا نمبر خاصا بڑھ گیا ہے۔ آپ فوراً اپنی نظر چیک کرالیں۔ ورنہ سیاہ کالے پھولوں کے ساتھ ساتھ آپ کو ہر طرف صرف سیاہ کالا رنگ ہی دکھائی دے گا۔

✍ خدا اس ہرجائی کو دس سال میں بھی کوئی توفیق نہ دے سکا۔ آپ فوراً کھڑی ہو جاؤ۔ جھوٹوں کی باتوں پر وقت اور عمر گنوانا کہاں کی عقل مندی ہے۔

شازمین۔ سجاول

☺ زین بھائی! دل جلانے والے لوگ کہاں پائے جاتے ہیں؟

✍ سجاول کے علاوہ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ مگر سنا ہے آج کل وہاں بھی دل جل رہے ہیں۔

سنہرا شاہ۔ چیچہ وطنی

☺ اچھے زین! گھڑی ہوتی تو تمہاری کلائی پہ سجا دیتی، گھڑیال لے کر بھلا تمہاری گلی میں کیسے آجاؤں؟

✍ سنہرا جی! گھڑی ہو یا گھڑیال ہمیں کوئی مسئلہ نہیں، بس آپ آجائیں۔ گھڑی اگلی بار لے آیئے گا۔

توفیق خانم۔ سکھر

☺ زین جی! پورے دس سال ہو گئے۔ میں اب تک اس ہرجائی کے لارے لپوں پہ بیٹھی ہوں۔ کیا کروں؟

مسز پروین صدیق۔ کراچی

☺ زین بھائی! مئی کے مہینے کی سب سے اچھی بات کیا ہوگی؟

✍ مئی کے مہینے کی سب سے اچھی اور میٹھی میٹھی بات یہ ہے کہ اس مہینے میں دل بھر کر آم کھانے کو ملیں گے۔ (یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگ صرف میٹھے آموں کی گٹھلیاں گنیں گے)

اسمارہ۔ والٹن، لاہور

☺ زین جی! بس اتنا بتا دیجیے، دل کا درد سر کا درد کب

بن جاتا ہے؟
✍ یہ سوال آپ کر رہی ہیں؟ اس وقت تو پورے پاکستان پر لاہوری راج ہے مگر ہم آپ کے سوال کا ضرور جواب دیں گے۔ بجلی کی آنکھ مچولی میں اکثر ایسے درد اٹھتے رہتے ہیں۔

منور سلطان۔نواب شاہ

☺ زین بھیا! شادی مگر آدھی سے کیا مراد ہے؟
✍ شادی مگر آدھی، نکاح کو کہتے ہیں۔

روزی ڈیسوزا۔سیالکوٹ

☺ بھیا معذرت کرنے کا بہترین طریقہ تو ہمیں بتا دیں؟
✍ پوری طاقت کے ساتھ سامنے والے کا پاؤں ہیل سے کچل ڈالیں اور گھبرا کر صرف اتنا کہیں......سوری!

سویرا حسن۔بی

☺ زین بھیا! سخت ترین لو چلتی دوپہریا میں وہ دل ہی کیوں جلاتے ہیں؟
✍ وہ بھی کیا کریں ان کی روشنی یہی ہے۔

عرفانہ۔کاموکے

☺ زین بھیا! مجھے صرف اتنا پوچھنا ہے آپ کو مکھن لگانے میں زیادہ مزہ آتا ہے یا مکھن کھانے میں؟
✍ بی بی! چاپلوسی اور خوشامد سے ہم دور بھاگتے ہیں۔ اس لیے نہ مکھن لگاتے ہیں اور نہ لگواتے ہیں۔

محسنہ خانزادہ۔کوٹری

☺ زین بھیا! کوئی سر پھرا ہو تو اُس کا دماغ کیسے درست کریں؟
✍ فوری طور پر ایسے سر پھروں کا بائی کاٹ کر دیں۔

ساجدہ۔راولپنڈی

☺ زین بھائی! سچ مچ غریب کو مہنگائی نے مار دیا ہے؟
✍ بالکل صحیح کہا آپ نے۔بس کچھ رہ گئے ہیں۔

فائزہ نذیر۔چک ایمن آباد

☺ زین جی! اداکارہ میرا شادی کب کریں گی؟
✍ جب وہ بڑی ہو جائیں گی تو شادی کر لیں گی۔ پچھلے برس ہی 22 ویں بار انھوں نے اپنی 22 ویں سالگرہ منائی ہے۔

زاہد سوری۔ٹنڈو الہ یار

☺ زین بھائی! یہ دل مانگے مور......آپ دیجیے؟
✍ بیٹا میرے پاس مور ہے نا مورنی۔ کہیں اور ٹرائی کیجیے۔

شفقت ناز۔سرگودھا

☺ زین جی! آسمان پر گڈیاں اور گڈے ہزاروں کی تعداد میں تھے مگر اس ہرجائی نے میری ہی پتنگ کو کیوں کاٹا؟
✍ ارے آپ اتنا بھی نہیں سمجھتیں۔موصوف آپ سے دوستی کے خواہشمند ہے۔

فلک ناز۔صادق آباد

☺ زین بھیا! خوشی کیا ہے؟
✍ خوشی بظاہر خود کچھ نہیں ہوتی بلکہ یہ دل کا اک شیریں سا احساس ہے۔

☆☆☆

یہ ہمی تابات

کوپن برائے
مئی 2015ء
نام: ____________
پتا: ____________

بعد از مرگِ ناگہاں

"اے دلوں کا حال جاننے والے پروردگار! میں ان حاضرین کو گواہ بنا کر اور تجھے حاضر وناظر جان کر کہتا ہوں کہ میری رقم جو مرحوم نے قرض لی تھی، اور واپس نہیں کی میں وہ رقم معاف کرتا ہوں۔ اے سب سے بڑے معاف کرنے والے! تُو بھی میرے اس......

ایک ایسی تحریر جو یقیناً آپ کو مسکرانے پر مجبور کر دے گی

میں قبرستان کی سنسان اور ویران فضا سے بہت گھبراتا تھا لیکن اللہ بخشے، جب سے والد صاحب اللہ کو پیارے ہوئے، قبرستان آنا جانا میرا وتیرہ بن گیا۔

میں ایک دن والد صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر واپس آ رہا تھا۔ دیکھا کہ کسی کی میت دفنائی جا چکی اور لوگ دعائے مغفرت کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ مرحوم کے ایک قریبی دوست بصد خلوص اور نہایت عاجزی سے بارگاہِ رب العزت میں مرحوم کے لیے دعائے مغفرت مانگ رہے ہیں اور حاضرین با آواز بلند آمین کہہ رہے ہیں۔ موصوف کا حلیہ نورانیوں جیسا تھا۔ سر گھٹا ہوا، داڑھی گھنی، موچھیں غنی اور پگڑی کا طرہ لومڑی کی دم سے بھی زیادہ لمبا تھا۔ موصوف نے دعا کرتے ہوئے گڑگڑا کر کہا۔

"اے دلوں کا حال جاننے والے پروردگار! میں ان حاضرین کو گواہ بنا کر اور تجھے حاضر وناظر جان کر کہتا ہوں کہ میری رقم جو مرحوم نے قرض لی تھی، اور واپس نہیں کی میں وہ رقم معاف کرتا ہوں۔ اے سب سے بڑے معاف کرنے والے! تُو بھی میرے اس مقروض کو معاف فرما دے۔" (حاضرین نے بلند آواز سے کہا۔ آمین)

"اے ہمارے مالک! مرحوم نے تنگ دستی کی وجہ سے اپنے گھر کے بجلی کے میٹر میں کچھ گڑ بڑ کر رکھی تھی۔ اے تنگ دستوں کے دستگیر! مرحوم کی اس لغزش سے درگزر فرما۔" (آمین)

"میرے مولا! مرحوم 'سُنی' تھے مگر زکوٰۃ کی کٹوتی کے دنوں میں حلف نامہ دے کر 'کاغذی شیعہ' بن جایا کرتے تھے۔ اے اللہ! اس غلط بیانی کو معاف فرما۔" (آمین)

"اے اللہ! مرحوم کے پاس چار مختلف شناختی کارڈ تھے جن میں سے ایک میں سید دوسرے میں شیخ لکھا ہوا تھا۔ تیسرے میں صوبہ مختلف تھا اور

چوتھے میں ولدیت تبدیل کردی گئی تھی۔ اے اللہ! مرحوم کی یہ غلط بیانی اور ہیرا پھیری معاف فرما۔'' (آمین)

''اے اللہ! مرحوم ہمیشہ بغیر ٹکٹ ریل کا سفر کرتے تھے۔ ریلوے کے کسی ٹکٹ چیکر نے کبھی ان سے باز پرس نہیں کی۔ اے اللہ! ان کا سفر آخرت بھی بغیر کسی باز پرس کے بخیر وخوبی طے کرادے۔'' (آمین)

''اے اللہ مرحوم پولیس اور عدالت کے پیشہ ور گواہ تھے مگر دل سے یہ کہتے تھے ''میں گواہی دیتا ہوں، نہیں ہے کوئی معبود اللہ کے سوا۔'' اے اللہ! ان کی اس گواہی کے صدقے، ان کی جھوٹی گواہیوں کو درگزر فرما۔ (آمین)

''مرحوم پڑوسی کے ٹیلی فون کے تار سے اپنے تار ملا کر فائدہ اٹھاتے، گھر میں سکشن پمپ لگا کر خود خوب پانی کھینچ لیتے اور پڑوسی بوند بوند کو ترستے تھے۔ اے اللہ! مرحوم نے تقریباً آدھی زندگی کرائے کے مکان میں گزاری۔

وہ تین ماہ کی پیشگی کرایہ دے کر تین سال بغیر کسی کرائے کے رہتے اور پھر مالک مکان سے ہزاروں روپے اینٹھ کر مکان خالی کیا کرتے تھے۔ اے اللہ! ایسی ہزاروں چھوٹی موٹی خطائیں جو مرحوم سے سرزد ہوئیں، انھیں اپنے کرم سے معاف فرما۔'' (آمین)

''میرے مولا! مرحوم پہلی جماعت سے میٹرک تک کرسچین مشن اسکول کے طالب علم رہے، شاید اسی لیے قرآن شریف ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔

جب کسی رشتے دار یا دوست کے گھر فاتحہ، سوم، چہلم یا برسی پر قرآن خوانی میں شرکت کرتے تو قرآن کا پارہ لے کر ہر سطر پر انگلی پھیرتے۔

دل ہی دل میں اللہ اکبر کا وظیفہ ورد کرتے رہتے اور ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کے ساتھ ساتھ صفحات پلٹتے رہتے، اسی شخص کے ساتھ ساتھ وہ تلاوت ختم کرتے اور پارہ آنکھوں سے لگا کر پڑھے ہوئے پاروں کی ڈھیری پر رکھ دیا کرتے تھے۔

اے اللہ! مرحوم قرآن پاک کی تلاوت تو نہیں کر سکتے تھے مگر اللہ اکبر، اللہ اکبر یعنی تیری بڑائی کا ذکر کرتے تھے۔ اے میرے پروردگار! تجھے تیری کبریائی کا واسطہ، مرحوم کو اللہ اکبر کے وظیفے کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرما۔'' (آمین)

''اے اللہ! تنگ دستی سے نجات کے لیے مرحوم کسٹم کی ملازمت چاہتے تھے مگر عمر زیادہ ہو چکی تھی، اس لیے مرحوم نے میٹرک کی سند میں جعل سازی سے تاریخ پیدائش تبدیل کردی اور انھیں نوکری مل گئی۔ محکمہ جعل سازی سے بے خبر رہا۔ اے سارے عالم کی خبر رکھنے والے! مرحوم کی اس جعل سازی سے درگزر فرما۔'' (آمین)

''میرے پروردگار! مرحوم کو خانۂ کعبہ کی زیارت اور رسول مقبول ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضری کی لگن تھی۔

انھوں نے کسٹم کی ملازمت کے دوران کبھی کسی کا دل دکھا کر پیسے نہیں لیے۔ لوگوں کو لاکھوں کا فائدہ پہنچا کر ہر سال حج کیا کرتے تھے۔

اے اللہ! مرحوم کے تمام حج قبول فرما اور ایسے حاجیوں کے طفیل ہم اٹھارہ کروڑ مسلمانوں کے گناہوں کو بھی بخش دے۔'' (آمین)

''اے اللہ! یہ کوئی راز نہیں کہ کسٹم کی ملازمت کے دوران مرحوم نے سولہ شادیاں کیں اور بارہ طلاقیں دیں۔ مرحوم نے کبھی کوئی غیر شرعی کام نہیں کیا۔ ایک وقت میں صرف چار بیویاں ہی نکاح میں رہیں۔ بیویوں کے ساتھ ہمیشہ 'انصاف'

کیا۔ ہر نئی شادی سے پہلے چاروں بیویوں کے نام کی پرچیاں لکھتے اور قرعے میں جس کا نام نکل آتا اسے طلاق دے دیا کرتے، پھر تازہ نکاح پڑھوا کر چار کی گنتی پوری کر لیتے تھے۔

یااللہ! جنت میں مرحوم کو بہت ساری حوروں سے نواز دے۔'' (آمین)

''اے اللہ! کسٹم ملازمت میں مرحوم نے جب منشیات کے ایک بڑے اسمگلر کو پکڑا اور اس کے پیسوں سے ایک اپنا مکان اور ایک تیرا مکان یعنی ایک اعلیٰ مسجد تعمیر کروا کر اس میں ایک دینی مدرسے کی بنیاد رکھی تھی تاکہ غریب بچے دینی تعلیم حاصل کر سکیں۔ بعد کو مرحوم دینی تعلیم کی تلقین میں اس قدر مصرف رہے کہ خود انھیں دین پر عمل کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔

اے نکتہ نواز! مرحوم کے اس نیک جذبے کی قدر فرما اور انھیں جنت فردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرما۔'' (آمین)

''اے اللہ! مرحوم کو بے روزگار تعلیم یافتہ لڑکوں سے بڑی ہمدردی تھی اس لیے وزیروں کے جعلی لیٹر پیڈ چھپوا کر، نقلی مہریں بنوا کر، وزیروں کے سیکریٹریوں کے جعلی دستخطوں سے مرحوم نے کئی بے روزگار لڑکوں اور لڑکیوں کو نوکریاں دلوائیں اور دعائیں لیتے رہے۔

اے اللہ! تیرا کرم شامل حال تھا اسی لیے اس جعل سازی پر پردہ پڑا رہا۔

اے گناہوں پر پردہ ڈالنے والے! لاتعداد بے روزگاروں کی دعاؤں کے طفیل مرحوم کو اجر عظیم عطا فرما۔'' (آمین)

''اے اللہ! مرحوم کے نامۂ اعمال میں لکھا ہوگا کہ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے مکان کی تعمیر کے لیے مرحوم نے بیوی کے نام سے قرض لیا تھا، لیکن کچھ عرصے بعد اپنی زندگی ہی میں جانے بوجھے بیوی کو بیوہ ظاہر کیا اور قرض معاف کروالیا۔

پروردگار! مرحوم کے دانستہ اور نادانستہ گناہوں کو معاف فرمادے۔'' (آمین)

''اے اللہ! کراماً کاتبین نے یہ ضرور لکھا ہوگا کہ مرحوم نے غریبوں کی فلاح و بہبود کے بہت سارے کام کیے مثلاً شہر بھر کے اکثر کھیل کے میدانوں، دواخانوں، اسکولوں، مختلف فلاحی اداروں کے لیے مختص کیے ہوئے خالی پلاٹوں اور پارکوں پر قبضہ کر کے کچی آبادیاں قائم کر دیں اور غریبوں کی دعائیں لیتے رہے۔

اے اللہ! اس نیک کے بدلے مرحوم کو جنت الفردوس میں خوب صورت باغ عطا فرما۔'' (آمین)

''اے اللہ! مرحوم نے ملک میں کنڈا سسٹم متعارف کرایا تھا جس کے ذریعے ہزاروں لاکھوں جھگیوں کو تاریکی سے نکالا اور جھگیاں روشنی سے جگمگا اٹھیں۔

میرے مولا! مرحوم کی قبر کو روشن کر دے بلکہ بقعۂ نور بنادے۔'' (آمین)

''اے اللہ! مرحوم نے پسماندگان میں چار حاضر سروس بیویاں، بارہ ریٹائرڈ یعنی مطلقہ بیویاں اور ہر بیوی سے تین تین لڑکیاں یعنی جملہ ۴۸ بیٹیوں اور لاتعداد قرض خواہوں کو سوگوار چھوڑا ہے۔

اے اللہ! ان سب کو صبر جمیل عطا فرما۔'' (آمین)

''اے اللہ! تیری رحیمی اور کریمی کا واسطہ! اگر حاضری میں سے کچھ بندے ان ہی خطاؤں کے مرتکب رہے ہوں تو انھیں بھی معاف فرما۔'' (آمین)

☆☆☆

ڈی۔ خان

ایان علی جوڈیشنل کسٹڈی میں

ایان علی کو راولپنڈی کورٹ نے گزشتہ ماہ 18 دن کے جوڈیشنل ریمانڈ کے لیے جیل میں منتقل کردیا ہے۔ 14 مارچ کو کروڑوں کی مالیت کے

ڈالرز اسمگل کرتے ہوئے ٹاپ ماڈل ایئرپورٹ پر رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھیں۔

صبا قمر بھی منی لانڈرنگ میں ملوث

ایان علی بعد ایک اور اداکارہ منی لانڈرنگ کیس میں ملوث پائی گئی ہیں۔ اور وہ اداکارہ کوئی اور نہیں۔ اپنی صبا قمر ہیں۔ آج کی نمبرون اداکارہ

صبا قمر پر بھی یہ الزامات لگ رہے ہیں۔ حال ہی میں صبا قمر نے 'بنٹی آئی لو یو' پر بیسٹ اداکارہ کا ایوارڈ حاصل کیا ہے۔

اکشے کی گبر از بیک اور آرود

اکشے نے اینٹی کرپشن کے موضوع پر بننے والی

ہوگا، دیکھنے کے لیے تھوڑا سا انتظار اور...... کیونکہ اس فلم کا موضوع یہی ہے۔

منیشا کوئرالہ کی نئی فلم

منیشا کوئرالہ نے حال ہی میں اپنی نئی کناڈا فلم جو کہ ایک سماجی کارکن سونندا پشکر کی زندگی پر بنائی گئی

ہے مکمل کرادی ہے۔ اس فلم کے ڈائریکٹر AMR رمیش ہیں 'سونندا پشکر' سابق یونین منسٹر ششی تھارور کی مرحوم بیوی تھیں جو کہ انڈر ورلڈ سے گہری دوستی رکھتے تھے۔ اس فلم کو ایک 'مرڈر مسٹری' بھی کہا جارہا ہے۔ ویلڈن منیشا، اُمید ہے اپنی اس Debut فلم میں جو کہ کناڈا اور تامل میں بنائی جارہی ہے میں اپنا قد مزید اونچا کریں گی۔

کنگنارناوت ڈبل رول میں

آنند ایل رائے کی 'تنو ویڈ منو...... ریٹرن' میں
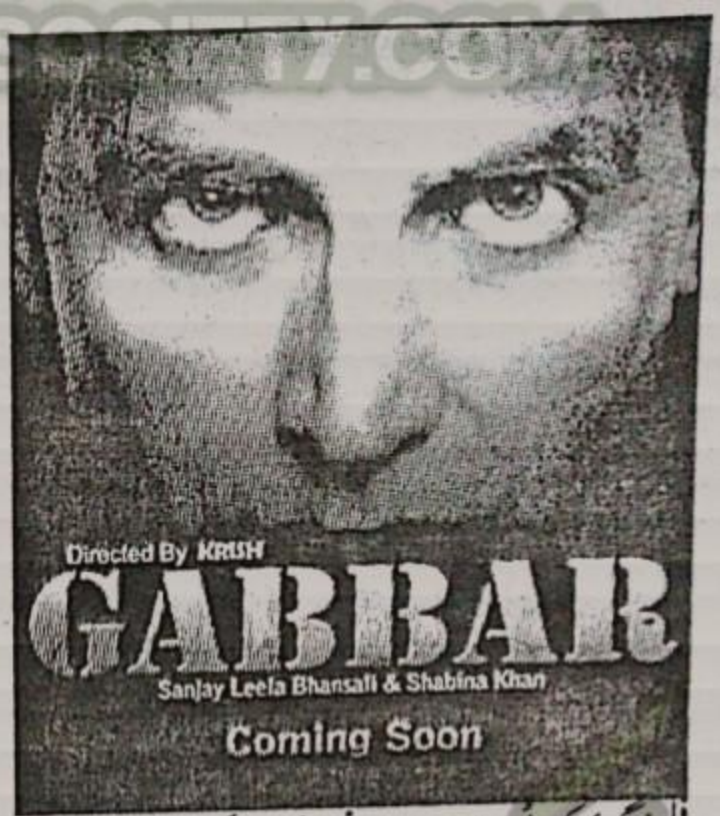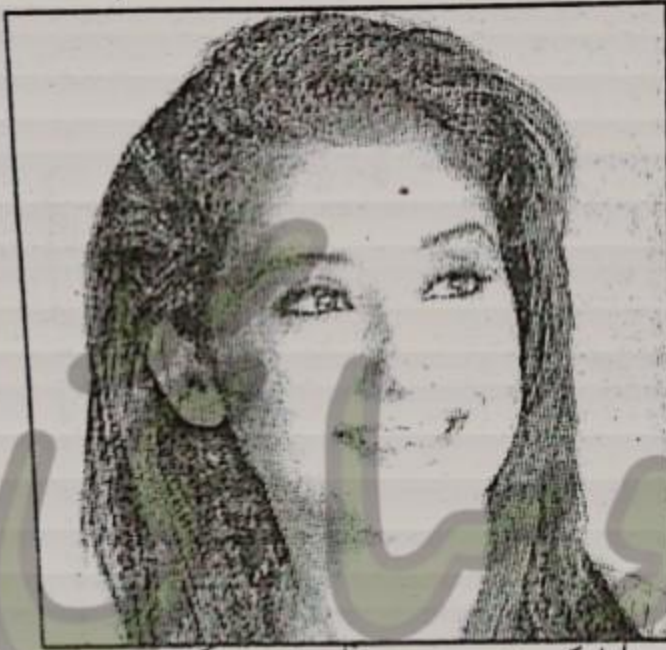
فلم 'گبر' کی ٹی وی پر پروموشن شروع کردی ہیں۔ اس پروموشن میں اُن کے صاحبزادے آرو کمار بھی ساتھ ہیں۔

فواد خان اور سونم کی 'بیٹل آف بٹورا'

پروڈیوسر ریہا کپور، جون سے اپنی فلم 'بیٹل آف بٹورا' کی شوٹنگ اسٹارٹ کررہی ہیں۔ اس فلم

کے لیے انہیں سونم اور فواد خان کی ڈیٹس کا بہت زیادہ انتظار کرنا پڑا۔ کیونکہ 'خوبصورت' کے ہٹ ہوتے ہی دونوں اسٹارز کی ڈائریز اگلے کئی سالوں تک فُل تھیں۔ اب کہیں جاکر یہ فلم سیٹ کا حصہ بنے گی۔ 'بیٹل آف بٹورا' نامی ناول سے ماخوذ اس فلم کا نام بھی یہی رکھا گیا ہے۔

سیاسی خاندانوں میں بچپن کی محبت کا کیا انجام

کنگنا رناوت ڈبل رول پلے کررہی ہیں تنو اور دتو کا۔
اس وقت سوشل میڈیا پر کنگنا کے دونوں رولز چرچا میں ہیں اور پبلک امید کررہی ہے کہ کنگنا اس بار بھی Hit ہوں گی۔

کنال دیش مکھ اور نیپال کا زلزلہ

'جنت' اور 'راجہ نٹورلال' ڈائریکٹڈ کنال دیش مکھ تباہ کن زلزلے کے دوران کھٹمنڈو میں تین دن تک

قیام پذیر رہ کر واپس زندہ سلامت ممبئی پہنچ گئے ہیں۔ اس بارے میں کنال نے بتایا کہ ایسا لگتا تھا کہ میں زمین کے اندر پہنچ چکا ہوں اور زمین ہل رہی ہے۔ زندگی اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔ کنال کی لمبی زندگی اور صحت کے لیے دعائیں۔ وہ اس سے پہلے راجہ نٹورلال کی ناکامی کا زلزلہ بھی سہہ چکے ہیں۔

دپیکا کی Piku

2015ء کا پہلا فیملی ڈرامہ 'Piku' 8 مئی کو

سینماؤں کی زینت بن رہی ہے۔ اس فلم میں دپیکا پڈوکون کے ساتھ کو اسٹار ہیں عرفان خان اور میگا اسٹار امیتابھ بچن بھی ایک خصوصی کردار میں موجود ہیں۔ ڈائریکٹر شوجیت سرکر کی اس فلم سے فلم پنڈت بہت اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ دیکھیے اِس بار دپیکا کا کیا دھماکہ کرتی ہیں۔ پبلک بے چین ہے، دو بڑے اداکار دپیکا اور عرفان کی اداکاری دیکھنے کے لیے۔

جیکولین فرنینڈس لائیو پرفارمنس

بولی وڈ اداکارہ جیکولین فرنینڈس نے لندن کے ایک بزنس مین کے بیٹے کی شادی پر پرفارم کرنے کی حامی بھرلی ہے۔ اس پرفارمنس پر سری لنکن بیوٹی کو چار کروڑ روپے ملیں گے۔ مئی کے آخر میں ہونے والی

اس شادی میں شرکت کے لیے جیکولین فرنینڈس دو روز لندن میں گزاریں گی۔

سلمان خان اور ہرتیک روشن ٹورس ورلڈ ایوارڈز میں نامزد

بولی وڈ کے سپر ہیروز سلمان خان اور ہرتیک روشن کی ایکشن فلمز لاس اینجلس میں ہونے والے "ٹورس ورلڈ ایوارڈز" میں نامزد کی گئیں۔ جہاں ان فلموں کا مقابلہ سال کی بہترین ہولی وڈ ایکشن فلمز سے ہوگا۔
دبنگ خان کی سپرہٹ فلم ہولی وڈ میں بیسٹ اسٹنٹ

ایوارڈ کے لیے نامزد کی گئی ہے جہاں ''کک'' کا مقابلہ ایکسپینڈ ایبل تھری اور ٹرانسفارمرز جیسی ہولی وڈ فلمز سے ہوگا۔ دوسری جانب ہرتیک اور کترینہ کیف کی فلم بینگ

بینگ ''بیسٹ فائٹ ایوارڈ'' کے لیے نامزد ہوئی۔ اس کیٹیگری میں رائز آف این ایمپائر اور کیپٹن امریکہ جیسی فلمز بھی شامل ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بولی وڈ کی فلمز ہولی وڈ فلمز کو مات دے پاتی ہیں یا نہیں۔

ایشوریہ رائے بچن کا متنازعہ اشتہار

ایشوریا رائے بچن کا کہنا ہے کہ انھوں نے تصویر اکیلے کھنچوائی تھی۔ اس اشتہار میں ایک سانولے رنگ کے دبلے پتلے بچے کو دکھایا گیا ہے جو ایک زیورات سے لدی سفید رنگت کی اداکارہ پر سرخ چھتری تانے کھڑا ہے۔ انسانی حقوق کے سرگرم کارکنوں نے ایشوریہ رائے کو ایک کھلے خط میں لکھا

ہے کہ یہ تصویر انتہائی قابلِ اعتراض ہے۔ ایشوریہ کی اشتہاری فرم نے کہا ہے کہ ان کی تصویر بچے کے بغیر لی گئی تھی۔ یہ اشتہار گزشتہ ہفتے اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں 41 سالہ سابق مس ورلڈ نے کام کیا تھا۔ تنقید کے بعد کمپنی نے اپنے فیس بک صفحے پر معذرت شائع کی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اشتہار میں شاہانہ شان و شوکت، وقت کی قید سے آزاد خوبصورتی اور لطافت دکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ کمپنی نے کہا ہے کہ اس نے اپنی اشتہاری مہم سے وہ اشتہار واپس لے لیا ہے۔

دپیکا اور پریانکا کا لاوانی ڈانس

سنجے لیلا بھنسالی کی فلم باجی راؤ مستانی میں رام لیلا کی جوڑی دپیکا پڈکون اور رنویر سنگھ کے ساتھ پریانکا بھی جلوہ گر ہیں۔ فلم میں شامل کیے گئے گانے میں اداکارہ

دپیکا پڈوکون اور پریانکا چوپڑا نے لاوانی ڈانس کیا ہے۔ خبریں زوروں پر ہیں کہ دپیکا پڈوکون اور پریانکا پر فلمایا گیا یہ گانا دیوداس میں ایشوریا رائے اور مادھوری پر فلمائے گئے گانے ڈولارے ڈولا کو ٹکر دینے والا ہے۔

ہیپی نیو ائیر کے سیکوئل کی تیاریاں

فلمساز فرح خان کا کہنا ہے کہ ابھیشک بچن نے ہیپی نیو ائیر کے سیکوئل کا اسکرپٹ لکھنے کی ذمہ داری لی ہے۔ اگر اسکرپٹ اچھا ہوا تو وہ فلم کی ہدایتکاری کریں گی۔ ہیپی نیو ائیر گزشتہ سال ریلیز ہونے والی بلاک بسٹر فلم ہے۔ جس میں شاہ رخ خان، دپیکا پڈوکون اور خود ابھیشک بچن نے مرکزی کردار کیا تھا۔

☆☆☆
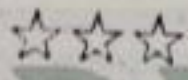
نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل

مختار بانو طاہرہ

زندگی اپنے ساتھ جہاں بہت ساری خوشیاں لے کر آتی ہے وہیں بہت سارے ایسے مسائل بھی جنم لیتے ہیں جو اس زندگی کو مشکلات کے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں ان میں سے بیشتر الجھنیں انسان کی نفسیات سے جڑی ہوتی ہیں اور انہیں انسان از خود حل کر سکتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی اُن ہی الجھنوں کو سلجھانے کی ایک کڑی ہے۔ اپنے مسائل لکھ بھیجیں، ہماری کوشش ہوگی کہ آپ ان مسائل سے چھٹکارہ پالیں۔

انیلا۔ حیدر آباد

پیاری آپی! میں صرف ایک کتاب نہیں پڑھتی بلکہ مختلف کتابوں سے نوٹس بناتی ہوں۔ میری کمزوری یہ ہے کہ اگر کوئی لڑکی نوٹس مانگتی ہے تو اس کو منع نہیں کر سکتی۔ بلکہ دے دیتی ہوں۔ پچھتاوا اس وقت ہوتا ہے جب وہ وقت پر واپس نہیں کرتی، امتحان سر پر آجاتے ہیں اور نوٹس کو حفاظت سے بھی نہیں رکھتی۔ مجھے خیال آتا ہے کہ یہ سب مجھے فیل کروانے کے لیے کیا گیا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ خود فیل ہو جاتی ہے۔ ایسی کئی لڑکیاں ہیں جو میری کتابوں اور لکھی ہوئی چیزوں سے فائدہ اٹھا کر مجھے ہی تنگ کرتی ہیں۔ میں کیا کروں۔ نفسیاتی مریضہ بنتی جا رہی ہوں۔

☆: جن لڑکیوں کا آپ ذکر کر رہی ہیں انہوں نے نوٹس لیے، اپنے پاس رکھے لیکن ان سے فائدہ نہ اٹھایا، کیوں کہ وہ پاس نہیں ہوئیں، البتہ آپ کو ضرور نقصان پہنچا، وہ بھی اپنی غلطی سے۔ آئندہ زیادہ وقت کے لیے کسی کو نوٹس نہ دیں۔ بلکہ اتنی دیر کے لیے دیں کہ وہ فوٹو کاپی کروالیں اور پھر واپس لے لیں۔ اس پر وہ رضا مند ہوں تو ٹھیک ورنہ معذرت کر لیں۔ کسی بھی حوالے سے برا خیال ذہن مین نہ لائیں کیوں کہ ایسے خیالات کی حقیقت نہیں ہوتی۔ بد گمانی بڑھتی ہے اور اس کا سلسلہ چل نکلتا ہے جو انسان کے اپنے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے اس کا نقصان مثبت سرگرمیوں سے دوری بھی ہے۔

سجاول بخش۔ ملتان

اچھی باجی! میری والدہ اس وقت بہت سی باتیں بھولنے لگی ہیں حالانکہ وہ اسکول میں پرنسپل ہیں۔ سخت مزاج تھیں، لوگ ان کے کمرے میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ آج ان کی حالت پر ترس آتا ہے میں نے ان ہی کے اسکول سے پڑھا اور اب یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہوں۔ ان کا خیال آجاتا ہے تو فکر مند ہو کر بیٹھ جاتا ہوں۔ آج یہ خط کالج میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں اور ڈرتا ہوں۔ اس دن سے جب وہ میرا نام بھی بھول جائیں گی کیوں کہ میرے نانا بھی سب کچھ بھول گئے تھے۔

☆: تحقیقات ظاہر کرتی ہیں کہ 60 سے 80 سال کی عمر کے 6 فیصد لوگ 70 سے 80 سال کی عمر کے اور اس سے بھی زیادہ عمر کے 20 فیصد لوگ نسیان یا الزائمر کے مرض کا شکار دیکھے جاتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق اس مرض میں دماغ سکڑنے لگتا ہے جس کے سبب بھول کے ساتھ عادات میں بھی بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے۔ عام طور پر یہ مرض موروثی ہوتا ہے۔ اگر بر وقت توجہ نہ دی جائے تو یہ لوگ سب ہی

کچھ بھول جاتے ہیں۔ والدہ کے ساتھ خدا کرے ایسا نہ ہو۔ ان کو زیادہ دیر کے لیے اکیلے یا خاموش بیٹھنے نہ دیں۔ ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہیں۔ آرام کے اوقات کے علاوہ ان کے پاس بیٹھیں، رشتے داروں سے ملوانے کے لیے لے جائیں وہ باتیں کریں جن میں ان کو دلچسپی ہو۔ علاج اور نفسیاتی طریقوں سے مدد لی جائے تو بھول کا مرض بڑھنے سے رک سکتا ہے۔

شہروز۔ لاہور

☆: میرے والد غصے سے بہت تیز ہیں۔ دادا کا بھی غصہ زیادہ تھا اور میں بھی غصے میں کچھ نہیں دیکھتا۔ اسکول میں مسائل ہوئے، کالج میں کم ہی گیا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ کہیں ملازمت نہیں کر پاتا۔ دوسرے دن ہی جھگڑا ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات نوبت مار پیٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ بہت سے دوست ہوں، سب کے ساتھ خوش رہوں لیکن اس وقت جو دوست تھے۔ وہ بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ دراصل میں صحیح بات کرتا ہوں، جو کوئی نہیں سنتا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر ان لوگوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہوتا ہے جو غصے کے تیز ہوتے ہیں اور لوگ ان سے کیوں دور بھاگتے ہیں؟

☆: کوئی بھی شخص یہ نہیں چاہتا کہ دوسرا اس پر کسی بھی طرح کا حملہ کرے۔ غصہ کرنے والے لوگ بات کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ حملہ آور ہو رہے ہیں۔ شدید غصے کی حالت نفسیاتی مریض ہونے کو بھی ظاہر کرتی ہے اور غصے میں کچھ نہیں دیکھتے کہنے کا مطلب ہے آپ کو غصے پر کنٹرول نہیں ہے۔ اس دوران صحیح اور غلط کا احساس نہیں رہتا غصہ ورثے میں ملے تب بھی قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے شعور ہونا ضروری ہے۔

نفیسہ۔ کراچی

☆: میرا نکاح بہت جلد ہوا۔ اس کے بعد دو سال تک ان لوگوں نے رخصتی نہیں کی کہ لڑکا ابھی باہر سے نہیں آیا۔ بعد میں بات اتنی خراب ہو گئی کہ طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد احساس کمتری کا شکار ہونے لگی ہوں۔ اور اب یہ حال ہے کہ کوئی گھر میں آجائے تو سامنا نہیں کیا جاتا۔

☆: رخصتی کے بغیر طلاق ہو جانا یقیناً ناگوار اور مشکل بات ہے۔ اِس صورت حال کو برداشت کرنے کے لیے صرف مثبت سوچ ہی مدد دے سکتی ہے۔ اگر رخصتی ہو جاتی اور آپ ساتھ نہ رہ پاتیں پھر علیحدگی اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتی۔ آپ میں اور ان لڑکیوں میں جن کی شادی نہیں ہوئی کوئی فرق ہی نہیں ہے، پھر احساس کمتری کیوں؟ تقدیر کے فیصلوں پر صبر کرنے والے خوشیاں پا لیتے ہیں۔

سکینہ۔ اسلام آباد

☆: میرا تعلق خوشحال گھرانے سے ہے۔ آج بھابیاں عیش کر رہی ہیں اور میں تنگ دستی کا شکار ہوں۔ شوہر کی آمدنی بے حد کم ہے۔ ہم دونوں ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے ہیں۔ جب میکے جاتی ہو تو غصہ آجاتا ہے، کسی نہ کسی بات پر الجھ پڑتی ہوں۔ امی بجائے میری حمایت کے بھابیوں کی طرف داری کرتی ہیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں۔ انہیں اس بات کا خیال نہیں کہ وہ اگر میرا خیال نہیں رکھیں گی تو میں خود کو کتنا اداس محسوس کروں گی۔ اس کا ان کو اندازہ تک نہیں۔ اس وقت دل چاہتا ہے کہ خودکشی کرلوں۔

☆: شادی کے بعد ہر لڑکی کی زندگی میں تبدیلی آتی ہے۔ امیر لڑکیاں غریب گھر میں اور غریب لڑکیاں امیر گھر میں جا سکتی ہیں۔ تبدیلی اگر امیری اور غریبی کی نہ ہو تو مزاج، اخلاق، عادات اور ماحول کی تو ہوتی ہی ہے۔ شادی کے بعد زندگی کو خوشگوار اور پر مسرت بنانا ہوتا ہے، اس کے لیے ضبط، تحمل اور برداشت چاہیے۔ بھابیاں خوش ہیں تو ہونے دیں، آپ کو بھی ان کو خوش دیکھ کر خوش ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ان ہی لوگوں کی زندگیوں میں خوشیاں آتی ہیں جو دوسروں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ غصہ آنا، اداس ہونا، اس قدر کہ خودکشی کی رغبت پیدا ہو جائے، ڈپریشن کی علامت ہے۔ ایسا فرد غموں اور دکھوں میں سفر کرتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورتِ حال سے ہر ممکن بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

☆☆☆......☆☆

کچن کارنر

نادیہ طارق

قارئین! اِس ماہ کچن کارنر میں ہم آپ کے لیے بہت مزیدار لیکن پکانے اور بنانے میں سادہ اور آسان ڈشز لے کر آئے ہیں۔ اِن کی تیاری میں، وقت کی بچت بھی ہے اور دستر خوان کے ذائقے بھی آزمایئے اور داد وصول کیجیے۔

مغلائی کوفتے

اجزاء (کوفتوں کے لیے)

قیمہ : آدھا کلو
پسا ہوا لہسن، ادرک : ایک چائے کا چمچہ
چنے کی دال : آدھا کپ
انڈا : ایک عدد
پیاز : ایک عدد
پسا ہوا گرم مسالا : آدھا چائے کا چمچہ
نمک : حسبِ ذائقہ
ثابت مرچ : چھ سے سات عدد
اُبلے ہوئے انڈے : چھ عدد

اجزاء (سالن کے لیے)

پسی ہوئی پیاز : چار عدد
دہی : آدھا کپ
پسا ہوا لہسن : ایک کھانے کا چمچہ
نمک : حسبِ ذائقہ
پسی مرچ : دو چائے کے چمچے
تیل : پون کپ

ترکیب: قیمے میں تمام اجزاء ملا کر مشین میں پیس لیں۔ اُبلے ہوئے انڈے درمیان سے کاٹ لیں۔ ہتھیلی پر قیمہ رکھ کر درمیان میں انڈا رکھ کر فولڈ کریں اور تھوڑے بڑے سائز کے کوفتے بنا لیں۔ سالن تیار کرنے کے لیے ایک دیگچی میں تیل گرم کریں۔ تھوڑی سی پیاز کاٹ کر ڈالیں اور سنہری کرنے کے بعد تمام مسالے ڈال کر بھونیں۔ جب تیل اوپر آجائے تو دہی بھی پھینٹ کر ملائیں۔ تھوڑی دیر ڈھکنا رکھ کر پکنے دیں۔ پھینٹے ہوئے انڈے میں تیار کیے ہوئے کوفتے ڈبوئیں اور پھر فرائی پین میں تھوڑا سا تیل ڈال کر فرائی کریں۔ تیار کیے ہوئے سالن میں آہستہ سے ڈالیں اور صرف پانچ منٹ پکا کر اتار لیں۔ آپ کے لذیز اور مزیدار مغلئی کوفتے تیار ہیں۔ گرم گرم چپاتیوں کے ساتھ پیش کریں۔

کشمیری چکن اسٹو

اجزاء

مرغی : ایک کلو
پیاز : چار عدد
تیل / گھی : آدھا کپ
ٹماٹر : چھ عدد
ثابت گرم مسالا : ایک کھانے کا چمچہ
ثابت کالی مرچ : آٹھ عدد
سفید زیرہ : ایک کھانے کا چمچہ
نمک : حسبِ ذائقہ

ہلدی : پون چائے کا چمچہ
پسا ہوا لہسن : ایک چائے کا چمچہ
پسی ہوئی ادرک : ایک چائے کا چمچہ
سجاوٹ کے لیے
کٹی ہوئی ہری مرچ : دو کھانے کے چمچے
کٹی ہوئی ادرک : دو کھانے کے چمچے

ترکیب: ایک دیگچی میں تیل گرم کریں۔ پیاز کے ٹکڑے، نسبتاً بڑے کاٹ کر تیل میں شامل کریں۔ پیاز ہلکا سا تلنے کے بعد مرغی، لہسن اور ادرک ڈال کر بھونیں۔ باریک کٹے ہوئے ٹماٹر اور تمام مسالے ڈال کر ڈھکن رکھ دیں۔ درمیانی آنچ پر دس منٹ تک پکائیں۔ مرغی اسی مسالے میں بھون لیں۔ جب تیل اوپر آجائے تو ادرک اور ہری مرچ سے سجا کر پیش کریں۔ آپ کا مزیدار کشمیری اسٹو تیار ہے۔

گرین اسپائسی بریانی

اجزاء
مٹن، بیف، چکن : ایک کلو
چاول : ایک کلو
ادرک لہسن پیسٹ : دو کھانے کے چمچے
پیاز : تین عدد (درمیانی، گولڈن کرلیں)
ہری مرچ : دو عدد
ہرا دھنیا : ایک گڈی
پودینہ : ایک گڈی
کُٹی کالی مرچ : ایک چائے کا چمچ
ثابت گرم مسالہ : ایک کھانے کا چمچ
دہی : ڈیڑھ کپ
عرقِ گلاب : ایک کھانے کا چمچ
دودھ : پون کپ
لیموں : ایک عدد
نمک : حسب ذائقہ
تیل / گھی : حسب ضرورت

ترکیب: ہرا دھنیا، پودینہ اور ہری مرچ کو باریک پیس لیں۔ اب تیل میں آدھی پیاز، گوشت، ادرک، لہسن، نمک ڈال کر گوشت کو بھون کر گلنے کے لیے رکھ دیں۔ جب گل جائے تو ہری چٹنی، دہی، کالی مرچ ڈال کر 5 منٹ بعد چولہے سے اتار لیں۔ چاولوں میں، گرم مسالہ ڈال کر ایک کنی پر اُبال لیں۔ اب پتیلی میں ایک تہہ چاول کی لگائیں۔ اس کے اوپر گوشت اور پھر چاول ڈال دیں۔ دودھ میں عرقِ گلاب ڈال دیں۔ لیموں بھی نچوڑ کر ڈال دیں۔ چاولوں کو دم پر رکھ دیں۔ باقی آدھی پیاز اوپر سے ڈال دیں۔ سلاد اور رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

پٹاٹو چکن ڈونٹس

اجزاء
آلو (ابلے ہوئے) : ایک کلو
چکن کا قیمہ : آدھا کلو
ہرا دھنیا : آدھی گڈی
زیرہ : آدھا چائے کا چمچ
ہری مرچ : پانچ عدد
پیاز (کٹی ہوئی) : ایک عدد
انڈے : دو عدد
کارن فلور : چار کھانے کے چمچ
ادرک، لہسن پیسٹ : ایک کھانے کا چمچ
گرم مسالہ پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ
ہلدی : آدھا چائے کا چمچ
نمک : حسب ذائقہ
ڈبل روٹی کا چورا : ایک پیالی
تیل : تلنے کے لیے

ترکیب: آلو، چکن کا قیمہ، ہرا دھنیا، زیرہ، ہری مرچ، پیاز، کارن فلور، میدہ، ثابت لال مرچ، ادرک، لہسن کا پیسٹ، گرم مسالہ، ہلدی اور

نمک کو بلینڈر میں ڈال کر اچھی طرح بلینڈ کر لیں۔ اب اس مکسچر کو گول کباب کی شکل میں تیار کر کے ٹرے میں رکھیں اور کسی گول چیز یا انگوٹھے کی مدد سے درمیان میں سوراخ کر لیں۔ اب ڈونٹس کو پھینٹے ہوئے انڈے میں ڈیپ کر کے ڈبل روٹی کے چُورے میں رول کریں اور آئل میں فرائی کریں۔ ٹماٹو کیچپ کے ساتھ آلو چکن ڈونٹس کا لطف دوبالا کریں۔

شاہی نہاری

اجزاء

بونگ کا گوشت	: ایک کلو
نلیاں	: دو عدد
پسا ہوا لہسن	: ایک چائے کا چمچہ
پسی ہوئی ادرک	: ایک چائے کا چمچہ
پسی ہوئی مرچ	: ایک چائے کا چمچہ
نمک	: حسب ذائقہ
پیاز بڑی	: ایک عدد
تیل	: ڈیڑھ کپ

خشک مسالے کے اجزاء

پسا ہوا گرم مسالا	: ایک چائے کا چمچہ
پسی ہوئی سونف	: ایک چائے کا چمچہ
پسی ہوئی جائفل	: پون چائے کا چمچہ
پسی ہوئی جاوتری	: پون چائے کا چمچہ
بڑی الائچی	: دو یا تین عدد
لونگ	: دو یا تین عدد
آٹا	: تین کھانے کے چمچے
سجاوٹ کے لیے	: ہری مرچ، ہرا دھنیا، ادرک، لیموں

ترکیب: ایک درمیانے سائز کی دیگچی لیں۔ تیل گرم کر کے پیاز ڈالیں، سنہری ہونے کے بعد تھوڑی سی پیاز نکال لیں۔ لہسن، ادرک، گوشت پہلے تیل میں ڈال کر بھونیں اور پھر بعد میں سونف، پسا ہوا گرم مسالا اور آٹے کے علاوہ سارے مسالے شامل کر کے اتنا پانی ڈالیں کہ گوشت گل جائے۔ بونگ کا گوشت گلنے میں وقت لیتا ہے۔ اس لیے زیادہ دیر تک دھیمی آنچ پر پکائیں۔ جب گوشت گل جائے تو ہڈیاں الگ نکال لیں۔ پھر اس میں پسا ہوا گرم مسالا، سونف اور آٹا گھول کر ملائیں اور تھوڑی دیر چمچہ چلاتی رہیں۔ اس کے بعد ڈھکنا برابر کر کے دوبارہ دم پر رکھ دیں۔ شاہی نہاری پیش کرتے وقت ادرک، لیموں، ہری مرچ اور ہرا دھنیا کاٹ کر ساتھ رکھیں اور گرم نان یا شیرمال کے ساتھ تناول فرمائیں۔

ڈبل روٹی کا حلوہ

اجزاء

ڈبل روٹی	: چھ ٹکڑے
دودھ	: ایک کلو
چینی	: حسب ذائقہ
گھی	: حسب ضرورت
بادام	: دس سے بارہ عدد (باریک کٹے ہوئے)
کیوڑہ	: چند قطرے
الائچی	: چھ عدد

ترکیب: ایک پتیلی میں دودھ چڑھا دیں۔ اُبال آنے کے بعد اتنا پکائیں کہ دودھ گاڑھا ہو جائے۔ ڈبل روٹی کے سخت کناروں کو کاٹ لیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ اب ان ٹکڑوں کو دودھ میں شامل کر دیں۔ چمچ سے برابر چلاتی رہیں۔ جب دودھ خشک ہو جائے تو گھی ڈال کر بھونیں۔ اس کے بعد اس میں چینی شامل کر دیں اور دوبارہ سے بھونیں، پھر بادام اور کیوڑہ ڈال کر چولہے سے اتار لیں۔ لذیذ ڈبل روٹی کا حلوہ تیار ہے۔

☆☆☆

ساتھیو! اکثر ہمیں کسی ایسی بیماری سے سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے لیے ہمیں سمندر کی تہہ یا آسمان کی بلندیوں، جنگل بیابانوں یا پہاڑوں تک پر جانا پڑ جاتا ہے مگر...... جان ہے تو جہان ہے۔ خدا اگر بیماری دیتا ہے تو اُس نے شفاء بھی دی ہے۔ قدرت کے طریقۂ علاج کا آج بھی کوئی مول نہیں۔ حکمت کو آج بھی روزِ اول کی طرح عروج حاصل ہے۔ اسی لیے طبیب اور حکیم صاحبان کو خدائی تحفہ کہا جاتا ہے۔ آپ کی صحت اور تندرستی کے لیے ہم نے یہ سلسلہ بعنوان 'حکیم جی' شروع کیا ہے۔ اُمید ہے ہمارے مستند اور تجربہ کار حکیم صاحب آپ کی جملہ بیماریوں کے خاتمے کے لیے اہم کردار ادا کریں گے۔ نیا سلسلہ حکیم جی! آپ کو کیسا لگا؟ اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

موسم گرما کا خاص تحفہ

پیشاب کی جلن، مثانے کی گرمی، جسمانی اعضاء کی گرمی دور کرنے کے لیے۔

جسمانی اعضاء میں حدت کا بڑھ جانا خصوصاً گرم ممالک میں انتہائی عام ہے۔ اگرچہ بعض لوگ اور معالجین اس مرض کو انتہائی کم تر سمجھتے ہیں مگر اس کے باعث منہ کے السر، آنکھوں میں جلن، پیشاب میں تکلیف، گھبراہٹ اور بلڈ پریشر کا بڑھ جانا، نیند نہ آنا، امراض جگر و بول کا پیدا ہونا، جسم میں پانی کی کمی، سر درد جریان، جیسی تکالیف پیدا ہو سکتی ہیں۔

اضافی جسمانی گرمی کی وجوہات:

شدید گرمی اور دھوپ میں رہنا، کم سونا، بلڈ پریشر کی زیادتی، موروثی طور پر مرض کا ہونا، بخار اور زکام، ہارمونز کی بے قاعدگی، معدے کی خرابی، گرم، نمکین اور چکنائی والی غذا کا استعمال، گوشت کا زیادہ استعمال، سرکہ سگریٹ اور الکحل کا استعمال وغیرہ۔

معدے میں گرمی کے اسباب:

مثلاً بدہضمی، سینے مین جلن، پیٹ میں درد، قے اور متلی، گیس کے اخراج میں دشواری، بھوک کی کمی، سر درد اور چکر، اپھارہ، مروڑ، تیزابیت، زبان پر ایک تہہ سی جم جانا، تھوک کا بہاؤ بڑھ جانا، منہ کا مزہ بگڑ جانا، پیشاب کی کمی، عام بے آرامی اور قبض کا ہو جانا۔

گرمی کے سبب دل کی دھڑکن بڑھ جانا

اسباب:

شریانوں میں خون کا بہاؤ کم ہو جانا، دل میں چربی کا بڑھ جانا، نمک اور چکنائی کا زیادہ استعمال، وراثت، موٹاپے کا ہونا، غصہ زیادہ کرنا، دل کی دھڑکن کا بڑھنا، شدید چکر، سر درد، سانس کی بے قاعدگی، نظر کا دھندلا پن، الٹے ہاتھ اور کندھے میں درد جیسی علامات کا ظاہر ہونا، وغیرہ۔

1) جسمانی حدت کا کامیاب علاج۔

اس عام مرض کو رفع کرنے کے لیے ایک نسخہ ترتیب دیا گیا ہے جو ایک تیز بہدف علاج ہے اور بڑھتی ہوئی گرمی کے باعث ہونے والی تکالیف کا مؤثر طور پر مداوا کرنے میں اکسیر ہے۔

2) جسمانی اعضاء جگر اور مثانے کی اضافی حدت کم کرنے میں اکسیر ہے۔

3) سوزش مثانہ اور پیشاب میں جلن کا موثر علاج ہے۔
4) سوزاک میں مفید ہے۔
5) گرمی کے موسم میں گرمی کی شدت، گھبراہٹ، بے چینی اور شدتِ پیاس کے برے اثرات کو رفع کرنے میں مفید ہے۔
6) خون کے فاسد مادوں کا اخراج کرتا ہے۔
7) صفرا کے فعل کو درست کرتا ہے۔

نسخہ نمبر 1۔ پیشاب کی جلن، مثانے کی گرمی اور جسمانی گرمی دور کرنے کے لیے۔

گوند کتیرا	10 گرام
تخم بالنگو	10 گرام
گل نیلوفر	10 گرام
کشنیز	10 گرام
تخم خرفہ	10 گرام
سفید مولی	10 گرام
گل انار	10 گرام
تخم ریحان	10 گرام
صندل سفید	10 گرام
تخم کانسی	10 گرام
جواخار	5 گرام
قلمی شورہ	5 گرام
شکر	حسب ضرورت

نسخہ نمبر 2 معدے کی گرمی دور کرنے کے لیے

سونف	10 گرام
الائچی کلاں	10 گرام
سونٹھ	10 گرام
فلفل دراز	10 گرام
زیرہ سفید	10 گرام
گل سرخ	10 گرام
برگِ پودینہ	10 گرام
جوہر پودینہ ٹکیا	10 گرام
ملیٹھی	10 گرام
اناردانہ	10 گرام
کشنیز	10 گرام
طباشیر	10 گرام
اجمود	10 گرام

ترکیب: تمام اجزاء کا سوف بنا کر کھانے کے بعد ایک چائے کا چمچہ پانی سے استعمال کریں۔

نسخہ نمبر 3۔
دل کی دھڑکن بڑھ جانا۔

بی دانہ	10 گرام
زرشک	10 گرام
تخم بالنگو	10 گرام
صندل سفید	10 گرام
گوند کتیرا	10 گرام
برہمی بوٹی	10 گرام
گوکھرو خورد	10 گرام
تخم ریحان	10 گرام
خورفہ	10 گرام
گل سرخ	10 گرام
چھوٹی چندن	10 گرام
الائچی خورد	10 گرام

ترکیب:
ان تمام اجزاء کا سفوف بنا کر صبح و شام ایک چائے کا چمچہ بہی کے مربع کے ساتھ استعمال کریں۔
(نوٹ: شوگر کے مریض ان تمام نسخوں میں شکر استعمال نہ کریں)

☆☆......☆☆

بیوٹی گائیڈ

آپ کے جانے پہچانے اسکن اسپیشلسٹ **ڈاکٹر خرم مشیر**

ہر ماہ آپ کی بیوٹی سے متعلقہ مسائل کے حل کے ساتھ

بالوں کے مسائل ہر موسم میں نئے سرے سے اپنے نت نئے مسائل کے ساتھ سامنے آنے لگتے ہیں۔ بالوں کی حفاظت چونکہ ہر آتے جاتے موسم میں اہم رہی ہے اس لیے اس ماہ میں آپ کے لیے بالوں کی حفاظت سے متعلق وہ اہم معلومات لایا ہوں، جس پر عمل کر کے یقیناً آپ گھر بیٹھے ان مسائل سے چھٹکارا پا سکتی ہیں۔

بالوں کی ساخت

بالوں کی سخت قدرت نے مضبوط اور بڑی حکمت سے بنائی ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ جہاں بال اگتے ہیں' وہ جگہ کس قدر سخت اور مضبوط ہوتی ہے اور اس کے اندر سے بالوں کی جڑیں نکلتی ہیں اور یہ گہرائی تک ہوتی ہیں کہ اگر آپ برش کریں یا خارش مگر بال نہیں گرتے اس وقت تک جب تک آ کو بالوں کی کوئی بیاری نہ ہو۔ خدا کی شان ہے کہ اگر بال گرتے ہیں یا ٹوٹ جاتے ہیں تو اسی جگہ سے دوبارہ بال نکل آتے ہیں۔ بالوں کی جڑوں میں نرم خلیے ہوتے ہیں جو کہ نشوونما کی صلاحیت رکھتے ہیں اور سر کی جلد کی موٹی تہہ اس کی حفاظت کرتی ہے اور ان کو خون پہنچاتی ہے گویا اللہ رب العزت نے ایسا نظام بنایا ہے کہ اس کی غذا اس کو جسم سے ملتی ہے۔ مرکزی عصبی نظام اس سے جڑا ہوتا ہے اور باریک باریک اعصاب کا جال آپ کے پورے بدن میں پھیلا ہوتا ہے جس سے آپ کے بدن کو ہر چیز کی تحریک ملتی ہے۔ اگر آپ ہر طرح سے صحت مند ہیں' آپ کو خون کی کمی' حیاتین کی کمی یا کسی قسم کی کوئی بیماری نہ ہو تو آپ کے بال بھی صحت مند' مضبوط اور گھنے ہوں گے۔ ہر ماہ آپ کے بال آدھا انچ بڑھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہر سال چھ انچ بالوں کی لمبائی بڑھتی ہے۔ جب پرانے بال گرتے ہیں تو نئے بال تیزی سے آتے ہیں لیکن اگر آپ میں خون کی کمی' حیاتین کی کمی یا کوئی اور بیماری ہو تو بال دیر سے اور سست روی سے نکلتے ہیں اور کمزور' کھردرے اور ہلکے ہوتے ہیں اور جلد ٹوٹ جاتے ہیں یا گر جاتے ہیں۔ خواتین کو اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ ان کا جسمانی نظام بالکل صحت مند ہوتا کہ بال خوبصورت اور گھنے ہوں لیکن اگر بالوں میں کسی قسم کی خرابی دیکھیں تو فوراً کسی طبیب سے رجوع کریں۔ خود ساختہ نسخوں اور ٹونوں ٹوٹکوں سے بال مزید خراب ہو جاتے ہیں۔ اگر بالوں کی خرابی کی صحیح تشخیص نہ کی جائے تو بالوں کی جڑیں بہت کمزور اور ناتواں ہو جاتی ہیں۔

بالوں کی مختلف اقسام ہیں جن میں چکنے بال' خشک بال' نارمل بال' چھدرے بال اور ملے جلے بال۔ بالوں کی اقسام کی طرح ان کے مسائل بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اگر آپ کے بال خشک ہیں تو ان کا اس درجہ خشک ہونا آج کل کا خراب پانی'

ضرورت سے زیادہ شیمپو کا استعمال اور ہر طرح کا غیر معیاری شیمپو غیر معیاری اور سستے کلر استعمال کرنا بالوں کو غیر معیاری کیمیکل، مستقل رنگنا اس سے آپ کے بالوں کی قدرتی چمک اور مضبوطی پر اثر پڑتا ہے جس سے آپ کے بال خشک، کھردرے اور کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اس خشکی کی وجہ سے بالوں کی نشوونما پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ بال تیزی سے جھڑنے لگتے ہیں۔ بالوں کی خشکی کی وجہ سے بالوں کی جڑیں کمزور ہوجاتی ہیں۔ خواتین کو چاہیے کہ اپنے بالوں کو دھوپ سے بچائیں اور ہیئر ڈرایئر کا استعمال کم کریں۔ ایسے شیمپو استعمال نہ کریں جو خشکی پیدا کریں۔

آج لوگ تیل لگانے سے پرہیز کرتے ہیں جبکہ ایسا کرنا غلط ہے۔ بالوں کی نشوونما تیل سے ہوتی ہے۔ اگر آپ اپنے سر کی مالش خالص سرسوں کے تیل اور زیتون کے تیل سے کریں تو بالوں کی خشکی اور کھردرا پن ختم ہوجائے گا۔ اسی طرح اگر کڑوا تیل دو چمچ اور خالص ناریل کا تیل ایک چمچ اور ایک عدد انڈے کی سفیدی ان کو ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں اور اس کے بعد اس کو سر پر لگائیں اور انگلیوں کی پوروں سے ہلکے ہلکے مساج کریں۔ ہتھیلی کا استعمال نہ کریں اور اس آمیزے کو ڈیڑھ گھنٹے تک سر پر لگا رہنے دیں اور سر دھونے کے لیے سرسوں کی کلی استعمال کریں یا بچوں کا بے بی شیمپو استعمال کریں کیونکہ اس میں کیمیکل کی آمیزش نہیں ہوتی یا بہت کم ہوتی ہے۔ ان تراکیب کو ہفتے میں دو سے تین دفعہ آزمائیں تو یقیناً آپ کے بالوں کے بہت سے مسائل حل ہوجائیں گے۔

اگر آپ کے بالوں کے بہت چکنے ہیں تو آپ اپنے بالوں کو چنے کا ستو لیں، اس میں انڈے کی سفیدی اور لیموں کے چند قطرے ڈال کر ملا لیں اور سر میں لگائیں اور آدھے گھنٹے تک لگا رہنے دیں اور اس کے بعد بالوں کو بے بی شیمپو سے واش کرلیں۔ بالوں کو ہمیشہ ٹھنڈے پانی سے دھونا چاہیے۔ ٹھنڈا پانی بالوں کی جڑوں میں خون کی روانی کو بڑھا دیتا ہے۔ اس سے بالوں کی نشوونما اچھی ہوتی ہے۔ سر کو دھوتے وقت بالوں کو آگے کی طرف کریں اور اس کو شاور سے نہ دھوئیں کیونکہ اس کے پریشر سے بالوں کی جڑیں کمزور ہوتی ہیں۔

آپ کے بالوں کے لیے متوازن غذا کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ جس میں انڈا، مچھلی، گوشت، پھل، سبزیاں جن میں مختلف قسم کی حیاتین A, D اور B12، زنک اور میگنیشیم ہوتی ہیں۔ دودھ کا بھی استعمال کریں اور زیادہ سے زیادہ پانی کا استعمال کریں۔ روزانہ ایک کپ یا ایک گلاس دودھ کا استعمال کریں۔ پتوں والی سبزیوں کا زیادہ استعمال رکھیں۔ اس سے آپ کے بال مضبوط ہوں گے اور نشوونما تیزی سے ہوگی۔ بالوں کی نشوونما کے لیے متوازن غذا کے ساتھ ساتھ ورزش، کھلی اور صاف ہوا کی بھی ضرورت ہے تاکہ دورانِ خون سر کی طرف زیادہ ہو۔ اگر آپ ورزش نہیں کرسکتیں تو ہر کھانے کے آدھے گھنٹے بعد اپنا سر آگے جھکا کر بالوں کو الٹا کر کے برش کریں تو اس سے بھی دورانِ خون آپ کے سر کی طرف تیزی سے ہوگا اور بالوں کی جڑیں توانا ہوں گی۔ اس کے علاوہ رات کو سونے سے پہلے اپنے بستر سے اپنا سر نیچے کرکے پندرہ منٹ تک رکھیں اس سے بھی دورانِ خون سر کی طرف تیز ہوگا، اس کے علاوہ صبح و شام کی چہل قدمی بھی اچھا اثر ڈالے گی۔

یاد رکھیں، کسی بھی قسم کی جسمانی کمزوری، مختلف وٹامنز کی کمی، خون کی کمی، زنک اور میگنیشیم کی کمی کے علاوہ اگر آپ بہت زیادہ ذہنی دباؤ کا شکار ہیں یا کسی قسم کی فکر و ڈپریشن سے دوچار ہیں تو ان سب کا اثر بھی آپ کے بالوں پر ہوگا۔ آپ کے بالوں میں وقت سے پہلے سفیدی، بالوں کا گرنا اور کھردرا پن نمایاں ہوجائے گا لہٰذا ان چیزوں سے بھی پرہیز لازمی ہے۔

☆☆☆